# مطالب القرآن

فی

# دروس الفرقان

## سورۃ النمل

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

# مطالب القرآن

فی

# دروس الفرقان

## — سورۂ النمل —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں


| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | ..... | مطالب القرآن فی دروس الفرقان |
| دروس | ..... | از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ |
| ناشر | ..... | بزمِ طلوع اسلام، لاہور |
| زیر اہتمام | ..... | ادارہ طلوع اسلام 25بی 2 گلبرگ، لاہور |
| | ..... | فون نمبر 5714546-5753666 |
| ایڈیشن اول | ..... | جون 2008ء |
| مطبع | ..... | باقر پرنٹنگ پریس، لاہور |


ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفکیٹ تصحیح

# انتساب

## رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادئ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق ' دل بند و راہ مصطفیؐ رو

[معراجِ انسانیت ص۴۷' از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

# اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو
آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# فہرست مشمولات سورۃ النمل

# مطالب القرآن فی دروس الفرقان


پیش لفظ 17

پہلا باب: **سورۃ النمل** (آیات 1 تا 9)

تجدید یادداشت اور ربطِ مضمون 19

حروفِ مقطعات کی حقیقت میری بصیرت میں 20

قرآنِ حکیم کی اپنی بیان کردہ صفات کے باوجود ہمارا تصور 20

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے سلسلہ میں میری 50 سالہ کوشش کا ماحصل: پرویزؒ 21

ہمارے ہاں دارالعلوموں کی سعی وکاوش کی حالتِ زار 22

علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم

کتاب قرآنِ حکیم ہے 23

ذہنی تذبذب انسان کو منزل سے ہم کنار کر ہی نہیں سکتا 23

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں متقی اور تقویٰ کے مفہوم کی وضاحت 24

قرآنِ حکیم کے نزدیک مقامِ مومن کا تعین 25

ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟ 26

اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے پروگرام کی وضاحت

اور اس کے خدوخال 27

ایتائے زکوٰۃ کے لیے جذبہ محرکہ کی وضاحت 27

اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ اپنی آزاد مملکت کے ساتھ مشروط ہیں 28

علمائے کرام کی طرف سے تحریکِ پاکستان کے دوران اٹھنے والا جھگڑا 29

ایک آزاد اسلامی مملکت میں تمام فیصلے کتاب اللہ کے مطابق ہوں گے 30

انسان غلط عمل کو مزین شکل میں دیکھنا یا دکھانا شروع کر دیتا ہے 31

خدا کے ناموں میں ایک نام المضلّ (گمراہ کرنے والا)

بھی بتایا جاتا ہے (معاذ اللہ) 31

قرآنِ حکیم نے تو انسان کے اپنے ہی سرکش جذبات کو شیطان کہا ہے 32

ہر وہ چیز جو خدا خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے اس سے

مراد قانونِ الٰہی ہوتا ہے 32

قرآنِ حکیم کے نزدیک نفع ونقصان کا معیار 33

ہمارے ہاں نیک عملی کا معیار 33

مکافاتِ عمل کا ترازو ذرّے ذرّے کو تول دے گا 34

عقلِ انسانی اور وحی کا بنیادی فرق 35

ختم نبوت کا دعویٰ ماننے والوں کی اپنی حالت:

علم لدنی کا خلافِ قرآن عقیدہ 36

بنی اسرائیل کی تاریخ اور ہماری اپنی سرگزشت میں

باہمی مماثلت غور وفکر کی متقاضی ہے 36

قرآنِ حکیم کے ساتھ مسلمانوں کا باہمی تعلق اور باہمی زندگی 37

داستانِ بنی اسرائیل کو وضاحت سے بیان کرنے کا مقصد 38
وحی کی کنہ وحقیقت کو غیر از نبی سمجھ ہی نہیں سکتا 39
طور کی چوٹی اور گردونواح کے بابرکت ہونے کی وجہ جواز 40
کسی شخصیت کا نبوت کی نعمت سے سرفراز ہونا اتفاقیہ نہیں ہوتا 41
حکومتی فرائض سرانجام دینے کے لیے بکریوں کو چرانے
والے چرواہے کے حوصلہ سے سرفراز ہونا ضروری ہے 42
مقامِ نبوت ریاضتوں اور چلّوں کا رہین منت نہیں ہوتا 43
دوسرا باب: **سورۃ النمل** (آیات 10 تا 17)
قرآنِ حکیم نے ہر دور میں ایک ہی نظامِ حیات عطا کیا ہے 44
تھیوکریسی مذہبی پیشوائیت کا ہی دوسرا نام ہے 45
حکومتی ادارے میں مذہبی پیشوائیت کا مقامِ بلند 46
انسانیت کی سب سے زیادہ تین مخالف قوتیں 46
ملکی معاملات میں ملوکیت کی تکنیک اور ذبح کا مفہوم 47
حضرت موسیٰؑ کا فرعون سے مطالبہ 48
ڈیموکریسی (جمہوریت) میں اقلیت اور اکثریت کا چکر 48
تحریکِ پاکستان کے دوران قائداعظمؒ کا پرویزؒ کے لیے فرمان 49
آزاد قوموں کے اندر سامریوں کا کردار 49
تجدید یا دداشت سابقہ درسِ قرآن 50
مروجہ تراجم میں لفظ ضآل کا غلط معنی: خدا کا نبی کبھی گمراہ نہیں ہوتا 51
نبوت پر فائز ہونے سے پہلے نبی کی تلاشِ حقیقت 51
ایک نبی کا فرضِ منصبی، حصولِ منزل کی مشکلات اور عصا
وغیرہ کا تمثیلاتی ذکر 52
خوف اور حزن میں فرق 52
رسالت کا انتخاب خدا تعالیٰ کے پروگرام کے مطابق عمل میں آتا ہے 53
نبوت کی ذمہ داری کو پورا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا 55
حضرت موسیٰؑ کے سلسلہ میں اژدھا کی اصلیت 56
لغزشوں کی تلافی حسنات سے مشروط ہے 57
جلال و جمال، رسول کی دعوت کے روشن دلائل کے پہلو ہوتے ہیں 58
''ملتِ یدِ بیضا'' کا مفہوم علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں 59
نبی اکرمؐ کی محنتِ شاقہ کے متعلق قرآن کا اعتراف 59
مُبْصِرَةً کا قرآنی مفہوم 60
ایران کا گورنر حضرت عمرؓ کے دربار میں 61
سحر کے معنی ایسا فریب جو سامنے نظر نہ آئے نیز قوت کا نشہ
جو انسان کو بدمست کر دیتا ہے 62
انسان نفسیاتی ریب کے ہاتھوں مارا جاتا ہے 62
مفسد کا قرآنی مفہوم اور اس کا انجام 63
فرعون کی داستان کے بعد حضرت سلیمانؑ اور
حضرت داؤدؑ کا ذکرِ خیر کیوں؟ 63
نبیؐ کی ذات وحی کے علم کے علاوہ کائناتی علم سے بھی آگاہ ہوتی ہے 64
بعض رسولوں کو بعض رسولوں پر فضیلت حاصل ہے 64
صرف انسان ہی اشرف المخلوقات نہیں 65
مقامِ نبوت وراثت کا رہین منت نہیں ہوتا 66
لفظ وارث کا حقیقی مفہوم 66
حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے کو خلافت کے لیے کیوں نامزد نہ کیا؟ 67
حضرت سلیمانؑ کے متعلق مروجہ تراجم کی بنا پر
قرآنی آیات کا تفسیری بیان 67

مروجہ تفاسیر میں زیبِ داستان کے لیے کیا کچھ دے رکھا ہے!! 68
دارالعلوموں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کی علمی سطح کا معیار 69
مملکتِ حضرت سلیمانؑ کی وسعت' اس کے وسائل اور
پھر آپؑ کے قائم کردہ ڈسپلن کی نوعیت 69
مملکت کے استحکام کے لیے مادی وسائل کی اہمیت 71

## تیسرا باب: سورۃ النمل (آیات 18 تا 37)

مذہب سیکولر اسٹیٹ کا ہی ترجمان ہوتا ہے 74
حضرتِ سلیمانؑ کے دورِ اقتدار کی نوعیت اور لفظ ''جن'' کی وضاحت 74
مروجہ تفسیروں میں چیونٹیوں کے تذکرہ کے علاوہ ان کی کیفیت و ماہیت 75
اہل مغرب کے ہاں کے تراجم بھی انہی تصورات کے اسیر ہیں 75
پرندوں اور جانوروں کے نام پر انسانوں کے نام کی
ریت اور تذکرہ ایک کتاب کا 76
عبرانی زبان میں نمل کو مختون بھی کہا جاتا ہے 77
موجودہ تحقیق کے مطابق وادیٔ نمل آج بھی موجود ہے 77
نبوت کے کنٹرول اور ملوکیت کے اقتدار میں فرق 78
ہمارے ہاں اللہ کے متعلق پایا جانے والا تصور 79
خدا کا صحیح تصور تو انسان کی زندگی بدل دیتا ہے 79
انسانوں نے خدا کو بادشاہ کے روپ میں سمجھ رکھا ہے 80
رضی اللہ عنہ کا قرآنی مفہوم 80
مروجہ تراجم کی کیفیت سے پیدا ہونے والا تصورِ خدا 81
ہدہد کون تھا اور حضرت سلیمانؑ نے اس کی
غیر حاضری کو کیسے محسوس کیا 81
ہدہد کے غائب ہونے کی وجہ 82
ملکہ سبا کی ملکی کنٹرول کی روئیداد اور عرش کے مفہوم کے
برعکس مروجہ تفسیری بیان 83
اس قسم کی تفسیریں مذہب کی بنیاد پر ہوئیں 83
ملکہ سبا کی قوم کی ذہنی پسماندگی ناگفتہ بہ تھی 84
کسی قوم کی بدذوقی کو ماپنے کا ایک پیمانہ یہ بھی ہے 85
حضرت سلیمانؑ کی بصیرت اور ایک حسین تدبیر 86
ملکہ سبا کی نظر میں حضرت سلیمانؑ کی چٹھی کی اہمیت 86
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا قرآنی مفہوم 87
لفظ رحیم کے سلسلہ میں رحمِ مادر کی ایک روشن مثال 88
رحمٰن کا قرآنی مفہوم 89
صدیوں سے ہم نے قرآنِ حکیم کو بغیر سمجھے پڑھنے
تک ہی محدود کر رکھا ہے 90
قرآن حکیم کے ساتھ یہ ایک گہری سازش ہے 90
ملکہ سبا کے نام حضرت سلیمانؑ کے خط یا چٹھی کی ابتدا
نہایت حسن کارانہ انداز لیے ہوئی تھی 91
احسان کا بدلہ احسان نہیں بلکہ حسن ہوتا ہے
یعنی توازن برقرار رکھنا ہوتا ہے 91
ذوقِ نظر کامل جانا ہی تو احسان کا بدلہ ہے 93
حضرت سلیمانؑ کے نزدیک ملکہ سبا کا معاشرتی جرم 93
اربابِ عزت کے لیے ملوکیت ہمیشہ ذلت آمیز سلوک روا رکھتی ہے 94
ملکہ سبا کی طرف سے حضرت سلیمانؑ کو تحائف کا لالچ 95
تحائف کے معاملہ میں حضرت سلیمانؑ کی دورنگہی اور ان کا جواب 95

## چوتھا باب: سورة النمل (آیات 38 تا 44)


| | |
|---|---|
| انبیائے کرام کے تاریخی واقعات بیان کرنے کا مقصد | 97 |
| مختلف ادوار میں انبیائے کرام نے جن جن گوشوں کی نشاندہی | |
| کی وہ قرآنِ حکیم کے پیش کردہ دین کا ہی کوئی نہ کوئی جز تھا | 98 |
| نبی کا طرزِ زندگی اور اس کے حسنِ اخلاق کی ایک مثال | 98 |
| حضرت سلیمانؑ کے خط کے جواب میں ملکہ سبا کا ردِ عمل | |
| اور اس پر حضرت سلیمانؑ کا رویہ | 99 |
| ملکہ سبا کے تخت کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کے | |
| بیان کردہ تفاسیر کا غور طلب نکتہ | 100 |
| ملکہ سبا کو اس کے تخت سمیت اٹھالانے کا حکم کسی | |
| نبی کے شانِ شایان نہیں ہوسکتا | 101 |
| طبریؒ کی 30 جلدوں پر مبنی تفسیر اور 13 جلدوں پر | |
| تاریخ کی پیدا کردہ مشکلات اور اُن کا نتیجہ | 101 |
| عفریت اور جن کا مفہوم | 102 |
| تفاسیر کی بیان کردہ متضاد کہانی | 102 |
| حضرت سلیمانؑ ورد، وظیفے، گنڈے اور جادو وغیرہ | |
| کیا کرتے تھے (معاذ اللہ) | 103 |
| آج کے بچوں کی قابلِ رحم حالت | 104 |
| ہمارے ہاں قرآن حکیم کی تعلیم تعویذوں اور وظائف کی نذر ہوگئی | 104 |
| میرے کے خلاف منکرِ حدیث ہونے کی ڈگڈی: پرویزؒ | 104 |
| حضرت سلیمانؑ کی انگوٹھی، اسم اعظم کا اور آپؑ کی بیویوں کا قصہ | 105 |
| میرے بٹالہ کے دور کے مناظر کی کیفیت: پرویزؒ | 106 |
| ہماری تفاسیر اور ہمارے تراجم نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا | 107 |
| قرآنِ حکیم کی تعلیم کے سامنے بڑے سے بڑا پادری بھی | |
| جواب نہیں دے سکتا | 108 |
| خدا کسی کی آزمائش نہیں کرتا بلکہ انسان اپنی صلاحیتوں کو آزماتا ہے | 108 |
| ہمارے ہاں عرش کے تفسیری بیان کے برعکس عرش کا قرآنی مفہوم | 109 |
| ملکہ سبا کے تخت و تاج کا معاملہ | 109 |
| قرانِ حکیم کو سمجھنے کے لیے تشبیہات، محاورات، ضرب الامثال | |
| اور ایمائیت کے موثر انداز کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے | 110 |
| عربی لٹریچر میں قرآنِ حکیم کا ادبی اسلوب بدرجہ اتم ہے | 111 |
| خدا کا رسول یا نبی مادی لالچ اور ذاتی مفادات سے کہیں بلند ہوتا ہے | 112 |
| قرآنِ حکیم کا طریق اور اس کی تعلیم عجوبہ پرستی کی رہینِ منت نہیں | 112 |
| زندگی کی کامیابی اور ناکامی کا راز شکر اور کفر کے دو الفاظ میں ضم ہے | 113 |
| انسانی زندگی کا راز اس میں ہے کہ انسان | 113 |
| Opportunities (مواقع) سے استفادہ کرتا ہے یا نہیں | 113 |
| Opportunity (موقع) تو انسانی صلاحیتوں کا اپنا | |
| ایک ٹیسٹ ہوتا ہے | 114 |
| کامیابی کے ثمرات پر تکبر میں مبتلا ہونے کی بجائے | |
| ذاتِ خداوندی کا ''شکر'' ادا کرنا ہوگا | 114 |
| وحی کے بغیر انسانی عقل کے خدشات اور اس کا عمل | 115 |
| مروجہ تراجم کے برعکس ان آیات کا مفہوم اور ملکہ سبا کا باوقار اعتراف | 115 |
| حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے پیش کردہ تعلیم | 116 |
| دل و دماغ میں راسخ ہوجانے والا عقیدہ دلیل کے | |
| حق میں رکاوٹ بنا رہتا ہے | 117 |

ایک شرابی کی طرح آج تک کسی فلاسفر نے بھی کوئی
تعمیری اور عملی کام نہیں کیا 117
دل و دماغ کو صرف وحی کا چراغ ہی روشن کرتا ہے 118
ملکہ سبا کے لیے حق بات کو تسلیم کرنے کے راستے میں
مذہب سب سے بڑی رکاوٹ تھا 118
پرویزؒ پر کفر کے فتویٰ کی ایک شق ان کے ہنسنے کے متعلق بھی تھی 119
ہمارے ہاں کی اخلاق سوز تفسیروں کی تفصیل 119
ہماری تفسیروں میں حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ کی
بیویوں کی تعداد کے علاوہ لونڈیوں کا ذکر 120
ملکہ سبا سے حضرت سلیمانؑ کی شادی کا دل خراش ماجرا 120
آخر کار ملکہ سبا نے دینِ خداوندی قبول کر لیا 122

پانچواں باب: **سورة النمل** (آیات 45 تا 59)

گزشتہ سے پیوستہ 124
قوم اور اُمت کا تصور 126
انسانوں کی تقسیم کا قرآنی اصول 127
قرآن کا رشتہ 127
دین کی غایت: محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی ہے 128
اللہ کی زمین، اللہ کی مخلوق کے لیے ہے، پھر وراثت کیسا؟ 129
صرف وسائل رزق کا انتظام و انصرام انسان کو کرنا ہے 130
معاہدہ اور ابلیسی سیاست کی مہرہ بازیاں 131
ابلیسیت میں عجلت کیوں؟ حضرت صالحؑ کا پیغام 132
برائیاں اوپر کے طبقے سے عوام میں جڑ پکڑتی ہیں 133
کردار کی بلندی اور نخوت کی پستی 134
صاحبِ اقتدار اور قوم کے عوام دونوں ہی نظام معاشرت
کی خوبیوں یا خرابیوں کے ذمہ دار قرار پاتے ہیں: کیوں؟ 137
نظامِ معاشرت میں برائیاں پھیلنے کی وجہ 141
نبی اکرمؐ اور حضرت صالحؑ کے وقائع میں مماثلت 142
اعمال کا مآل ''بے چراغ'' بستیوں کی صورت دھارتا ہے:
یہ ہے مکافاتِ عمل 144
علم کے باوجود جاہل کے جاہل 145
دل کا قرآنی مفہوم 146
عذابِ الٰہی اور مادی اسباب میں ربط 147

چھٹا باب: **سورة النمل** (آیات: 60-61; 63-64) اور مورس بوکائے)

پچیس سال کے طویل عرصہ میں دیئے جانے والے
دروس کے بالمقابل اپنی نوعیت کا یہ پہلا درس 150
کائنات کے متعلق پیش پا افتادہ تصورات کی الجھنیں 152
قرآنِ حکیم کے نزدیک وہ ایمان ہی نہیں کہلاتا
جس کے متعلق کوئی دلیل نہ ہو 152
قرآنِ حکیم کو خدا تعالیٰ کی کتاب ماننے کا طریق 153
قرآنِ حکیم کے بیان کردہ حقائق پر پڑے ہوئے پردے
وقت کے ساتھ ساتھ اُٹھتے چلے جائیں گے 154
تمام عقائد اور تمام الجھنوں سے کنارہ کش ہو کر خالی الذہن
قرآن کی طرف آنا ہوگا 155

میں پچاس سال سے قرآنِ حکیم کو اس انداز سے سمجھ رہا ہوں: پرویزؒ 156
مذہب پرست قوم قرآن کی طرف نہ خود آئے گی‘
نہ دوسروں کو آنے دے گی 156
قرآن نے اس دور کے تمام علوم کا احاطہ کر رکھا ہے 156
مورس ڈاکٹر بوکائے کی کتاب The Bible, The Qur'an
And Science کے چند حوالہ جات 157
عربی زبان کے حوالے سے ڈاکٹر مورس بوکائے کی
شاہ فیصل سے ملاقات 158
ہمارے اور مورس بوکائے کے مابین قرآن پڑھنے میں فرق 159
قرآنِ حکیم کے سلسلہ میں مسلمانوں کے متعلق اس فرانسیسی کا تصور 159
قرآن فہمی کے سلسلہ میں علامہ اقبالؒ کی طرف سے
علامہ پرویزؒ کی رہنمائی 160
قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے مورس بوکائے نے چند ایک
اصولوں کو ضروری جانا 161
مورس بوکائے کے نزدیک سابقہ دور میں کیے گئے
تراجم وتفاسیر موجودہ دور کا ساتھ نہیں دے سکتے 161
نظریات کی دنیا میں ردوبدل انسانی عقل کا خاصہ ہے 162
قرآن حکیم کے تراجم اور تفاسیر غلط کیوں ہوتے ہیں؟ 162
آج علوم سائنس نے کئی ایک قرآنی نظریات کو Prove
(ثابت) کر دیا ہے 163
قرآنِ حکیم کی روشنی میں چودہ سو سال پیشتر کائناتی کرّوں
کے متعلق بیان کردہ حقائق 163
قرآن حکیم کی روشنی میں ارض وسما کو عبور کرنے کے سلسلہ
میں مورس بوکائے کی تحقیق 166
حقیقت تو یہ ہے کہ مورس بوکائے نے عربی سیکھنے کا حق ادا کر دیا 167
اس ''اِن'' کے سلسلہ میں مورس بوکائے راکٹ کو بطور
شہادت پیش کرتا ہے 168
قرآن حکیم میں لفظ'' ان'' کی اہمیت‘ مفہوم اور بوکائے
کے نزدیک قرآن کے مقابل بائبل کا مقام 168
ہمارے ہاں ان آیات کا کیا گیا ترجمہ 169
قرآن حکیم کی تائید میں راکٹ کے خلانوردوں کا بیان 170
مورس بوکائے کے ہاں رسول خداؐ کی نبوت کی تائید اور خراجِ تحسین 172
قرآن حکیم کے ہاں انسانی پیدائش کی کہانی‘ مورس بوکائے کی زبانی 173
ہم مسلمانوں سے مورس بوکائے کی التجا 174
مورس بوکائے کی کتاب کا آخری باب طوفانِ نوح کے
متعلق بائبل کے افسانوں اور قرآنِ حکیم کے حقائق کا غماز ہے 174
مورس بوکائے کی کتاب کے تراجم 175
کیا قرآن حکیم واقعی خدا کی کتاب ہے؟ 175
قرآنِ حکیم پر ایمان لانے کا طریق 175
مآء کے لفظ کی تشریح اور پھر زندگی کے وجود میں آنے پر ریسرچ 176
قرآنِ حکیم میں زوالوجی کی بنیاد پر پہاڑوں کے مختلف رنگوں کا‘
بارش کے بعد پھلوں کا‘ مختلف انسانوں کی نسلوں کا اور ان کی
زبانوں کا‘ تذکرہ اور آج کے دور میں مورس بوکائے کی ریسرچ 176
ایک انتہائی خواہش 178

ساتواں باب: **سورۃ النمل** (آیت 62 اور دعا کا مفہوم)

''دعا'' کا مفہوم قرآنِ حکیم کے آئینہ میں 179
خدا تعالیٰ نہ تو اپنے کسی قانون کو بدلتا ہے اور نہ ہی اپنی سنت (پریکٹس) میں تبدیلی کرتا ہے 181
سوال یہ ہے کہ کیا ہماری دعا قوانینِ خداوندی کو بدل دے گی؟ 181
کیا خدا مظلوم کی، بے بس کی، دعاؤں کو نہیں سنتا؟ 181
اگر خدا نے حق کا ساتھ دینا ہی ہے تو پھر دعا کرنے کا مقصد؟ 181
قلبِ مضطرب میں خدا کے متعلق پیدا ہونے والے تصورات اور قرآن کا جواب 182
دعا کا قرآنی مفہوم ''پکارنا یا آواز دینا'' ہے 182
خدا تعالیٰ کو پکارنے کا طریق اور اس کی طرف سے اس کا پیش کردہ جواب 183
انسانی کی پرابلم صرف اس وقت ہوتی ہے جب اس کا حل اس کے سامنے نہ ہو 183
خدا تعالیٰ کی ذات تو قدم قدم پر آواز کا جواب دیتی ہے 184
**لعلکم، لعلھم** اور **یرشدون** کا قرانی مفہوم 184
خدا تعالیٰ کی طرف سے جواب دینے کا طریق 185
انسان کو قیامت تک جس جس قسم کی بھی رہنمائی درکار تھی وہ قرآن میں محفوظ کر دی گئی 186
راستہ معلوم ہو جانے کے بعد منزل کے حصول کے لیے ایک شرط 186
دعاؤں کی قبولیت کی خاطر یقینِ محکم اور عملِ پیہم کی شرط کو پورا کرنا ہوگا 187
دعاؤں کی شرط میں ایمان کے ساتھ صالحیت کا ہونا ضروری ہے 188
صالح عمل کی شرط میں ایمان کا ہونا ضروری ہے 189
نسخہ کے استعمال کا طریق بھی صحیح ہونا ضروری ہے 189
کائنات کی حیثیت، اس کی کامیابی اور اس کی افادیت پر غور و فکر کی دعوت 190
راستہ بھولے مسافر کی مشکلات بڑی ناگفتہ بہ ہوتی ہیں 191
ہزار سال سے ملتِ اسلامیہ اپنے لہولہان پاؤں کے ساتھ خود ساختہ مذہب کے نوکیلے پتھروں پر محوِ سفر ہے 191
سعی لاحاصل کی لذت میں مصروف ملت کی حالتِ زار 192
فرعون کے مقابلے کے لیے حضرت موسیٰؑ کی خدا سے پکار ا 193
حضرتِ موسیٰؑ کی دعا کی قبولیت کو مشروط کر دیا گیا 193
خدا تعالیٰ کی طرف سے دی گئی رہنمائی کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ہوگا 194
حضرت نوحؑ کی پکار اور خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب 194
جس معاشرے میں رہنمائی بھی ملاوٹ والی ہو تو پھر کوئی کیا کرے!! 195
اس قسم کے حالات میں ملک کا اقتدار صحیح ہاتھوں میں دینا ہوگا 196
مکے والوں کی مشکلات کے متعلق مدینے والوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے 197
انسانوں کی دنیا میں خدا کی حکومت انسانوں کے ہاتھوں ہی تشکیل پاتی ہے 197
نبی اکرمؐ کے دور کی مملکت کی تعمیر حضرت عمرؓ کے عہد میں تکمیل تک جا پہنچی تھی 198
مملکت اسلامیہ یا قرآنی حکومت میں سربراہِ مملکت کا فریضہ 198
''اور اگر آپ نے خدا سے دعا کی تو یہ خدا کے ہاں میری شکایت ہوگی'' 198
حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں سربراہ مملکت کی ذمہ داریوں کا احساس 199

ہر فردِ مملکت کی خبر گیری اور ذکر کا مفہوم 199
انسان کی اپنی تمنا کا نام ہی دعا ہے جس کی قبولیت کا
طریق قرآن حکیم بتاتا ہے 200
دل کی آرزو کا رنگ بدلے بغیر باہر کی دنیا کا رنگ بدل ہی نہیں سکتا 201
آرزو کا رنگ تو قرآن حکیم قدم قدم پر انسان کو بتاتا ہے 201
شدت آرزو انسان کی مخفی قوتوں کو بیدار کرنے کا بہترین ذریعہ ہے 202
شدتِ آرزو کا پیدا ہونا ہی زندگی کا نشان ہے 202
آٹھواں باب: **سورۃ النمل** (آیات 65 تا 68)
قرآنِ حکیم کا ایک ایک لفظ، ایک ایک آیت اور ہر ایک
سورۃ باہمی ربط کے زیور سے آراستہ ہے 205
مذہبی پیشوائیت قدم قدم پر دوسروں کی محتاج ہونے کے
باوجود اپنی اجارہ داری قائم رکھتی ہے 205
خدا سے خدا کا قانون بدلوا کر انسانوں کی مصیبتوں کا ازالہ
کرانے والے احبار و رہبان 206
قاعدے اور قانون کی خلاف ورزی کے نتیجے کا دوسرا نام بیچارگی ہے 207
وقت کی مناسبت سے خدا کے ایک قانون کی جگہ
دوسرے قانون کی پیروی کرنا ہوگی 208
دین کے بجائے مذہب کی اجارہ داری قائم کرنے والے
تاجر دنیا میں ہر جگہ موجود ہیں 209
تشکیلِ پاکستان کے بعد یہاں خانقاہوں کی اور
عرسوں کی بھرمار قابلِ غور ہے 209
تمام خامیوں کی وجہ جواز اور ان کا حل 209
ہماری بدحالی کا باعث بننے والی ایک دوسری کیٹیگری 210
غیب کا علم خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا 210
کسی سے کوئی بات منوانے کے لیے دلیل کا ہونا ضروری ہوتا ہے 211
خدا کی راہ میں جان دینے والوں کے لیے لفظ شہید کا استعمال؟ 211
خدا تعالیٰ کی ذات کے متعلق لفظ علمِ غیب کی وضاحت 212
پیش گوئی غیب کے علم کا ہی دوسرا نام ہے جس کی کوئی سند
قرآن حکیم میں نہیں 213
پیش گوئیوں کے متعلق مرزا صاحب قادیانی کا دعویٰ 213
قرآنِ حکیم کے نزدیک علم کی روشنی میں کسی چیز کا بتانا
دوسری بات ہے 214
قرآنی لفظ غداً کا مفہوم 214
انسان کو اپنی موت کے وقت اور جگہ کا علم نہ ہونا خدا کی رحمت ہے 215
علمی ذریعے کے تحت غیب کے علم کی نوعیت 216
دنیا کا کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مکھی اب اڑ کر کہاں بیٹھے گی 216
خارجی کائنات میں خدا کی مشیت اور انسانی دنیا میں انسان کی مشیت 217
انسانوں کی قسمتیں بتانے والے منجم کا کردار 217
لاقانونیت انسان کو توہم پرستی کی گہری کھائی میں دھکیل دیتی ہے 218
بے عقلی کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی 219
قسمت کی ایک تختی پر دو متضاد تحریریں 219
روٹی کے اس چکر نے انسانوں کو بیوقوف بنا رکھا ہے 220
انسان کے من کی تبدیلی ہی باہر کی تبدیلی کا مظہر ہوتی ہے 221
آخر ظالم کی یہ کھیتی پنپتی کیوں ہے؟ 222
دل میں گزرنے والے خیالات کی گرفت کا احساس سیکولر
نظریات میں نہیں ہوتا 222

فقہ کے تحت چوری کی سزا سے بچنے کا طریق 223
خدا پر ایمان کے معنی اُخروی زندگی کے سلسلہ میں
مکافاتِ عمل کو تسلیم کرنے میں ہے 223
انسانی ذات عمر رسیدہ بھی نہیں ہوگی 224
سارے یورپ کی تباہی انسان کی اس ذات یا خودی یا Personality
(شخصیت) کی حقیقت کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے ہے 224
یورپ کے ایک نیورو سرجن پی ایچ ڈی رابرٹ وائٹ کی فکر انگیز پکار 225
نیند کی حالت کی طرح، موت کی حالت میں، انسانی شعور
کو روک لیا جاتا ہے 227
غور وفکر کرنے والوں کے لیے اس میں بڑی نشانیاں ہیں 228
انسان کے اندر حافظے کی قوت مادّیت کی رہین منت نہیں ہے 229
ایسا ایمان جو ٹھوس دلیل کے اوپر مبنی نہ ہو وہ ایمان ہی نہیں کہلاتا 229
تاریخی طور پر قوموں کی بدعنوانیوں کے نتائج ان کے سامنے ہیں 230

نواں باب: **سورۃ النمل** (آیات 69 تا 81)

سطحی نگاہوں کو قرآنِ حکیم کے اندر کہیں ربط نظر نہیں آتا 231
حیاتِ آخرت یا اخروی زندگی کا بنیادی مفہوم اور خدا کو ماننے
اور نہ ماننے کا تصور 232
اگر قانونِ مکافات کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر خدا پر ایمان
کوئی معنی نہیں رکھتا 232
انسانوں کے بنائے ہوئے قانون میں جرم کی نوعیت
اور انتظامی امور کا نتیجہ 232
سوسائٹی کے قوانین کے برعکس خدا تعالیٰ کی پیش کردہ
اقدار اور مکافاتِ عمل کی اہمیت 233
سوسائٹی کے قانون کی پاسداری پر نیک نامی کے بالمقابل
مکافاتِ عمل انسانی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے 234
قرآن حکیم میں مکافاتِ عمل کے لیے نتیجہ کے بجائے
جزا کا لفظ استعمال ہوا ہے 234
کسی کے عمل کا نتیجہ دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہوسکتا 235
قوموں کا عروج وزوال تو ان کے قائم کردہ نظام کے
مطابق ہی ظہور پذیر ہوتا ہے 236
قانونِ مکافات کے مطابق کوئی شخص کسی دوسرے کی
محنت کا استحصال نہیں کرسکتا 236
نتیجہ زود یا بدیر ہمیشہ مکافاتِ عمل کے مطابق نکلتا ہے 236
آخرت پر ایمان مکافاتِ عمل پر ایمان کے بغیر قابلِ قبول ہی نہیں ہوتا 237
علامہ پرویزؒ کی زندگی کا ایک ذاتی واقعہ: ایک سکہ کی کہانی
ان کی اپنی زبانی 238
جہاں سے اٹھایا تھا اسی جگہ رکھ دو کیونکہ وہ تیرا تھا ہی نہیں 239
خدا تعالیٰ کی اقدار حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور فرعون کا نظامِ مملکت 240
آخرت پر ایمان انسان کی سوچ کا رخ بدل دیتا ہے 240
سب سے بڑی تباہی قوموں کے خود ساختہ نظاموں کی وجہ سے
ہی وارد ہوتی ہے جو پھر نہ مندر دیکھتی ہے نہ ہی مسجد 241
تباہی سے بچنے کے لیے قانونِ مکافاتِ عمل کی اہمیت کو
واضح تر انداز میں عام کرنا ہوگا 242
اپنے آپ کو بدلے بغیر، دل کو بدلے بغیر، آرزو کو بدلے
بغیر، انقلاب کی امید لاحاصل ہے 242
اصلاح کرنے والوں کی قرآنی خطوط پر دلی اور ذہنی کیفیت 242

قرآنِ حکیم کی روشنی میں نبی اکرمؐ کے اسوہ حسنہ کے خطوط 243
ایسی نصیحت جو شفقت، ہمدردی اور درد کی لذت سے نا آشنا ہو
کبھی کارگر نہیں ہو سکتی 244
خدا تعالیٰ کی اپنی ''حساس خیالی'' کا اظہار 244
ماں کی مار میں درد کی چاشنی اور دل و دماغ کی خراش بھی
دامن گیر ہوتی ہے 244
مجبوری کے تحت کیا ہوا عمل اپنے لیے کسی کریڈٹ کا حق دار نہیں ہوتا 245
انسان کے اختیار و ارادے کو کسی شکل میں بھی پامال نہیں کیا جا سکتا 246
ہمارے ہاں غلط تراجم نے قرآنِ حکیم کی پوری تعلیم کو ہی
چیستاں بنا کر رکھ دیا ہے 246
لیلیٰ مجنوں کی چاہت کا ایک تمثیلی واقعہ 246
ہدایت تو وہی قبول کرے گا جو ہدایت کی افادیت کو سمجھ رہا ہو 247
ظہورِ نتائج کے دوران مہلت کا وقفہ بھی ایک رحمت ہے 248
قانونِ مکافاتِ عمل ترازو کے اصول کو نظر انداز نہیں کرتا 248
قرآنِ حکیم کی تمام کی تمام صداقتیں انسانیت کے لیے ہیں 250
قرآن کی طرف سے رہنمائی کی نوعیت 250
توکل کا قرآنی مفہوم یہ ہے کہ خدا کی رسی کبھی
آپ کو دھوکا نہیں دے سکتی 251
ہمارے ہاں توکل علی اللہ کا خود ساختہ مفہوم ہے 251
احبار و رہبان کی روٹی کا انتظام دوسروں کے گھروں
کا رہینِ منت ہوتا ہے 252
توکل کی منزل کو سر کرنے کے دوران کٹھن راستوں کو عبور کرنا ہوگا 252
حق پر جم کر کھڑے رہنے والوں پر فرشتوں کا نزول 253
آخر کار مفاد پرستی کی روش سے انسان کی تعمیری
صلاحیتیں مفقود ہو جاتی ہیں 253
راہ گم کردہ انسانوں کی ایک دوسری کیٹیگری بھی ہے 254
قوموں میں صلاحیتوں کی ایک چنگاری بھی انہیں زندگی کی
نعمت سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کر سکتی ہے 255
دسواں باب: **سورۃ النمل** (آیت 82 تا اختتام)
عبادات کی ادائیگی کے باوجود سب پر غالب ہونے کا عمل
(الاعلون) کیوں پورا نہیں ہوتا؟ 256
فریبِ نفس میں گرفتار ہونے کا نتیجہ 257
بات صرف دل کی تسلی ہی نہیں ہوتی بلکہ محسوس نتائج کی بھی ہوتی ہے 258
میدان عرفات کی دعائیں تو قبول نہیں ہوتیں البتہ
یہودیوں کی تقویت ضرور بڑھ جاتی ہے 258
ہماری گالیوں کا جواب ہمیں طمانچوں کی شکل میں دیتے ہیں 259
قرآنِ حکیم میں الفاظ کے مجازی معنی کی اہمیت 260
قرآنِ حکیم کا انداز بیان بڑا پُر معنی ہوتا ہے 260
قرآن فہمی کے لیے قرآنِ حکیم کے بیان کردہ انداز کو ہی اپنانا ہوگا 261
قرآنِ حکیم کے لفظ دآبہ کی وہ تفسیر جو تفسیر ابن کثیر میں بیان کی گئی ہے 262
قرآنِ حکیم کی تعلیم اور اس کا نتیجہ 263
لفظ دآبہ کا قرآنی مفہوم 264
ظالم قوموں کا باہمی ٹکراؤ 264
غلط نظام کی بنا پر ہلاکو کے ہاتھوں بغداد کی تباہی میں اٹھنے والا خونی جھکڑ 265
آج کے دور کا سرسامِ مجنونانہ انسانیت کی تباہی کا موجب بن چکا ہے 266
آخر کار باشعور قوم کا جوشِ خون طلسم سامری کو توڑ کر رکھ دیتا ہے 267

قوموں کا عروج وزوال اپنے اندر قرآنی قوانین کا ہی عکس لیے ہوتا ہے 267
کیا آج دنیا بھر کی بدمست قوموں کی پھیلائی ہوئی
تباہ کاریاں قرآنی حقائق کی زندہ مثال نہیں ہیں؟ 268
غلط نظام کا نتیجہ اپنے اندر زوال کی کئی شکلیں اختیار کیے ہوئے ہوتا ہے 268
آخر کار ظلم کے ہاتھوں پامال ہونے والی قوم کا
خون جوش میں آ ہی جاتا ہے 269
انسان کے معاشرتی نظام کے نتائج اس دنیا میں ظہور پذیر ہوتے ہیں 269
کائنات کا ایک ایک ذرہ ہر آن اپنی منزل کی طرف محوِ گردش ہے 270
ہم نے زندگی کے تمام اعمال کا نتیجہ قیامت تک اٹھا رکھا ہے 271
مکافاتِ عمل پہاڑوں کی طرح جامد بڑے بڑے
متکبر سربراہانِ مملکت کو سرنگوں ہونے پر مجبور کر دے گا 271
قانونِ مکافاتِ عمل بڑا باخبر، بڑا مستحکم اور بڑا ہی باریک
بیں واقع ہوا ہے 272
کائناتی نعمتوں کے مطابق لامحالہ انسان کا زیادہ سے زیادہ
چاہنا بھی محدود ہی کہلائے گا 272
قرآنِ حکیم کی دو اصطلاحات حسنات اور سیئات کا
قرآنی مفہوم اور ہمارے ہاں نیکی اور بدی کا تصور 273
ہندوؤں کے ہاں کا طرزِ معاشرت اور نیکی کے کاموں کی کیفیت 274
ہندوؤں کے ہاں کاروباری انداز اور مقروض مسلمانوں کی حالت 274
خدا کے ہاں مکّے کے مظلوم مسلمانوں کی پکار اور خدا کے
ہاں سے اس کا جواب 275
ہمارے ہاں خدا کی مرضی کے تصور کی اور نیک کاموں کی نوعیت 275
صحیح توازن کا ہی دوسرا نام حسنات یا حسن ہے 275
حسنات یا حسن ہی وہ اصل لفظ ہے جس سے قوموں کا
توازن برقرار رہتا ہے 276
خدا تعالیٰ کی طرف سے حسنات والوں کے لیے نویدِ جانفزا 276
قوموں کے اپنے غلط نظام میں ہی ان کی تباہی اور
خوشگواری پوشیدہ ہوتی ہے 277
جس معاشرے میں بھی احسان کا بدلہ احسان ہوگا اس کا
ہر عمل تباہ ہو جائے گا 278
کسی کے بگڑے ہوئے توازن میں حسن پیدا کر دینا
اس کا بدل بھی ہے اور اس کا فریضہ بھی 278
ہر رسول کی یہی سنت تھی کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا 279
ہمارے ہاں صدیوں سے تلاوت یا ناظرہ قرآن کے
متعلق پایا جانے والا تصور 279
ایک ایک لفظ پر دس دس نیکیوں کا ثواب 280
صحیح راستے کو اپنانے والا شخص کسی پہ کوئی احسان نہیں کر رہا ہوتا 280

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# پیش لفظ

قارئین کرام یقیناً اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ بزم طلوع اسلام کی جانب سے علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دروس قرآن پر مبنی ''مطالب القرآن فی دروس القرآن'' کے نام پر اب تک تیرہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں جب کہ اس وقت سورۃ الشعراء کے بعد اسی سلسلہ کی چودھویں جلد یعنی ''سورۃ النمل'' جو 280 صفحات پر مشتمل ہے صاحبان علم و عرفان کے ذوق مطالعہ کی نذر کی جا رہی ہے۔

سورۃ النمل میں حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سباء کے حوالے سے تمام گوشے کچھ اس طرح نکھار کر اور ابھار کر بالوضاحت پیش کئے گئے ہیں کہ جن کی بنا پر دلائل و براہین کے تحت سمجھنے اور جاننے میں کسی قسم کا کوئی الجھاؤ باقی نہیں رہتا۔ مزید برآں انہی دروس کے دوران محترم پرویز صاحبؒ نے ہمارے ہاں صدیوں سے مروجہ تفاسیر میں بیان کردہ مختلف تصورات کا بھی تفصیلی طور پر ذکر کیا ہے۔ جس کے تقابلی جائزے سے یہ حقیقت مزید نکھر کر قارئین کے سامنے آ سکے گی کہ ہماری موجودہ سوچ قرآن کریم کی پیش کردہ حقیقی تعلیم اور اس کے دینی تصورات سے کس قدر دوری اختیار کر چکی ہے اور فہرست مشمولات میں دیے گئے 280 عنوانات سے تو اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکے گا۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ سورہ النمل کے چھٹے درس کے متعلق محترم پرویزؒ صاحب کا کہنا یہ ہے کہ 25 سال کے طویل عرصہ میں یہ دیئے جانے والے دروس قرآن میں سے یہ درس اپنی نوعیت کا پہلا درس ہے جس سے یہ حقیقت علی الوجہ بصیرت پر واضح ہو سکے گی کہ قرآنی حقائق علی وجہ البصیرت سمجھنے کا طریق کیا ہے۔

برادرانِ عزیز! جیسا کہ آپ جانتے ہیں قرآنِ حکیم نے اپنی تمام تر تعلیم کو جن بنیادی اور محکم ستونوں پر کھڑا کر رکھا ہے وہ اس قدر اہم ہیں کہ اگر کسی مقام پر ان میں سے کسی ایک ستون کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو قرآنِ حکیم کی تعلیم و حکمت کی پوری عمارت ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہے۔

## قرآن حکیم کی تعلیم کے تین بنیادی ستون

1- قرآنِ حکیم کا کوئی گوشہ مافوق الفطرت نہیں۔ اسی لیے تو قرآنِ حکیم کے پیش کردہ دین کو دینِ فطرت کہا جاتا ہے۔

2- قرآنِ حکیم میں کوئی بات ایسی نہیں جو مافوق العقل ہو۔ اسی لیے قرآنِ حکیم نے قدم قدم پر عقل و فکر کی اہمیت پر زور دیا ہے۔

3- قرآنِ حکیم کا کوئی حکم، کوئی نظریہ، کوئی عمل ایسا نہیں جو مافوق البشر ہو - جس پر انسان عمل پیرا ہی نہ ہو سکے یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم کا پیش کردہ نظامِ حیات پوری نوعِ انسانی کے لیے ایک ضابطہِ حیات ہے۔

عزیزانِ من! کاش! ہم نے قرآنِ حکیم کو قرآنِ حکیم کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کے لیے مندرجہ بالا ان تین بنیادی نکات کو پیش نظر رکھا ہوتا تو آج ہم صدیوں سے مختلف قسم کی توہم پرستیوں اور باہمی فرقہ بندیوں کی اندھیری غار میں زندگی بسر نہ کر رہے ہوتے۔ کیا یہ

حقیقت نہیں کہ ہزار سال سے ملت اسلامیہ اپنے لہولہان پاؤں کے ساتھ خود ساختہ مذہب کے نوکیلے پتھروں پر محوِ سفر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دل و دماغ کو صرف قندیلِ آسمانی ہی روشن کر سکتی ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ باور کر لینا چاہیے کہ دل کی آرزو کا رنگ بدلے بغیر باہر کی دنیا کا رنگ بدل ہی نہیں سکتا۔ برادرانِ عزیز! یاد رکھیے کہ قوموں میں صلاحیتوں کی ایک چنگاری بھی انہیں زندگی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں پرویزؒ صاحب کا کہنا یہ ہے کہ

''اگر صلاحیت باقی ہے پھر بھی کچھ توقع باقی ہوتی ہے' کچھ امید باقی ہوتی ہے کہ پانی میں ڈوبا ہوا ہے' سر باہر نکال لے گا' تو سن لے گا۔ ایک دفعہ صحیح بات سن تو لے گا' پھر آگے وہ فیصلہ بھی کر سکتا ہے کہ مجھے ماننا چاہیے یا نہیں ماننا چاہیے۔ جو سننا ہی نہ چاہے تو اس کو کیا کچھ سنائے گا! اس لیے قرآن کریم نے کہا کہ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ (27:81) اندھے کو تو راستہ نہیں دکھا سکتا' بہرے کو تو بات نہیں سنا سکتا۔ یہ تو اسی کو سنائے گا جو اس چیز کے اوپر آمادہ ہو کہ میں سنوں' غور و فکر کے بعد دیکھوں کہ یہ صحیح ہے۔ صحیح پائے تو اس کو قبول کر لے' اور اس کو قبول کرنے کے بعد اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ یہ جو کرے گا اس کو یہ قرآن فائدہ دے گا ورنہ یہ مردوں کی بستی کے اندر مرثیے پڑھ کر تم چلے آؤ۔ کچھ کر لو' فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ تو زندہ نہیں ہو سکتے۔'' (بحوالہ درسِ قرآن حکیم مورخہ 3 نومبر 1978)

## پرویز صاحب کی زندگی بھر کی خواہش

عزیزانِ من! آخر پر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ محترم پرویزؒ صاحب کے وہ دل کی دھڑکن کی یہی وہ آواز تھی جسے ہم سن نہ سکے۔ چنانچہ مفکرِ قرآن نے اسی حساس خیالی کے پیشِ نظر 22 دسمبر 1978ء کو ایک درس کے دوران فرمایا کہ

''میرے عزیزو! زندگی کے اس مرحلے میں کیا کروں؟ کہیں مجھے نوجوان مل جاتے تو انہیں میں نصاب کے طور پر قرآن پڑھاتا اور انہیں اقبال سناتا۔''

افسوس کہ ان کی یہ دلی خواہش پوری نہ ہو سکی اور بقول غالب کہ

غم سے مرتا ہوں کہ دنیا میں نہیں ہے کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

اشرف ظفر
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور

# پہلا باب: سورۃ النمل (آیات 1 تا 9)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طٰسٓ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۱﴾ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۵﴾ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ﴿۶﴾ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۷﴾ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸﴾ يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۙ﴿۹﴾

عزیزانِ من! آج اگست 1978ء کی 25 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النمل سے ہو رہا ہے: (27:1)

## تجدیدِ یادداشت اور ربطِ مضمون

عام طور پر نمل کے معنی چیونٹی کیے جاتے ہیں۔ اس سورۃ میں جہاں یہ ذکر آئے گا، میں اس کی وضاحت کروں گا کہ النمل میں مفہوم کیا ہے اور اس سورۃ کا نام النمل کیوں رکھا گیا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے شروع میں ہی یہ بتایا تھا کہ قرآنِ کریم نے جو اپنے ہاں مختلف انبیائے کرام ؑ کے واقعات بیان کیے ہیں وہ محض تاریخ نویسی نہیں بلکہ وہ ایک بڑی بنیادی حقیقت کو لیے ہوئے ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ دین شروع سے آخر تک ایک ہی رہا ہے۔ اصولی طور پر ہر رسول کو وہی دین دیا جاتا تھا۔ اس دین کو عملاً متشکل کرنے کے طریقے، تدبیریں اور شکلیں مختلف ہو جاتی تھیں مگر اصولاً دین وہی رہا کرتا تھا۔ ہر رسول جس دور میں آیا اس دور میں باطل نظام کی جو شق سب سے زیادت مضرت رساں تھی، اس کی اصلاح کے لیے، اس کی جگہ صحیح نظام کو متشکل کرنے کے لیے، اس رسول نے جہاد کیا اور قرآنِ کریم نے اس خاص شعبے کو اہمیت دے کر اپنے ہاں بیان کیا۔ اس لیے میں نے کہا تھا کہ اگر یہ جو انبیائے کرام ؑ کے تذکار جلیلہ آتے ہیں ان کے ان نمایاں گوشوں کو اکٹھا کر دیا جائے تو وہ صحیح دینِ خداوندی یا نظامِ خداوندی ایک گلدستے کی شکل میں ہمارے سامنے آ جائے گا اور مکمل شکل

میں پھر وہ قرآنِ کریم کے اندر خدا نے منضبط کر دیا اور اسے محفوظ کر دیا۔

سابقہ سورۃ الشعراء میں حضرت نوحؑ سے لے کر حضرتِ شعیبؑ تک کے انبیائے کرامؑ کے تذکارِ جلیلہ آ گئے تھے۔ اب اس کے بعد جنہیں انبیائے بنی اسرائیل کہتے ہیں ان میں سے اہم انبیاء کا تذکرہ اس سورۃ میں آئے گا اور آگے بھی آئے گا۔ بات یہاں سے شروع ہوتی ہے۔

## حروفِ مقطعات کی حقیقت میری بصیرت میں

یہ سورۃ النمل طٰسٓ سے شروع ہوتی ہے۔ کئی سورتوں کے پہلے یہ اس قسم کے حروف آتے ہیں اور یہ میں نے ہر مقام پہ واضح کیا ہے کہ اصطلاح میں ان کو حروفِ مقطعات کہتے ہیں یعنی لفظوں سے قطع کیے ہوئے حروف' ایک ایک لفظ میں سے کوئی ایک حرف الگ کر کے۔ یہ حروفِ مقطعات وہ حروف (Letter) ہیں' الفاظ (Words) نہیں ہیں۔ قرآنِ کریم عربوں کی زبان میں نازل ہوا اور یہ انہی کے اسلوبِ بیان کا ایک خاصہ تھا۔ اصل تو یہ ہے کہ یہ انہی کا نہیں بلکہ ان سے پہلے عبرانی زبان میں بھی یہ چیز تھی' وہاں بھی حروفِ مقطعات استعمال ہوتے تھے۔ عربوں کے ہاں بھی یہ چیز پائی جاتی تھی اور ان کے ہاں چونکہ شاعری تھی' نثر نہیں تھی اور شعر میں تو عام طور پر وہ عرب یہ چیز لایا کرتے تھے۔ قرآنِ کریم نے یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس نے خود یہ بیان نہیں کیا کہ یہ کون سے الفاظ ہیں جن کے یہ حروف الگ کر کے قرآن کی کچھ سورتوں کی آیتوں کے پہلے' ابتدا ہی ابتدا میں' رکھے گئے ہیں۔ میں نے اپنی بصیرت کے مطابق یہ دیکھا ہے کہ یہ عام طور پر اللہ تعالیٰ کی قرآنِ کریم میں جو صفات آئی ہیں ان صفات کے الفاظ سے حروف لے کر' کسی سے کوئی حرف' کسی سے کوئی حرف لے کر' انہیں اکٹھا کر کے شروع میں کہا گیا ہے۔ تو میں ہمیشہ یہی کہا کرتا ہوں کیونکہ میں اسی نتیجے پہ پہنچا ہوں۔ اب یہ طٰسٓ (27:1) ہے یعنی طاس۔ قرآنِ کریم میں ''س'' تو سمیع سے ہے اور ط ''ذی الطّول'' کے لیے ہے۔ خدا کے لیے آیا ہے کہ وہ بڑے اقتدار کا مالک ہے' صاحبِ اختیار ہے' صاحبِ قدرت ہے۔

## قرآنِ حکیم کی اپنی بیان کردہ صفات کے باوجود ہمارا تصور

کہا گیا ہے کہ طٰسٓ قف تِلْکَ اٰیٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ (27:1) خدائے سمیع وذی الطّول کا ارشاد ہے کہ یہ اس قرآن کے احکام ہیں جو ایک واضح کتاب ہے۔ خود واضح اور ہر شے کو واضح کرنے والی ہے۔ پہلی چیز قرآن کے متعلق' خود اللہ تعالیٰ نے' جو قرآن بھیجنے والا ہے' یہ کہی ہے کہ یہ کتابِ مبین ہے۔ اسے اس نے نور بھی کہا ہے۔ جو مبین ہے یعنی خود واضح ہے وہ ہر شے کو واضح کرنے والی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس کے متعلق یہ کہنا کہ صاحب! قرآن میں ابہام ہے' اجمال ہے' اس میں وضاحت نہیں ہے' صحیح نہیں ہے اور

یہ کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے اٹھارہ علوم کی ضرورت پڑتی ہے' پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا' یہ بھی صحیح نہیں ہے۔اب یہ دیکھیے کہ قرآن بھیجنے والا یہ کہہ رہا ہے کہ یہ بڑی واضح کتاب ہے۔اور اس کی وضاحت کے لیے اس نے یہ نہیں کہا ہے کہ یہ کہیں باہر سے کرائی جائے گی۔خدا نے خود کہا ہے کہ **اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ** (75:19) اس کتاب کو ہم نے بھیجا تو اس کی وضاحت کرنا ہمارے ذمے تھا۔اور وہ وضاحت اس نے قرآن کے اندر کر کے اسے کتاب مبین کہا ہے۔یہ بڑی واضح کتاب ہے بشرطیکہ اپنے مفہوم کو سمجھنے کا جو طریقہ اس نے بتایا ہے اس طریقے کی رو سے قرآن کو سمجھا جائے پھر کہیں کوئی مشکل پیش ہی نہیں آتی۔

## قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے سلسلہ میں میری 50 سالہ کوشش کا ماحصل: پرویزؒ

یہ بات اب میں کسی فخر سے نہیں بلکہ تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کروں گا کہ سنی سنائی بات نہیں کر رہا۔آپ کو معلوم ہے کہ میں نے پچھلے پرچے [1] میں یہ چیز لکھی تھی کہ مجھے قرآنِ کریم پر اس انداز سے غور و فکر کرتے ہوئے پورے پچاس سال ہو گئے۔اور اسی لیے اب تو میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پہ کہہ سکتا ہوں کہ قرآن کو قرآن کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق سمجھا جائے تو کہیں کوئی مشکل پیش نہیں آتی لیکن اس میں محنت کرنا پڑتی ہے۔قرآن کے الفاظ کا مفہوم اس زبان کی رو سے سمجھنا ہوتا ہے جو نزولِ قرآن کے وقت عربوں کے ہاں رائج تھی۔پہلی چیز یہ ہے۔قرآن جب نازل ہی اس زبان میں ہوا جو اس دور کے عربوں کے ہاں مروج تھی تو ظاہر ہے کہ پہلے تو اس زبان کے جو الفاظ ہیں ان کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے۔میں یہ عرض کر دوں کہ میں نے معلوم نہیں کتنا عرصہ اس کے اوپر صرف کیا۔یہ جو میری ''لغات القرآن'' ہے' اسے میں نے اس لحاظ سے مرتب کیا ہے کہ قرآنِ کریم کے یہ جو عربی کے الفاظ ہیں عربوں کے ہاں زمانہ نزولِ قرآن میں ان کا کیا مفہوم لیا جاتا تھا۔پہلی بات تو واضح ہو گئی۔

دوسری چیز قرآن یہ کہتا ہے کہ وہ جو مضمون ایک جگہ لیتا ہے تو اسے ایک ہی جگہ نہیں لکھ دیا بلکہ قرآن کے مختلف مقامات میں اس کے مختلف اجزاء' اس کی مختلف شکلیں' پھیلی ہوئی ہیں۔اسے تصریفِ آیات کہتے ہیں۔یعنی آیات کو پھیر پھیر کر سامنے لانا۔اس نے کہا ہے کہ جس موضوع کے متعلق تم نے کچھ سمجھنا ہو تو یہ دیکھو کہ قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پر اس کے متعلق کیا آیا ہے۔ان تمام چیزوں کو تم اکٹھا کر لو گے تو پھر دیکھو گے کہ اس سے اس موضوع کی پوری پوری وضاحت ہو جائے گی۔اب یہ جو دوسری چیز ہے جسے تصریفِ آیات

---

[1] مجلّہ طلوع اسلام جولائی 1978۔ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور کا یہ ماہانہ مجلّہ جناب غلام احمد پرویزؒ (1903.1985) نے قائداعظم محمد علی جناحؒ (1876-1948) کے ارشاد کے مطابق دہلی سے جاری کیا۔پہلے دورِ دہلی میں اپریل 1938 سے مئی 1942ء تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔پاکستان بن جانے کے بعد جنوری 1948ء میں دوبارہ شروع کیا اور باقاعدگی سے تاحال جاری ہے۔

کہتے ہیں' یہ بھی میں نے مدت العمر کی محنت کے بعد مرتب کی۔ پہلے تو بہر حال خود سمجھنے کے لیے کیا تھا اور اس کے بعد میں نے اب یہ جو میری اب تک کی آخری کتاب ''تبویب القرآن'' شائع ہوئی ہے تو اس میں بھی میں نے موضوع کے اعتبار سے اس کے حوالے دے دیئے کہ قرآن میں اس کے متعلق کہاں کہاں کیا کیا آیا ہے۔ اس طریقے کے مطابق میں نے قرآن کا مفہوم متعین کیا ہے۔ وہ چیز ''مفہوم القرآن'' میں آئی ہے۔ اب یہ جو میں نے احباب کے تقاضے کے مطابق' جسے تفسیر کہتے ہیں' اس کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ ''مطالب الفرقان'' ہے تو وہ بھی یہی انداز ہے کہ قرآن کی ایک آیت میں جو کچھ کہا گیا ہے تو قرآن میں جہاں جہاں اس موضوع سے متعلق کچھ آیا ہے ان تمام چیزوں کو وہاں اکٹھا کر دیا ہے اور اس کے مطابق پورے کا پورا جو موضوع ہے وہ واضح طور پر سامنے لایا گیا ہے۔ یہ ہے ''مطالب الفرقان''۔ اسی لیے اس کی پہلی جلد غالباً چار پانچ سو صفحات کی ہے۔ اور اس کے اندر جو آیتیں ہیں' وہ 30 تک بھی نہیں آئی ہیں۔ جنہوں نے اسے پڑھا ہے انہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ بیس تیس آیات نہیں ہیں اس سے تو سارا قرآن سمجھ میں آ جاتا ہے۔ بات ٹھیک ہے۔ وہ تو نمایاں طور پر یوں سمجھیے کہ سرخیٔ افسانہ ہے' عنوان کے اعتبار سے ایک آیت ہے جو سامنے آئی ہے۔ اس کے نیچے تو قرآنِ کریم نے جہاں جہاں اس موضوع کے متعلق کچھ کہا ہے وہ سارا اس کے اندر آ گیا ہے۔ اس اعتبار سے ان کا کہنا ٹھیک ہے' اس سے تو قرآن سمجھ میں آ جاتا ہے۔ یہ ہے قرآن کے سمجھنے کا انداز۔ اس انداز سے اگر قرآن سمجھ لیا جائے یا اس طرح قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی جائے' مگر میں نے عرض کیا ہے کہ اس میں تو محنت درکار ہے' قرآن کا کوئی مقام ایسا نہیں ہے جو اس طرح واضح نہ ہو جائے۔ اس لیے اس نے اپنے آپ کو کتابِ مبین کہا ہے' خود واضح اور ہر شے کو واضح کرنے والی۔

## ہمارے ہاں دارالعلوموں کی سعی و کاوش کی حالتِ زار

جب اسنے اس کو روشنی کہا ہے' نور کہا ہے تو روشنی تو اپنے آپ کے لیے کسی دوسری شے کی محتاج ہی نہیں ہوتی۔ روشنی دوسری چیزوں کو دکھاتی ہے۔ یہ بتانے کے لیے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی کہ یہ روشنی ہے۔ وہ روشنی تو خود بتا رہی ہوتی ہے کہ میں روشنی ہوں۔ اس لیے قرآن کے متعلق یہ جو گھپلا ڈالا جاتا ہے کہ بڑی مشکل کتاب ہے' یہ سمجھ میں نہیں آتی' غلط ہے' مغالطہ انگیز ہے۔ وہ سارے علوم جو یہاں دارالعلوموں میں پڑھائے جاتے ہیں جس کے بعد یہ حضرات فضیلت کے عمامے باندھ کر آتے ہیں' آپ کو معلوم ہے کہ وہ آٹھ نو سال کا کورس ہے۔ اس میں قرآنِ کریم کی صرف سورۃ البقرۃ کی تفسیر آتی ہے' پورا قرآن بھی اس میں شامل نہیں ہے۔ اس میں وہ پوری عمر صرف کرتے ہیں اور جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ اٹھارہ علوم کی ضرورت ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ چیز قرآن کے لیے نہیں ہے۔ قرآن کی تو میں نے کہا ہے کہ ان درالعلوموں میں آخری دور میں تبرکاً سورۃ البقرۃ کی صرف بیضاوی کی تفسیر پڑھائی جاتی ہے۔ یہ ہوا ہے اس قرآن کے

ساتھ۔اور پھر جب قرآن کے متعلق بات ہوتو وہ اسے از حد مشکل پیچیدہ، مبہم (معاذ اللہ) کہتے ہیں اور پھر یہ چیز کہ صاحب! اس میں تو بالکل کوئی ترتیب ہی نہیں ہے، اکھڑی اکھڑی سی باتیں ہیں مثلاً ابھی جنت کا قصہ ہے، اس کے بعد حضرت موسیٰؑ آ جاتے ہیں، کبھی اگلی ہی آیت میں بدر کا میدان آ گیا ہے، یعنی آپ سوچیے کہ اس قرآن کے اوپر ایمان بھی رکھتے ہیں کہ خدا کی کتاب ہے اور اس کی شان یہ بتائی جارہی ہے۔ان میں سے اگر کسی کی کتاب کے متعلق یہ کہا جائے کہ صاحب! اس میں تو ربط ہی نہیں ہے، بڑا مبہم ہے، بڑا مجمل ہے تو سوچیے تو سہی اس کے متعلق کوئی کیا کہے گا۔اپنی کتاب کے متعلق تو یہ سننا ہی گوارہ نہیں کریں گے لیکن غریب کی جورو سب کی بھابھی۔

## علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم کتاب قرآنِ حکیم ہے

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ (1877-1938) کے الفاظ میں یہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم یہ قرآن ہے، جس کا جی چاہتا ہے جو جی میں آئے اس کے متعلق کہہ جاتا ہے حالانکہ قرآن اپنے بارے میں خود کہتا ہے کہ **تِلْکَ اٰیٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ** (27:1)۔یہاں ''وَ'' کے معنی ''اور'' نہیں ہیں کہ قرآن اور ہے اور کتاب مبین اور ہے۔عربی زبان میں اس کو تفسیری ''وَ'' کہا کرتے ہیں۔اس کے معنی ''یعنی'' ہوا کرتے ہیں۔قرآن یعنی ایک ایسی کتاب جو خود بھی واضح ہے اور ہر شے کو واضح کرتی ہے۔پہلی صفت تو اس کی یہ ہوگئی۔

اب سوال یہ ہے کہ اس سے مقصد کیا ہے؟ کہا کہ یہ **ھُدًی وَّبُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ** (27:2)۔یہاں تین الفاظ ہیں۔یہ عجیب چیز ہے۔صحیح راستے کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔یہ ''ہدایت'' عربوں کے ہاں صرف راستے کو یونہی نہیں کہتے تھے بلکہ وہ اس طرح کا نشانِ راہ ہوتا تھا جو ابھرا ہوا نمایاں طور پر کہیں نظر آ جائے۔سمندر میں وہ سفر کریں تو وہاں کوئی ایسی چٹان جو سطحِ آب سے ابھری ہوئی ہو جیسے روشنی کا مینار۔ہمارے ہاں یہ ہوتے ہیں۔اس طرح کی ابھری ہوئی جو چٹان ہے، وہ سمندر میں راہنمائی کے لیے ہے۔یہ جو اس طرح سے ابھرے ہوئے نشانِ راہ ہوں ان کو ان کے ہاں ہدایت کہا جاتا تھا۔یہ تو خود مبین کا مفہوم واضح کر رہا ہے کہ راستہ بتا رہی ہے اور وہ یونہی نہیں ہے کہ سپاٹ سا راستہ ہے، آپ خود ڈھونڈیے کہ کون سا راستہ کدھر جاتا ہے۔وہاں اونچے اونچے سنگِ میل لگے ہوئے ہیں جو دور سے بتا رہے ہیں کہ راستہ کدھر جا رہا ہے۔دیکھا اس لفظ کے اندر کتنی وضاحت ہے!

## ذہنی تذبذب انسان کو منزل سے ہم کنار کر ہی نہیں سکتا۔

عزیزانِ من! جیسا میں نے عرض کیا ہے قرآن کے تو الفاظ میں اعجاز ہے اور ہر لفظ دوسری بات کی وضاحت کرتا ہے۔یہاں مبین کی وضاحت اس نے ''ھدی'' سے کی ہے۔ھدی کہتے ہی ایسے راستے کو ہیں جو ابھرا ہوا ہو، نمایاں طور پہ دور سے نظر آ جائے۔راستہ

نظر آ گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ پھر کیا ہوا؟ کہا کہ یہ بشریٰ ہے' خوشخبری ہے' مژدۂ جاں فزا ہے۔ سوچیے کہ منزل تک پہنچنے سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ مسافر ہی بتا سکتا ہے۔ یہ بشریٰ ہے۔ یہ کس کے لیے ہے؟ کہا کہ **لِلْمُؤْمِنِيْنَ** (27:2)۔ یہ اس کی پہلی صفت ہے' مگر اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ اس کی صداقتوں پر یقینِ محکم ہو' اس یقین کے ساتھ اس راستے پر چلے کہ یہ مجھے منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا۔ اگر آپ تذبذب کے ساتھ چلتے ہیں تو ہر قدم کے اوپر آپ کے قلب میں اضطراب ہوتا ہے۔ اور اس نے ابتدا میں کہا ہے کہ **ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ** (2:2)۔ اس کا ترجمہ تو کیا جاتا ہے کہ اس کتاب کے اندر شک نہیں ہے۔ ''ریب'' اس قسم کے شک کو کہتے ہیں جس سے قلب میں اضطراب پیدا ہو کہ پتہ نہیں یہ راستہ مجھے صحیح منزل کی طرف پہنچائے گا یا نہیں پہنچائے گا۔ وہ کہتا ہے کہ پہلا قدم اٹھانے سے پیشتر اس کا یقین کر لو کہ یہ راستہ مجھے منزل تک ضرور پہنچائے گا۔ یہ جو اس قسم کی Conviction (یقین واعتماد) ہے' اسے ایمان کہا جاتا ہے۔ اور اسی لیے اس ایمان سے پہلی چیز جو انسان کو نصیب ہوتی ہے وہ وہی چیز ہے جس کا مادہ ''امن'' ہے۔ اس سے اضطراب کی جگہ امن نصیب ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس راستے کے اوپر چلے' منزل پہ پہنچے۔ اور وہ جو بشریٰ ہے وہ اس مسافر کے لیے بڑی خوشخبریاں ہیں' بشارتیں ہیں جو صحیح منزل پہ پہنچے۔

## حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں متقی اور تقویٰ کے مفہوم کی وضاحت

یہاں کہا ہے کہ **هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ** (2:2)۔ یہ وہی بات ہے جس پہ پھر اعتراض ہوتا ہے کہ صاحب! متقیوں کے لیے ہدایت ہے تو وہ کہنے لگے کہ متقی پہلے ہی ہدایت یافتہ ہوتے ہیں اور اس کے اوپر پھر انہی کے لیے ہدایت ہے۔ تو یہ جو باقی بیچارے گناہگار ہیں' فاسق و فاجر ہیں' متقی نہیں ہیں تو ان کے لیے تو یہ کچھ بھی نہ ہوا۔ پوچھیے عربوں سے کہ اس کے معنی کیا ہیں' وہ بتائیں گے۔ حضرت عمرؓ (581-644/45ء) سے پوچھا گیا کہ تقویٰ کیا ہے؟ آپؓ نے کہا کہ کبھی ایسے راستے سے گزرے ہو جس میں خاردار جھاڑیاں ہوں اور چھوٹی سی پگڈنڈی ہو اور عربوں جیسا وہ لباس ہو۔ کہا کہ بتاؤ' کیسے گزرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ جی' وہ اِدھر سے کھسک کر اُدھر سے یوں کپڑا پکڑ کے' یوں ادھر ہو کے کہ یہاں کانٹا نہ لگ جائے۔ کہنے لگے بس اس طرح سے جو راستہ چلنا ہوتا ہے اسے تقویٰ کہتے ہیں۔ یہ (قرآن) اسے صحیح راستے کی راہنمائی دیتا ہے جو راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلنا چاہے۔ اور جو چاہے ہی یہ کہ میں نے خودکشی کرنے کے لیے جانا ہے تو اس کی ہدایت کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اسے یہ کہنا کہ صاحب! ادھر نہ جاؤ ادھر پانی گہرا ہے تو وہ کہے گا کہ ''اللہ بھلا کرے میں ایہو تے لبدا ساں کہ ڈوبو ہے کتھے؟'' [1] وہ دریا میں یہ بتانا ہے کہ جو ملاح یوں جاتے ہیں' یہ لفظ ان کے لیے ہے کہ جو

---

[1] اللہ بھلا کرے' میں اسی کی تو تلاش میں تھا کہ اس کا پانی کہاں ڈوبو (اتنا گہرا جس میں اترنے والا ڈوب جائے) ہے؟

بحفاظت اگلے مقام تک جانا چاہے۔ اسے متقی کہتے ہیں۔ جو بحفاظت منزلِ مقصود تک پہنچنا چاہتا ہے تو یہ اس کے لیے راستے کی راہنمائی کرتا ہے۔ یہ اسی کے لیے بشریٰ ہے۔ یہ للمؤمنین ہے۔

اگلی ہی آیت میں مومنین کے لیے کہا کہ **الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَ ہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ** (27:3)۔ یہاں مومن کے لیے دو مقاصد بیان کیے ہیں: اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ۔ مروجہ مفہوم کے مطابق یہ ہے کہ جو نماز پڑھتے ہیں اور سال کے بعد اڑھائی پرسنٹ دیانتداری و ایمانداری سے نکال کر خیرات کی طرح دے دیتے ہیں۔ دو ہی تو باتیں یہاں کہی گئی ہیں۔ کیا پھر ان دو باتوں سے انسان مومن ہو جاتا ہے؟ کہتا ہے کہ تم کبھی جنت کا تصور بھی نہ کرو تاوقتیکہ تم ان مراحل سے نہ گزرو جن مراحل میں سے انبیاء اور ان کی امتیں گزریں اور حالات یہ پیدا ہو گئے کہ مخالفت کا مقابلہ کرتے کرتے ان کے سانس حلقوں میں آ کر رک جاتے' ان کی آنکھیں زرد ہو جاتیں۔ اور اس وقت وہ پکار اُٹھے تھے کہ یا اللہ! وہ جو تیری مدد ہے وہ کہاں ہے؟[1] کہا کہ یہ اس قسم کی مزاحمتیں اور مخالفتیں ہوں گی۔ قدم قدم کے اوپر شمشیر آزمائی ہو گی۔ یہاں تو اس ترجمہ کے مطابق مومن کے لیے بڑا ہی آسان ہو گیا کہ نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک مقامِ مومن کا تعین

اب یہ دیکھیے کہ اس ترجمہ کی رو سے یہ جتنے بھی ہیں' آپ ان سب کو مومن کہیں گے۔ اس نے تو ایک ہی بات کہی تھی کہ **وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ** (3:139)۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ جسے آپ کافر یا غیر مومن کہتے ہیں وہ مومنین کے اوپر کسی طرح بھی غلبہ پا سکیں۔ یہ اس نے خود مومن کے لیے کہا ہے اور یہاں کہا ہے کہ **الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَ ہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ** (27:3)۔ اور ان کی نشانی یہ بتائی ہے کہ کوئی بھی ان سے بالا نہیں ہو گا۔

مومنے بالائے ہر بالاترے

کیا حسین بات کہتا ہے یہ![2] اس لیے کہ

غیرت اودر نتابد ہمسرے

کسی کا اس سے اونچا ہونا تو ایک طرف' اس کی تو غیرت اس کو بھی برداشت نہیں کرتی کہ کوئی اس کے دوش بدوش چلے۔ سب پیچھے چلیں'

---

[1] یہ (2:214) کی طرف اشارہ ہے۔

[2] یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

سب نیچے رہیں۔مومن کا تو مقام ہی اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ (3:139) ہے۔تو یہ مقام نماز پڑھنے زکوٰۃ دینے اور یہ کہنے سے کہ آخرت پر ہمارا ایمان ہے نہیں ہوسکتا۔

## ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟

چھوڑ دیجیے ان لوگوں کو جو گنہگار ہیں جو بہرحال نماز نہیں پڑھتے زکوٰۃ نہیں دیتے۔یہ جو پڑھنے والے ہیں یہ جو زکوٰۃ دینے والے ہیں قرآن نے جو بتایا ہے کہ مومن کی نشانی یہ ہے اس کا مقام یہ ہے تو کیا انہیں یہ مقام حاصل ہے؟ اب آپ نے سوچا کہ یہ قرآن کو کیوں سامنے نہیں لاتے۔قرآن کو سامنے لائیں تو وہ تو یہ کہے گا کہ صاحب! وہ تو یہ کہتا ہے۔اور حالت کیا ہے؟ باقی چیزوں کو تو چھوڑ دیجیے صرف یہ دیکھیے کہ دنیا میں ہماری حالت کیا ہے۔روٹی تک کے لیے ہم دوسروں کے محتاج ہیں۔اب دنیا کے اندر قریباً نوے کروڑ [1] مسلمانوں کی آبادی بتاتے ہیں۔یہ مسلمانوں کا ایک بحرِ زخّار ہے جسے مڈل ایسٹ کہتے ہیں۔مراکو سے لے کر پاکستان تک محیط ہے۔اس کے اندر ایک اتنا سا ٹکڑا ہے جو ذرا برابر بھی نہیں ہوسکتا۔یہ وہی ہے جسے آپ اسرائیل کی حکومت کہہ رہے ہیں جسے یہودیوں کی حکومت کہہ رہے ہیں۔کراچی کی آبادی جتنی اس مملکت کی آبادی ہے بلکہ اب تو کراچی کی آبادی بھی بڑھ گئی ہوگی۔اتنی آبادی ہے اتنا سا وہ ایک Spot (جگہ) ہے کم از کم ساٹھ ستر کروڑ مسلمانوں کے اندر گھرا ہوا ہے۔تیس سال مسلمانوں کو روتے گڑگڑاتے دعائیں مانگتے ہوگئے یہ کہاں کہاں دعائیں نہیں مانگتے۔یہ تو ان جگہوں پہ جا کر بھی دعائیں مانگتے ہیں جن جگہوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہاں دعائیں منظور ہوتی ہیں وہ مقام خانہ کعبہ ہے میدانِ عرفات ہے جبلِ رحمت کے نیچے۔کوئی ایک دو نہیں پندرہ پندرہ لاکھ مسلمان اکٹھا ہو کر رو رہا ہے چلّا رہا ہے ساتھ کے ساتھ دعائیں مانگتا چلا جا رہا ہے کہ یا اللہ! بنی اسرائیل کی توپوں میں کیڑے پڑیں۔

عزیزانِ من! میں پوچھتا ہوں کہ مومن کے متعلق جو قرآن نے کہا کہ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ (3:139) اس سے اوپر کوئی نہیں ہوسکتا وہ سب سے اوپر غالب ہوں گے جن کو تم مومن کہتے ہیں۔آج ان مومنین کی کیفیت یہ ہے کہ ان ستر اسی کروڑ مومنین کے اندر تیس سال سے ان کی ایک پھانس چبھی ہوئی ہے۔تیس سال سے یہ نوے کروڑ مومنین پھانس کو نہیں نکال سکے۔رو رہے ہیں۔سوال یہ ہے کہ اگر اقامتِ صلوٰۃ کے معنی نماز پڑھنا اور ایتائے زکوٰۃ کے معنی اڑھائی پرسنٹ دینا ہے آخرت پر ایمان تو ان میں ہر ایک کا ہے تو کیا اس سے مومن ہوجاتا ہے؟ یہ جو نوے کروڑ ہیں بہرحال ان میں سے آدھے چھوڑ دیجیے جو نماز روزہ نہیں کرتے ہوں گے جو باقی ہیں ان کی یہ صورت ہے کہ وہ اتنی سی پھانس جو چبھ گئی ہوئی ہے تیس سال سے اسے بھی نہ نکال سکے۔اور طرفہ تماشا یہ کہ پھر بھی وہ مومن کہلائیں؟ نظر

---

[1] یاد رہے یہ بات اگست 1978 کی 25 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

آیا کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ تو کوئی بہت بڑا پروگرام ہے۔

## اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے پروگرام کی وضاحت اور اس کے خدوخال

قرآن نے یہاں مومن کے لیے دو ہی باتیں کہی ہیں۔ باقی جتنا پروگرام ہے وہ دوسرے مقامات میں پھیلا ہوا ہوگا۔ سمٹا کر تو اس نے یہ دو ہی باتیں کہیں۔ میں ان چیزوں کے متعلق وضاحت کرتا چلا آ رہا ہوں۔ صلوٰۃ ایک نظام کا نام ہے جسے نظامِ خداوندی کہتے ہیں۔ صلوٰۃ کے معنی ہوتا ہے کہ ''کسی کے پیچھے پیچھے اس طرح سے چلے جانا کہ جس رفتار سے وہ جائے' اسی رفتار سے یہ چلا جائے اور دونوں کے درمیان فاصلہ نہ رہے۔ یہ ریس میں جو پہلے نمبر کے گھوڑے کے پیچھے اس شرط کے ساتھ دوسرے نمبر پر گھوڑا چلتا ہے تو عرب کہتے تھے کہ اس کی پشت کے ساتھ اس کی کنوتیاں ملتی ہوئی جائیں' اس طرح سے وہ اس اگلے گھوڑے کی اتباع کرے۔ اسے وہ مصلی کہتے تھے یعنی پابندِ صلوٰۃ''۔ دعائیں مانگتے ہیں کہ **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ** (1:6)۔ قرآنِ کریم حضرت ھودؑ کے الفاظ میں کہتا ہے کہ **اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ** (11:56) میرا رب صراطِ مستقیم پہ ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ یعنی اللہ تعالیٰ آگے آگے جا رہا ہے اور یہ مصلی اس کے پیچھے پیچھے اسی رفتار سے چلا جا رہا ہے۔ قوانینِ خداوندی کا اتباع اس شکل میں ہو کہ درمیان میں کوئی Interruption (مداخلت) نہ ہو' درمیان میں انقطاع نہ ہو' درمیان میں فاصلہ نہ پڑ جائے۔ پوری کی پوری قوم اس طرح سے اس نظام کا اتباع کرتی چلی جائے' تو یہ ہے نظامِ صلوٰۃ۔

اب آپ نے سوچ لیا کہ کیوں قرآن نے دو ہی چیزیں کہیں۔ پہلی چیز یہ اقامتِ صلوٰۃ کہی اور اس کے ساتھ ہی کہا کہ **وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ** (27:3)۔ انہوں نے یہ کہا ہے کہ اڑھائی پرسنٹ زکوٰۃ دیتے ہیں۔ یہ Percentage (فی صد) اس کا مفہوم ہی نہیں ہے کہ اس میں سے کچھ نکال کر دے دینا۔ زکوٰۃ کے معنی ہیں ''سامانِ نشوونما بہم پہنچانا''۔ ان دونوں کا مقصد اپنی زندگی کے اندر' قوانینِ خدوندی کے مسلسل متواتر غیر منقطع اتباع کے ساتھ نظامِ خداوندی کا قیام۔ اور نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانا۔ اس سامانِ نشوونما کے لیے حضورؐ نے فرمادیا کہ جس بستی میں رات کو ایک شخص بھوکا سو گیا تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہوگئی کیونکہ اس بستی والوں نے ایتائے زکوٰۃ نہیں کیا۔ ایک شخص بھوکا سو گیا۔ یہ ہے ایتائے زکوٰۃ کہ سامانِ نشوونما بہم پہنچانا۔

## ایتائے زکوٰۃ کے لیے جذبہ محرکہ کی وضاحت

اب سوال یہ ہے کہ سامانِ نشوونما کیسے بہم پہنچایا جائے گا؟ ایک شخص دن سے رات تک محنت کرتا ہے اور اتنا پیدا کر لیتا ہے کہ وہ اس کے بچوں کی ضروریات سے کہیں زائد ہوتا ہے۔ دوسرے وہ لوگ بھی ہیں جو محنت کرتے ہیں لیکن اتنا نہیں کما سکتے' جو معذور ہیں وہ کما ہی

نہیں سکتے۔ یہ جو اس نے اتنا کمایا کہ اس کو اس کی ملکیت قرار دے دیا گیا کہ بے شک کوئی بھوکا مرتا رہے۔ آج یہی ہو رہا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ نہیں' اس میں تو تُو اپنی ضروریات کے مطابق رکھ سکتا ہے اور جتنا فاضل (Surplus) ہے وہ انہیں دینا ہے جن کی ضروریات اس طرح سے پوری نہیں ہوتیں۔ یہ ایتائے زکوٰۃ ہے۔ یہ ہے نظام' جو قائم کرنا ہے۔ ہر شخص جان مار کر محنت کرے اور جو بھی ضرورت سے زائد ہے' وہ دوسروں کو دیدے۔ اور ایک دو دن ہی ایسا نہ کرے' بلکہ زندگی بھر ایسا ہی کرتا رہے۔ نہ تو یہ کرے کہ جب میں نے اس میں سے لینا ہی دو در پے ہیں تو میں زیادہ محنت کیوں کروں' میں اپنی جان کیوں ماروں' میں کام ہی اتنا کیوں کروں؟ کیا Incentive (جذبہ محرکہ) ہے کہ وہ یہ کرتا چلا جائے؟ اس کے لیے Incentive (جذبہ محرکہ) **بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ** (27:3) ہے۔ میری زندگی یہیں ختم ہونے والی نہیں ہے' بلکہ اس سے آگے بھی چلنے والی ہے اور اس کے بعد' زندگی کے اور ارتقائی منازل بھی ہیں۔ وہ زندگی اس کی خوشگوار اور حسین ہوگی جو زیادہ سے زیادہ کمائے گا' کم از کم رکھے گا اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشوونما کے لیے دیدے گا۔ اس ایمان کی وجہ سے وہ یہ کچھ کرے گا۔ یہ Incentive (جذبہ محرکہ) ہے' یہ جذبہ محرکہ ہے۔ اس کے برعکس اگر یہ بات ہے کہ میری زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے' جسے جسم کی موت کے ساتھ ختم ہو جانا ہے' تو کوئی شخص اتنا ایثار کر ہی نہیں سکتا۔ اس لیے یہ اگلی آخری چیز بتائی کہ یہ نظام اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ تم لوگوں کا یہ ایمان ہو کہ زندگی یہیں ختم نہیں ہوتی۔

اب اقامتِ صلوٰۃ کی یہ چیز جو میں نے ابھی کہی ہے' وہ تو اس نظام کا نام ہے جس میں ہر فرد قوانینِ خداوندی کا اتباع اور پیروی کرتا چلا جائے۔ ایتائے زکوٰۃ اس طرح سے سامانِ نشوونما کا بہم پہنچانا ہے کہ کوئی فرد اپنے ہی معاشرے میں اس سے محروم نہ رہے۔ قرآن تو رب العالمین کہتا ہے یعنی پوری نوعِ انسانی کی نشوونما کی ذمہ داری اپنے اوپر لے۔ یہ سامانِ نشوونما بہم پہچانا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ایک فرد یہ کر سکے گا؟ عزیزانِ من! یہ کر رہے ہیں کہ افراد نمازیں پڑھ رہے ہیں اور افراد ہی زکوٰۃ دیتے ہیں۔

## اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ اپنی آزاد مملکت کے ساتھ مشروط ہیں

عزیزانِ من! کیا آپ کو معلوم ہے کہ قرآن اسی اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے لیے کیا شرط بتاتا ہے؟ کہتا ہے کہ ایسا کرنے والے یہ وہ لوگ ہیں جنہیں مومن کہا گیا ہے۔ **اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ** (22:41) جب ان کی مملکت قائم ہوگی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے۔ یعنی یہ بات تو مملکت سے مشروط ہے' **تمکن فی الارض** سے مشروط ہے۔ اگر اپنی Government (حکومت) نہیں' اپنی مملکت نہیں' تمکن نہیں' تو وہ کہتا ہے کہ یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہو ہی نہیں سکتی۔ اور یہاں صاحب! ہزار سال سے یہ حالت ہے کہ حکومت کسی کی بھی ہو' کیسی بھی ہو' وہ کہتے ہیں کہ

نماز پڑھنے کی اور زکوٰۃ دینے کی اجازت ہے۔تو ٹھیک ہے ہمارا نظام تو قائم ہوگیا' مذہبی آزادی حاصل ہوگئی لیکن قرآن کہتا ہے کہ اِنۡ مَّکَّنّٰهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ (22:41)۔انہیں جب تمکن حاصل ہوگا' جب ان کی اپنی مملکت آزاد ہوگی' تو پھر یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کرسکیں گے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے بغیر یہ ہونہیں سکتا۔اور انفرادی نماز اور انفرادی زکوٰۃ تو آپ ہر دور میں کرسکتے ہیں۔ انگریز کی حکومت میں وہاں کرتے تھے' آج ہندو کی حکومت میں انڈیا میں ہم کررہے ہیں۔

## علمائے کرام کی طرف سے تحریکِ پاکستان کے دوران اٹھنے والا جھگڑا

تحریکِ پاکستان میں یہی تو سارا جھگڑا تھا۔وہاں کے یہ علمائے کرام یہی کہتے تھے کہ یہ ہندو اور کانگریس ہمیں ضمانت دیتے ہیں کہ تمہیں پوری پوری مذہبی آزادی ہوگی' نمازیں جتنی جی چاہے پڑھو۔وہ تو چاہتے ہوں گے کہ پانچ چھوڑ کے پچاس روز کی پڑھیں۔ ''کسے ہورکم جوگے رہن ای اے نہ [1] وہ ضمانت دیتے تھے' وہ ریزولیشن پاس کرتے تھے۔مولانا حسین احمد مدنیؒ (1879-1957) ہمارے اعتراض کا یہی جواب دیتے تھے کہ بابا! دیکھو' وہ تو ضمانتیں دے رہے ہیں' ریزولیشن پاس کررہے ہیں کہ تمہیں مذہبی آزادی ہوگی' جتنی جی چاہے نمازیں پڑھو' زکوٰۃ ساری کی ساری دیا کرو' کسی قسم کی پابندی نہیں ہوگی۔اور قرآن کہتا ہے کہ اِنۡ مَّکَّنّٰهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ (22:41) یہ تو اپنی مملکت ہوگی تو ہوسکے گا۔اور عزیزانِ من! یہ تھی ساری تحریکِ پاکستان' جسے نگاہوں سے اوجھل ہی کردیا گیا۔مملکت بھی حاصل ہوئی تو اقامتِ صلوٰۃ وہی نماز ہی رہی جو ہندوستان میں ہم کرتے تھے جو آج ہندوستان میں مسلمان پڑھ رہا ہے۔ وہی زکوٰۃ رہی جو وہاں بھی ہم دیتے تھے اور آج بھی وہاں مسلمان دے رہا ہے اور یہ جو قرآن نے تمکن فی الارض کی شرط لگائی تھی اس کا کیا بنا؟ کچھ نہیں' نماز کی اور زکوٰۃ کی وہی شکل ہے۔جو وہاں تھی وہ یہاں ہے۔تو یہ جو اس نے شرط لگائی تھی تو کیا یہ خوامخواہ کے لیے شاعری تھی؟ اب آپ نے دیکھا کہ یہ جو باتیں کہی ہیں کہ الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَ هُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ هُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ [2] (27:3) وہ سارے کا سارا نظامِ خداوندی' جسے آپ اسلامی نظام کہتے ہیں' قرآن ایک آیت میں بیان کرگیا ہے۔ یہ کیوں شرط ہے؟ اس لیے کہ الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ [3] (27:3)۔

---

[1] کسی دوسرے کام کے رہیں ہی نہیں۔

[2] یعنی اُن لوگوں کے لیے جو (اس ضابطۂ حیات پر ایمان لانے کے بعد) نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور عالمگیر انسانیت کے لیے سامانِ نشوونما کی فراہمی کا انتظام کرتے ہیں۔اور خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل' اور مستقبل کی زندگی پر یقینِ محکم رکھتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔860)۔

[3] (وہ) نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور عالمگیر انسانیت کے لیے سامانِ نشوونما کی فراہمی کا انتظام کرتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔860)۔

## ایک آزاد اسلامی مملکت میں تمام فیصلے کتاب اللہ کے مطابق ہوں گے

عزیزانِ من! اگلی بات یہ ہے کہ وَ اٰمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (22:41) وہ ہران چیزوں کا حکم کریں گے جسے قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اوران سے روکیں گے جنہیں وہ غلط قرار دیتا ہے۔ اوراصلی بات یہ ہے کہ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (22:41) تمام امور کے آخرالامر فیصلے قرآن کے مطابق کریں گے۔ یہ ہے وہ شرط۔ آپ کے ہاں مملکت کا یہ نظام ہوگا تو اس میں اقامتِ صلوٰۃ اورایتائے زکوٰۃ ہو جائے گی ورنہ نماز پڑھنا اور خیرات دینا یہی چیز رہے گی۔ آپ نے دیکھا جو میں نے تصریفِ آیات کے ضمن میں کہا تھا کہ یہاں صرف اقامتِ صلوٰۃ اورایتائے زکوٰۃ ہے۔ دوسری بات وہاں (22:41) میں تمکن فی الارض کے ساتھ مشروط ہے اوراگر تمکن فی الارض حاصل بھی ہو جائے' مملکت بھی ملے اوراس کے اندر یہ چیز نہ آئے تو وہ جیسے دنیا میں اورلوگوں کی مملکتیں ہوتی ہیں وہ صرف مسلمانوں کی مملکت ہوگی' اسلام کی نہیں ہوگی' قرآن کی نہیں ہوگی۔ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ o اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (27:3-4)۔ کہا کہ ایمان یہ ہے کہ زندگی اسی طرح سے آگے چلنے والی ہے اور میرے ہر عمل کا ایک نتیجہ میری زندگی پر مرتب ہوتا ہے' اس کے مطابق میرا مستقبل بنتا ہے۔ اس آیت میں یہ جو بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ہے' یہ بڑی اہم شے ہے۔ میرا مستقبل میرے اپنے ہاتھوں سے مرتب ہوتا ہے۔ وہ میرے ہر عمل سے مرتب ہوتا ہے' عمل میں اور میرے عمل کے جو نتائج ہیں اُن میں کچھ نہیں ہے جو ظاہر ہو جانے والے ہیں بلکہ قرآن کہتا ہے کہ ان میں دل کا ارادہ اور نگاہ کی خیانت کے عمل بھی شامل ہیں۔ ان کے جو نتائج ہیں وہ اکٹھے ہوتے چلے جاتے ہیں اوران سے میرا جو مستقبل ہے' وہ مرتب ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ ہے ایمانِ بالآخرت۔ قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (27:4) زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ (27:4) انہیں اپنے اعمال بڑے خوشنما دکھائی دیتے ہیں جو یہ ایمان نہیں رکھتے۔ اگر یہ ایمان جذبہ محرکہ نہیں ہے اس کے لیے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں جان مار کر اپنی محنت کرتا رہوں اوراس میں سے روکھی سوکھی' کم ازکم' اپنے لیے لوں اور کم ازکم بھی کیا' وہ تو دوسرے مقام پہ کہتا ہے کہ مومن کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں۔ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (59:9) اگر دوسرا زیادہ حاجت مند ہے تو وہ اپنی ضرورت روک لیتے ہیں' اس کی ضرورت پہلے پوری کرتے ہیں۔ اوراگر یہ جسے ہم نے ایمان بالآخرت کہا ہے' یعنی زندگی کا یہ Concept (تصور) نہ ہو تو یہ کچھ نہیں ہوسکتا۔ ایمان کا یہ لفظ ہمارے ہاں (معاذ اللہ) ایسا پامال ہو گیا ہے کہ اس کے معنی کچھ نہیں سمجھ میں آتے۔ اگر زندگی کا یہ نظریہ نہ ہو تو آدمی کیوں یہ کچھ کرے۔ پھر کیا کرے گا؟ پھر نمازیں پڑھے گا' وہ پھر زکوٰۃ 2.5% بطور خیرات بانٹے گا۔ ہندو بھی تو پوجا بھگتی کرتا ہے' وہ خیرات ہم سے بھی زیادہ شکل

میں کرتا ہے۔ وہ جو صبح صبح سیر کرنے کے لیے جاتا تھا تو آٹے کی پوٹلی ہاتھ میں ہوتی تھی' جو یہ کیڑے مکوڑے نکلتے ہیں تو وہاں وہ آٹا ڈالتا چلا جاتا تھا۔ چڑیوں کے چوگے کے لیے اس نے چھجے لٹکا رکھے ہوئے تھے' بڑے بڑے نمک کے ڈلے وہ گائے بھینس کے لیے رکھ دیتا تھا' پانی کی سبیلیں لگا دیتا تھا۔ ''پن دے کم جینوں کیندے نیں''۔ ❶ جن کو آپ نیکی کے کام کہتے ہیں۔ یہ آپ کے ہاں بھی جو زکوٰۃ بحیثیت خیرات دی جاتی ہے اور یوں نماز پڑھی جاتی ہے تو یہ کیا چیز ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر وہ نظریہ زندگی نہیں ہے تو جن چیزوں کا نام آپ نیکی رکھ لیتے ہیں وہ تو **زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ** (27:4) ان کے اس قسم کے کام ہیں جو وہ اپنے ذہن میں نیکی سمجھ کر کرتے ہیں' وہ انہیں بڑے خوشنما بن کر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نماز پڑھ کر نکلنے والوں کی طرف دیکھیے' وہ بظاہر ان کا انکسار ہوتا ہے لیکن درحقیقت دل میں فخر کی کیفیت ہوتی ہے۔ انکسار میں بھی تو ایک بہت بڑا فخر ہوتا ہے۔ یہ پیروں کے ہاں جو انکسار ہوتا ہے' یہ اپنی بڑائی کے لیے ہوتا ہے۔ باہر یہی ہوتا ہے کہ صاحب! ان کا مرتبہ و مدارج دیکھیے تو قطب ہیں لیکن جا کر دیکھیے تو ایک عام آدمی کی طرح بلکہ عام سے بھی زیادہ' جوتیوں میں جا کر بیٹھتے ہیں۔

## انسان غلط عمل کو مزین شکل میں دیکھنا یا دکھانا شروع کر دیتا ہے

عزیزانِ من! عجیب چیز قرآن کہتا ہے: **زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ** (27:4) ان کے یہ اعمال بڑے خوشنما دکھائی دیتے ہیں۔ گرامر کی رو سے اس کے جو معنی ہوں گے لیکن اس کے عام معنی یہ لیے جاتے ہیں کہ ہم ان کے اعمال کو مزین کر کے دکھاتے ہیں۔ ان معانی سے وہ سارے اعتراضات ہمارے سامنے آ گئے کہ صاحب! ان کے جو غلط اعمال ہیں تو خدا کہتا ہے کہ ہم ان کو بڑا اچھا خوبصورت بنا کر دکھاتے ہیں۔ اگر وہ فریب میں آ جاتے ہیں تو پھر ان کا قصور کیا ہے یعنی اگر آپ ان کے غلط اعمال کو غلط شکل میں ہی پیش کریں تو وہ اپنی اصلاح بھی کر لیں۔ اگر آپ بچے کے غلط سوال کے اوپر Good (شاباش) لکھ دیتے ہیں اور پندرہ میں سے پندرہ مارکس دے دیتے ہیں تو وہ ساری عمر پاس نہیں ہو سکتا۔ وہ تو اسی صورت میں ہو گا کہ آپ کہیں کہ سوال غلط ہے' جاؤ صحیح کر کے لاؤ۔ اور اگر یہ معنی لیے جائیں کہ ہم ان کے غلط اعمال کو بھی بڑا اچھا کر کے ان کے سامنے پیش کرتے ہیں تو عزیزانِ من! سوچیے کہ خدا کے متعلق کیا تصور سامنے آتا ہے۔

## خدا کے ناموں میں ایک نام المضّل (گمراہ کرنے والا) بھی بتایا جاتا ہے (معاذ اللہ)

آپ حیران ہوں گے کہ یہ جو اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام بتائے جاتے ہیں' ان میں ایک نام المضل بھی ہے (معاذ اللہ) یعنی گمراہ کرنے والا۔ آدمی کہاں تک چلا جائے' کیا کیا چیز کہی جائے؟ آیئے قرآن سے پوچھیں کہ اعمال کو مزین کون کر کے دکھاتا ہے؟ **وَ زَيَّنَ**

---

❶ جنہیں نیکی کے کام کہتے ہیں۔

لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (6:43) ان کے غلط اعمال کو شیطان مزین کر کے دکھاتا ہے تو صاحب! یہاں جو کہا ہے کہ ہم کرتے ہیں تو یہ کیا بات ہوئی؟ شیطان کیا چیز ہے؟ وہ میں نے آپ کو بتایا ہوا ہے اور یہاں بھی جب کہہ دیا کہ شیطان کر کے بتاتا ہے تو چلو وہ اعتراض تو انہوں نے ہٹا دیا کہ صاحب! خدا کرتا ہے۔ پھر بھی خود تو بری الذمہ ہو گئے کہ ہم تو کچھ نہیں کرتے' وہ شیطان ہے' جو یہ سارا کچھ کرتا ہے۔ یہ بڑا دلچسپ لطیفہ ہے کہ شیطان پہ جو لعنت بھیجی تو اس نے کہا کہ کم از کم احسان کا کچھ تو بدلہ دے کہ تیری ساری عمر کے جو گناہ ہیں وہ میں اپنے سر لیتا ہوں اور تو مجھ پر لعنت بھیج رہا ہے۔ ''فٹے منہ تیرا''۔ ❶ یعنی میرا تجھ پہ کتنا بڑا احسان ہے کہ ہر گناہ جو تُو کرتا ہے' وہ میری طرف منسوب کر دیتا ہے کہ شیطان نے کرا دیا اور میں کبھی پلٹ کر نہیں کہتا کہ جھوٹ بولتے ہو اور اپنے سر کے اوپر لیے چلا جاتا ہوں۔ اس کے بعد تُو مجھ کو شیطانِ مردود بھی کہتا ہے' کم بخت کچھ تو احسان کا بدلہ دے۔ ہم نے یہ کیا کہ یا تو خدا کو ذمہ دار بنا دیا کہ وہ یہ کرتا ہے۔ وہاں سے اعتراض پڑا تو نیچے آ گئے۔ کہنے لگے کہ نہیں نہیں' شیطان کرتا ہے۔

## قرآنِ حکیم نے تو انسان کے اپنے ہی سرکش جذبات کو شیطان کہا ہے

قرآن کہتا ہے کہ کیا تمہیں پتہ ہے کہ یہ شیطان کیا ہے جو یہ کچھ کرتا ہے؟ کہا کہ وہ کوئی باہر کھڑا ہوا نہیں ہے' وہ تو تمہارے دل کے اندر بیٹھا ہوا ہے۔ قرآنِ کریم نے تنذیر کے بعد کہا کہ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ زَيَّنَ (6:43) انہوں نے اپنے دل پتھر کر لیے تو ہر چیز جو بری تھی اچھی نظر آنے لگ گئی۔ جب اپنے دلوں کی یہ کیفیت بنا لی جائے تو اس کو شیطان کہا جاتا ہے۔ یہ تو انسان کے اپنے قلب کی ایک تبدیلی ہے جس کا نام آپ ملائکہ یا شیطان رکھ دیتے ہیں۔ اب رہا یہ کہ خدا اپنی طرف کیوں منسوب کرتا ہے؟ وہ اسی طرح سے منسوب کرتا ہے کہ دیکھو' کھیتیوں کی طرف دیکھو کہ کس طرح سے فصل (Crop) پنپتی ہے' پھر ہم اس میں کیسے پھل لگا دیتے ہیں حالانکہ وہ تو ساری کسان کرتا ہے' پرورش کے لیے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ پھل کس کھیتی میں لگتا ہے؟ اس میں جو اس کے قانون کے مطابق کھیتی کی جائے۔

## ہر وہ چیز جو خدا خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے اس سے مراد قانونِ الٰہی ہوتا ہے

جہاں بھی قرآن میں خدا نے اپنی طرف کسی چیز کو منسوب کیا ہے کہ ''ہم کرتے ہیں'' تو اس کا ترجمہ یہ کرو کہ ''خدا کے قانون کے مطابق ایسا ہوتا ہے'' مثلاً جیسا کہ عام زبان میں کہتے ہیں کہ جو سنکھیا کھاتا ہے اسے ہم مار دیتے ہیں۔ اس سے بات سمجھ میں آ گئی کہ چونکہ سنکھیے کے اندر یہ خاصیت ہم نے رکھی تھی کہ جو اسے کھائے گا ہلاک ہو جائے گا' جو اس سے بچتا ہے ہم اُسے زندگی دے دیتے ہیں۔ اب یہ جو چیز ہے کہ پھر غلط اعمال ان کی نگاہوں میں بڑے خوشنما ہو جاتے ہیں' تو اس کا نتیجہ یہ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ❷ (27:4) ہے۔ عربی

---

❶ تف' لعنت تجھ پر' بُرا ہو تیرا۔

❷ وہ اِسی خود فریبی میں بھٹکتے رہتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔860)۔

زبان میں دو الفاظ ''ع م ی'' اور ''ع م ہ'' ہوتے ہیں وہ لفظ جو ''ی'' کے ساتھ ہے یعنی ''ع م ی'' اس کے تو معنی ہوتے ہیں ''اندھا ہوجانا''۔ یہ جو ''ہ'' والا ہے یعنی ''ع م ہ'' ہے اس کے معنی ہوتا ہے کہ ''اس طرح سے سرکش پھرنا' اس طرح سے سرگرداں پھرنا' اس طرح سے حیرت میں پھرنا' کہ کوئی بات سمجھ میں نہ آئے'' یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ہر چیز ضائع ہوتی چلی جارہی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کچھ کیوں ہوتا ہے؟

## قرآنِ حکیم کے نزدیک نفع ونقصان کا معیار

قرآن کہتا ہے کہ **اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَھُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ ھُمُ الْاَخْسَرُوْنَ** ❶ (27:5)۔ کسی نے کام کیا' کاروبار کیا۔ ٹھیک ہے' اس میں اس کو پچاس فیصد نفع ہونا تھا۔ اس میں دس فیصد نقصان ہوگیا لیکن کچھ تو ملا۔ دس فیصد نقصان ہوا' اپنی پونجی میں سے نوے تو بچ گئے۔ اس کو بھی نقصان کہیں گے۔ قرآنِ حکیم تو یہاں اخسرون کہتا ہے کہ باقی ہی کچھ نہ بچے۔ قرآن میں متعدد مقامات میں یہ آیا ہے۔ مثلاً کہا کہ **قُلْ ھَلْ نُنَبِّئُکُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا** (18:103) آؤ تمہیں بتائیں کہ سب سے زیادہ نقصان کن کا ہوتا ہے' وہ کون لوگ ہیں' جن کے کاروبار میں گھاٹا پڑتا ہے' وہ کون ہیں جن کی پوری کی پوری رقم ڈوب جاتی ہے' وہ کون ہیں جو اپنی سعی وعمل میں سخت نقصان میں رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کے نزدیک نفع ونقصان کا ایک معیار (Measure) ہے۔

## ہمارے ہاں نیک عملی کا معیار

پہلی چیز تو یہ ہے کہ **اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ ھُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا** ❷ (18:104)۔ زندگی کا وہ نظریہ ان کے جو آگے جانے کا ہے' سامنے ہوتا نہیں' سمجھتے ہیں کہ صرف اسی دنیا کی زندگی ہے اور اس میں جو کچھ بھی وہ اپنی صنعت کاری سے' مصنوعی طور پر' بناتے رہتے ہیں' اُس سے سمجھتے ہیں کہ بڑا اچھا کام کررہے ہیں' میکانکی طور پر ہر کام ہورہا ہے۔ آپ دیکھ لیجیے گا کہ یہ جو ساری نمازیں ہیں' سارے روزے رکھے جارہے ہیں' کیا قلب کے اوپر ان کا کوئی اثر پڑتا ہے' کیا

---

❶ یہ وہ لوگ ہیں جن کی غلط روشِ زندگی' ان کے لیے بڑی تباہی کا موجب ہوتی ہے (انہیں اس دنیا کے مفاد تو ضرور حاصل ہوجاتے ہیں' لیکن) ان کا مستقبل برباد ہوجاتا ہے۔ اس طرح وہ' آخرالامر' سخت نقصان میں رہتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 860 تا 661)۔

❷ یہ وہ لوگ ہیں جن کی ساری کوششیں طبعی زندگی کی مفاد کوشیوں میں ضائع ہوجاتی ہیں (اس لیے کہ وہ' اس زندگی کے ماوراء کسی اور زندگی کے قائل ہی نہیں)۔ اور وہ بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ اپنی کاریگری سے بنا رہے ہیں' وہ بہت اچھا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 683)۔

کردار میں کوئی تبدیلی آتی ہے؟ میں نے کسی ایک جگہ لکھا تھا [1] جب یہ پوچھا گیا کہ کیا صاحب! تیری نماز ہوگئی تو یہ جو مولوی صاحب ہیں' کہتے ہیں کہ تیری نماز نہیں ہوئی۔ ہمارے ایک دوست بیٹھے ہیں' جنہیں نماز پڑھتے ہی روک دیا گیا تھا کہ تیری نماز نہیں ہوئی۔ ہوا یہ تھا کہ ان کی پتلوں ٹخنوں سے ذرا نیچے تھی تو اسے موڑ کر نیکر بنا دیا تھا۔ پھر کہنے لگے کہ تیری نماز نہیں ہوئی' دوسروں کی ہوگئی ہے' تیری پتلون سے نہ ہوئی' نیکر سے ہوگئی ہے۔ سچ کہا تھا قرآنِ حکیم نے کہ **هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا** (18:104) میکانکی طور پر کچھ کرتے ہیں اور بہت خوش ہوتے ہیں کہ کتنا اچھا کام ہو رہا ہے۔ **اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآئِهٖ** [2] (18:105) درحقیقت یہ وہ لوگ ہیں جن کا قوانینِ خداوندی پہ بھی ایمان نہیں ہوتا اور نہ آخرت پہ ایمان ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ **فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ** (18:105) ان کی تمام تگ وتاز رائگاں چلی جاتی ہے۔ یہ وہ لوگ نہیں ہیں جنہوں نے کچھ نہیں کیا' یہ وہ نہیں ہیں جنہوں نے نماز نہیں پڑھی ہے' زکوٰۃ نہیں دی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال انہیں مزیّن بن کر دکھائی دیتے تھے' وہ سارے کے سارے رائیگاں چلے جاتے ہیں' بے نتیجہ رہ جاتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ حبطت اس لیے ہوتے تھے کہ ان کے ہاں مویشیوں کو ایک بیماری ہوتی ہے جس میں ان کا پیٹ تو بڑا پھولا ہوا سا نظر آتا ہے جیسے بہت فربہ ہوں لیکن درحقیقت ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ کھاتے ہیں' وہ ان کے جسم کو لگتا ہی نہیں ہے' وہ Undigested (غیر ہضم) رہتا ہے' اسی طرح سے ہی نکل جاتا ہے اور وہ کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں' بظاہر نظر آتا ہے کہ بہت ہی فربہ ہو رہے ہیں۔ یہ ہوتا ہے حبطت اعمالھم۔ یہ اپنی دانست میں سمجھ رہے ہیں کہ پہلوان بنتے جا رہے ہیں۔ ان کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ بیماری ہوتی ہے' یہ اس کا پھیلاؤ ہے اور حبطت اعمالھم یہ ہے کہ اس طرح سے وہ سب تگ وتاز رائگاں چلی جاتی ہے۔

## مکافاتِ عمل کا ترازو ذرّے ذرّے کو تول دے گا

اگلی چیز قرآن نے یہ کہی ہے کہ مکافاتِ عمل کی رو سے شر کا ایک ایک ذرہ تولا جائے گا' اسی طرح خیر کا ایک ایک ذرہ تولا جائے گا۔ یہ میزان اس نے رکھی ہے۔ اور اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ پلڑا کونسا جھکتا ہے۔ کہا کہ یہ لوگ جو ہر چیز اس طرح میکانکی طور پر کرتے ہیں **فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا** (18:105) ان کے لیے تو ترازو کھڑا کرنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ آپ نے غور

---

[1] ''قرآنی فیصلے'' میں

[2] یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین زندگی سے انکار کرتے اور سرکشی برتتے ہیں اور اس کا یقین ہی نہیں رکھتے کہ انہیں اُس کے قانونِ مکافات کا سامنا کرنا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔683)۔

فرمایا کہ Complusory Subjects (لازمی مضامین) میں فیل ہونے والے طالب علم کے Optional Papers (اختیاری مضامین) دیکھے ہی نہیں جاتے' ان کا فائدہ ہی کچھ نہیں ہوتا۔ Optional Subjects (اختیاری مضامین) کے نمبر تو اس صورت میں بڑھائے جاتے ہیں جب وہ Compulsory (لازمی) مضامین میں پاس ہوا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ میزان کاہے کے لیے کھڑی کی جائے گی؟

## عقلِ انسانی اور وحی کا بنیادی فرق

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اب اس طرف آؤ جہاں سے اس سورۃ میں بات شروع کی تھی: **تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ** [1] (27:1)۔ یہ کچھ اس کتاب کے متعلق کہا' پھر پوچھا کہ کیا تمہیں پتہ ہے کہ اس کتاب کی بنیادی خصوصیت کیا ہے؟ یہی ہے وہ خصوصیت' عزیزانِ من! جو مخصوص ہے۔ عام انسان خواہ کتنا بڑا مفکر ہی کیوں نہ ہو' وہ عام علمِ انسانی بالحواس حاصل کرتا ہے۔ محنت کوشش' مطالعہ' مشاہدہ اور تجربہ سے ہر شخص عام علم حاصل کرتا ہے مگر یہ ایک ایسا علم تھا جس میں انسان کی اپنی فکر' اپنی نظر' اپنے مشاہدے' اور اپنے تجربے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ علم خدا کی طرف سے ملنے والا علم ہے جسے وحی کہا جاتا ہے۔ اسی کے متعلق کہا کہ **وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ** [2] (27:6)۔ یہ قرآن تیری اپنی فکر کی پیدا کردہ کتاب نہیں ہے۔ **مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى** (53:3) یہ رسول اپنے خیالات اور اپنے جذبات سے باتیں نہیں کرتا۔ **اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى** (53:4) یہ تو صرف وحی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے۔ یہ ایک انفرادی چیز ہے۔ وحی کے متعلق یہ چیز منفرد ہے۔ یہ چیز عام علمِ انسانی سے بالکل الگ ہے۔ کہا کہ **اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ** (27:6) قرآن تجھے القا کیا جاتا ہے' تجھے دیا جاتا ہے' یہ تجھے خدا کی طرف سے براہِ راست ملتا ہے جو حکیم بھی ہے' علیم بھی ہے۔ تو گویا یہ فکرِ انسانی کی کاوش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ وحی کا یہ علم نبیوں کے لیے مختص تھا۔ ذاتِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہوگئی اور وحی کا یہ طریقہ علم ذریعہ علم اس کے بعد ختم ہو گیا۔

---

[1] یہ قوانین جو تمہارے سامنے آ رہے ہیں' قرآنِ کریم' یعنی ایک واضح کتاب' کے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص860)۔

[2] (نوعِ انسانی کو نقصان اور تباہی سے بچانے کے لیے) تجھے اسے رسول! یہ قرآن دیا گیا ہے۔ یہ اُس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جو تمام کائنات کو اپنی حکمت کے مطابق صحیح راستے پر چلا رہا ہے اور ہر شے کے مقتضیات سے واقف ہے۔ (اُسے معلوم ہے کہ کس شے نے صحیح نشوونما پا کر کیا بننا ہے اور اسے وہ بننے کے لیے کیا کچھ درکار ہے)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص861)۔

## ختم نبوت کا دعویٰ ماننے والوں کی اپنی حالت: علم لدنی کا خلافِ قرآن عقیدہ

ختمِ نبوت پر ایمان کی کتنی اہمیت ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ اس پر کتنا Agitation (ہنگامہ) ہوتا ہے! جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اسے اور اس کے ماننے والوں کو اس نے کہا ہے کہ یہ اسلام کے دائرے سے خارج ہیں' یہ کافر ہیں لیکن خود اپنی حالت کیا ہے؟ یہ جتنے بڑے بڑے صوفیائے کرام اور اولیائے عظام ہیں' ان کا دعویٰ ہے اور ان کے اس دعوے کو امت تسلیم کرتی چلی آ رہی ہے کہ انہوں نے خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل کیا ہوا ہے۔ فرق کیا ہوا؟ کہ جی وہ کشف یا الہام ہوتا ہے۔ یعنی اس کا جو جی میں آئے نام رکھو' بات تو وہی ہوئی کہ ان کی اپنی کاوش کا' محنت کا' فکر کا' کوئی دخل نہیں ہے' یہ خدا کی طرف سے براہِ راست ملتا ہے۔ یہ بات تو وہی ہوگئی جو اس نے وحی کے متعلق کہی تھی۔ یہ سب اس بات کے مدعی ہیں کہ انہیں خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملتا ہے۔ اور اس کے باوجود ختمِ نبوت کے بھی دعاوی ہیں [1]۔ اب یہاں ایک بڑی دلچسپ بات آتی ہے۔ یہاں قرآن نے کہا تھا کہ **مِنۡ لَّدُنۡ حَكِيۡمٍ عَلِيۡمٍ** (27:6)۔ عربی زبان میں یہ جو ''لدن'' ہے اس کے معنی ہوتے ہیں ''اس کی طرف سے''۔ یہ جو ان کے ہاں کا علم ہے آپ کو پتہ ہے اسے علمِ لدنی کہتے ہیں۔ اس لدن سے لدنی بنا دیا۔ اس قوم کی حد ہوئی ہے۔ یہ مذاق نہیں تو اور کیا ہے۔ یعنی وہ عربی زبان کا لَـدُن ایک لفظ' **مِنۡ لَّدُنۡ حَكِيۡمٍ عَلِيۡمٍ** (27:6) میں ہے۔ خدائے حکیم وعلیم کی طرف سے تجھے قرآن ملتا ہے: من لدن۔ یہ جو سارا علم ان کو ملتا ہے' تو اسے یہ باطنی علمِ کہتے ہیں اور اس کا نام **علمِ لدنی** رکھا ہوا ہے۔ او بھئی! کیا اس کی کوئی سند ہے؟ کہنے لگے کہ جی' قرآن نے **مِنۡ لَّدُنۡ** (27:6) کہا ہے۔ سُنیے' عزیزانِ من! یہ صرف قرآن تھا' وحی تھی' جس کے متعلق قرآن میں آیا کہ خدا نے یہ براہِ راست رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا' اس کے علاوہ سارے قرآن میں کہیں کوئی اشارہ تک نہیں ہے کہ نبی کے سوا کسی اور کو بھی یہ چیز اس طرح خدا کی طرف سے مل سکتی ہے۔

## بنی اسرائیل کی تاریخ اور ہماری اپنی سرگزشت میں باہمی مماثلت غور وفکر کی متقاضی ہے

قرآن کریم میں کشف اور الہام تک کے نام بھی اِن معنوں میں نہیں آئے ہیں جن میں یہ لیتے ہیں۔ وہاں اس کی سند نہیں ملی تو علمِ لدنی بنا دیا۔ یہ Typical (تمثیلی) وارث شاہ کی بات نظر آتی ہے۔ اور اس کے بعد قرآنِ کریم میں وہی' جو میں نے کہا تھا کہ انبیائے کرامؑ کے تذکارِ جلیلہ آ رہے تھے تو اُن میں اگلی کڑی انبیائے بنی اسرائیل کی آ رہی ہے اور اس کی ابتدا حضرتِ موسیٰؑ سے ہو رہی ہے۔ حضرتِ موسیٰؑ

---

[1] اس کی مزید تشریح کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس القرفان سورۃ النور' ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور' 2007' ص ص 145 تا 165 اور 172 تا 186 (چھٹا اور ساتواں باب معہ فٹ نوٹ)۔

اور بنی اسرائیل کے واقعات' جو قرآن میں ہیں' سب سے زیادہ کثرت سے بیان ہوئے ہیں اور اب بات ہماری سمجھ میں آتی ہے کہ اس کثرت سے وہ کیوں بیان ہوئے ہیں؟ کہ بنی اسرائیل کی جتنی سرگزشت ہے اس میں قدم بقدم ہم چلے جا رہے ہیں۔ بنی اسرائیل کی سرگزشت کا کوئی واقعہ قرآن سے اٹھایئے اور آپ دیکھیے کہ آپ کی تاریخ میں بالکل اس قسم کا وہ واقعہ مل جائے گا۔ پہلی کیفیت یہ ہے کہ فرعون کی محکومی اور غلامی کے اندر پسے ہوئے ہیں۔ وہی کیفیت ہماری ہے۔ خدا کی موہبت سے ایک اتنی عظیم مملکت ملی۔ قرآن نے یہ کہا کہ جنہیں اس قدر ذلیل اور اس قدر کمزور تصور کیا جاتا تھا' ہم نے ان پہ احسان کیا۔ ذرا دیکھیں تو سہی ہم نے ان کا یہ اعتراض مٹا دیا کہ اگر ہمیں مملکت مل جاتی تو ہم بتاتے کہ کیسے نظامِ خداوندی اس کے اندر قائم ہوتا ہے۔ ہم نے کہا کہ بہت اچھا' یہ مملکت ہم دیتے ہیں۔ یہ بھی مل گئی۔ انہیں بھی اسی طرح سے ملی تھی۔ اس مملکت کے ساتھ انہوں نے جو کچھ کیا' قرآن وہ بتا رہا ہے۔ یہ لفظاً لفظاً وہی کچھ ہے جو ہم کر رہے ہیں اور اس کے بعد ان کی کیفیت بھی یہ بتائی ہے کہ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (2:61)۔ دنیا میں ذلیل ترین قوم' دنیا میں مسکین ترین قوم' دنیا میں جہاں جائیں دھتکارے جائیں۔ لوگ محتاجی کی زندگی بسر کر رہے ہیں' کھڑے ہوئے سہارے ڈھونڈتے رہیں' ان پر ذلت و خواری کا عذاب خداوندی مستولی ہے۔ یہ قرآن نے بنی اسرائیل کے متعلق کہا ہے۔ بس فرق صرف یہ تھا کہ ان کے پاس ان کے پیغمبر کی اصلی کتاب موجود نہیں رہی تھی' اس لیے ان کے لیے دوبارہ اس راستے پہ چلنے کے لیے کوئی شکل باقی نہیں تھی' کتاب ہی نہیں تھی۔ ہمارے لیے یہ ایک چیز ہے کہ خدا کی وہ کتاب اپنی اصل شکل میں ہمارے ہاں موجود ہے۔ جب بھی قوم چاہے کہ ہم پھر وہی اپنی چھنی ہوئی عظمتیں' لٹی ہوئی دولتیں' حاصل کر لیں تو قرآن میں قیامت تک کے لیے یہ صلاحیت ہے کہ جب بھی اس کو آپ راہنما بنائیں گے آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا۔ سازش یہ ہے کہ یہ قوم قرآن کو راہنما نہ بنا سکے۔ یہ ہے جو اس قوم کے ساتھ ہو رہا ہے۔ قرآن موجود ہے مگر اس کی جو موجودگی ہے وہ کیا فائدہ دے سکتی ہے۔

## قرآنِ حکیم کے ساتھ مسلمانوں کا باہمی تعلق اور باہمی زندگی

تقسیم پاک و ہند (1947ء) سے قبل اسی لاہور میں جو قرآنِ کریم کے ناشر تھے' ان میں یہ مسلمان کتب فروش زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ آپ کو سن سنگھ جسونت سنگھ کے یہ نام یاد ہونگے' یہاں ان کی دوکان ہوتی تھی۔ سب سے زیادہ قرآن وہ اشاعت کرتے تھے' فروخت کرتے تھے' گوداموں کے گودام بھرے ہوئے ہوتے تھے۔ نہ سن سنگھ مسلمان ہوا تو نہ جسونت سنگھ مسلمان ہو! ''ساڈا وی ایہوای حال اے''[1] کوئی گھر ایسا نہیں ہے جہاں قرآنِ کریم اگر دو چار نہیں ہیں تو بہر حال ایک تو ضرور ہے۔ اور اگر اپنا خریدا ہوا نہیں ہے تو بہوؤیں آتی ہیں' وہ

---

[1] ہماری بھی یہی حالت ہے۔

ساتھ لے کر آتی ہیں ''گھر اچ سب توں اُچی تھاں جتھے ہتھ وی نہ پہنچے' او تھے قرآن رکھیا ہوندا اے کہ پئی ہتھ نہ کوئی لائے''[1] مقدس کتاب ہوتی ہے' ''دل کہے تو اوہنوں تول کے تے دانے اوہدے وزن دے برابر ونڈ دیندے نیں۔''[2] قرآن اس طرح سے گھروں کے اندر' مسجدوں کے اندر' دفتروں کے اندر موجود ہیں لیکن اس سے راہنمائی حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ اس سے ثواب حاصل کرنا ہے۔ آج کل رمضان شریف میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہر مسجد کے اندر مہینے میں ایک دفعہ تو یوں ختم ہوتا ہے اور پھر ایک رات میں شبینہ ختم ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی مسجدوں میں کتنی ہی جماعتیں ایک وقت میں شبینہ کی کھڑی ہوتی ہیں۔ اس کتاب کو اتنا دہرایا جاتا ہے کہ دنیا میں کسی اور کتاب کو اتنا نہیں دہرایا جاتا۔ اور دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں جس کو آپ نہ سمجھیں مگر پڑھتے جائیں۔ زبان کا سمجھنا تو ایک طرف اگر اس کتاب کا اسٹینڈرڈ (معیار) زرا اونچا ہے تو آپ ایک آدھ صفحہ پڑھ کر کہہ دیتے ہیں کہ نہیں بھئی! اس کا اسٹینڈرڈ (معیار) بہت اونچا ہے' میری انگریزی اتنی زیادہ نہیں ہے میں نہیں پڑھ سکتا لیکن یہ خصوصیت آپ نے اس کتاب کے ساتھ رکھی ہوئی ہے کہ اس کی عربی زبان کا ایک لفظ نہیں جانتے اور پڑھتے چلے جاتے ہیں اور ساری عمر پڑھتے چلے جاتے ہیں' سنتے چلے جاتے ہیں۔ نہ اُس سنانے والے کو پتہ ہے کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں' نہ سننے والے کو پتہ ہے کہ کیا سن رہا ہوں۔ دونوں مطمئن ہوتے ہیں۔ **زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ** (27:4) ان کے اعمال کو مزین بنا دیتا ہے۔ یہ مشقت نہیں ہے' تو کیا ہے؟ یہ سارا دن روزہ سولہ سولہ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کی محنت' اس کے بعد افطاری' اس افطاری کے بعد ستانے کو جی چاہتا ہے' تو ادھر سے عشاء کی اذان ہو جاتی ہے۔ بیس رکعت' اس کے اندر یہ قرآن کا سوا سپارہ گیارہ بارہ بجے تک پڑھتے ہیں' دو تین بجے پھر اٹھنا ہوتا ہے۔ بڑی مشقت کرتے ہیں: **فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ** (18:105)۔ اور اعمال ایسے!!! عزیزانِ من! اگر کوئی قوم بھی قرآن کو راہنما کر کے اس پر عمل کرے تو آج دنیا کا تختہ الٹ کر رکھ دے۔

## داستانِ بنی اسرائیل کو وضاحت سے بیان کرنے کا مقصد

قرآن کہتا ہے کہ **فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ** (18:105) ان کے اعمال رائیگاں گئے اور اس پر طُرفہ تماشا یہ کہ بے نتیجہ اعمال مزین نظر آتے ہیں۔ میں نے کہا کہ حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم بنی اسرائیل کے واقعات اس لیے زیادہ تکرار و اصرار سے دہرائے گے ہیں کہ جو ہم پہ گزرنے والی تھی تو خدائے علیم کو یہ پتہ تھا کہ یہ انہی منازل میں سے گزریں گے۔ حضرتِ موسیٰؑ کے جو احوال ہیں وہ متعدد مقامات پہ ہمارے سامنے آ چکے ہوئے ہیں۔ اس لیے اب جو سامنے آئیں گے تو میں ان کی زیادہ وضاحت ضروری نہیں سمجھوں گا کیونکہ ابھی ابھی

---

[1] گھر میں سب سے اونچی جگہ پر جہاں ہاتھ نہ پہنچ سکے' قرآن کریم رکھا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اسے کوئی ہاتھ نہ لگائے۔

[2] دل چاہے تو اسے تول کر' اس کے وزن کے برابر دانے بانٹ دیتے ہیں۔

تو ہم نے سورۃ الشعراء میں یہ مطالعہ کیے اور اس سے پہلے بھی یہ سارے مقامات گزر چکے ہیں [1]۔ بات قرآن نے وہاں سے شروع کی ہے کہ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِاَھْلِہٖٓ اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا (27:7)۔تجدید یادداشت کے لیے میں عرض کروں گا کہ حضرت موسیٰؑ مصر میں پیدا ہوئے‘ فرعون کے محلوں میں پرورش پائی‘ وہاں سے یہ ’’بھاگے‘‘ مدین میں آ کر بھیڑ بکریاں چرائیں اور وہیں شادی کی۔اب یہ بات وہاں سے شروع کر رہے ہیں۔ یہاں اھلہ آیا ہے۔اہل کے معنی صرف بیوی ہی نہیں ہو سکتی بلکہ ساتھی بھی ہو سکتے ہیں۔قرآن نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کون کون سے ساتھی تھے۔اہل کہا ہے‘ جب بھی کہا ہے اور نظر یہ آتا ہے کہ وہ وادی تھی‘ اندھیری رات تھی اور سردی بھی تھی‘ کچھ زیادہ سامان پاس نہیں تھا۔ وہاں اپنے اہل سے کہا کہ میں دور سے دیکھ رہا ہوں کہ وہاں طور پہاڑ کی چوٹی پر مجھے کچھ آگ سی نظر آ رہی ہے۔ میں جاتا ہوں۔اب دیکھیے یہاں کیسی عمدہ آیت ہے! اسے آیت کہتے ہیں‘ مثلاً آگ نظر آئے تو نظر آتا ہے کہ وہاں کوئی انسان ضرور ہوگا۔اس وقت وہاں قریب نہ ہو تو بہر حال وہ انسان کی موجودگی ہوگی کیونکہ آگ انسان ہی لگا سکتا ہے۔ یہ تو ہماری بچت ہے کہ ہم بچ گئے ہوئے ہیں کیونکہ یہ جو حیوان ہیں‘ آگ نہیں لگا سکتے۔ یہ جو چیز ہے کہ اگر کسی صحرا میں کوئی کوا یا کبوتر اڑتا ہوا نظر آئے تو ذہن میں ہوتا ہے کہ کہیں پانی ضرور ہے۔اسی طرح اگر کہیں دھواں نظر آئے تو یہ ہوگا کہ کہیں آگ ضرور ہے۔آگ نظر آئے تو یہ ہوگا کہ آدمی ضرور ہے۔عربی زبان میں اسے آیت کہتے تھے۔قرآن نے جوان چیزوں کو آیت کہا ہے تو وہ کہا یہ ہے کہ یہ مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ اس سے تمہیں پتہ چل جائے گا کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ دیکھا کہ لفظ آیت کیا معنی رکھتا ہے۔انہوں نے کہا کہ میں جاتا ہوں‘ وہاں مجھے کوئی آدمی مل جائے گا۔اس سے کچھ اس مقام کا پتہ نشان کی خبر لاؤں گا کہ سَاٰتِیْکُمْ مِّنْھَا بِخَبَرٍ (27:7) بھئی! راستہ بھول گئے ہیں‘ کہاں جائیں۔ اَوْ اٰتِیْکُمْ بِشِھَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّکُمْ تَصْطَلُوْنَ (27:7) یا وہاں سے میں کچھ آگ کا انگارہ لاؤں اور یہاں جھاڑیاں وغیرہ اکٹھی کر کے ان کو جلائیں تاکہ تم اس آگ کو تاپو۔وہ یوں وہاں گئے۔

## وحی کی کنہ وحقیقت کو غیر از نبی سمجھ ہی نہیں سکتا

قرآن کہتا ہے کہ فَلَمَّا جَآءَھَا نُوْدِیَ اَنْ بُوْرِکَ مَنْ فِی النَّارِ وَمَنْ حَوْلَھَا (27:8)۔جب موسیٰؑ آگ کے قریب پہنچا تو وہاں اسے ایک آواز آئی۔ میں نے کہا ہے کہ یہ جو ماجریاتِ نبوت ہیں‘ وحی کی کیفیات ہیں‘ اس کی کنہ وحقیقت کو غیرِ نبی قطعاً نہیں سمجھ سکتا کہ کیسے یہ آواز آتی تھی‘ کیسے وحی ملتی تھی؟ قرآن نے اسے کلام اللہ کہا ہے۔ہم تو کلام اس کو کہتے ہیں جو الفاظ کے ذریعے

---

[1] اس کی مفصل وضاحت کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ طٰہٰ مکمل‘ ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)‘ لاہور‘2005‘ بالخصوص دوسرا تا دسواں باب مع انہی ابواب کے فٹ نوٹ۔

یوں زبان سے بولا جائے' کان سے سنا جائے لیکن نہ وہ اس طرح کی آواز ہوتی تھی' نہ اس طرح سے وہ کانوں میں آتی تھی۔ وہ تو ایک الگ کیفیت تھی جسے ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اس لیے قرآن کے یہ جو الفاظ ہیں تو یہ سمجھ لیجیے کہ قرآن نے ہمیں سمجھانے کے لیے مجازاً یہ استعمال کیے ہیں حقیقتاً یہ مراد نہیں ہے کہ واقعی ایک آواز آئی اور اس کے کان میں آئی اور اُس نے اسے سنا۔ یہ وحی تھی' یہ کلام خداوندی تھا جو میرے آپ کے انسانوں کے کلام کی طرح کلام نہیں ہوتا۔ آواز آئی کہ یہ مقام' یہ جگہ' جہاں یہ حال دیکھ رہے ہو' یہ طور کی چوٹی اور اس کا گردونواح ہے' یہ بہت بابرکت ہے۔

## طور کی چوٹی اور گردونواح کے بابرکت ہونے کی وجہ جواز

اب ہمارے ہاں یہاں سے یہ چلا کہ جی! اس کو مقدس بیان کیا ہے اور گردونواح کو بھی مبارک بیان کیا ہے۔ اس سے وہ جو ساری زمین تھی وہ مقدس ہوگئی۔ زمین کے مقدس اور نامقدس ہونے کا سوال نہیں ہے' عزیزانِ من! وہ جو قومِ بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں مستقبل آنے والا تھا وہ فلسطین کی زمین تھی' یہ وہاں تھے' اور وہیں یہ پہاڑ طور تھا۔ بتایا یہ ہے کہ تمہارے لیے اور تمہاری اس قوم کے لیے' جو اس قدر محکومی محتاجی ذلت و مسکنت کی زندگی بسر کرتی ہے اس سرزمین کے اندر بڑی برکات پوشیدہ ہیں۔ یہ تمہاری قوم کو ملے گی۔ یہ ہے وہ چیز جو شروع میں ہی اسے کہی گئی کہ یہ وہ مقام ہے۔ یہاں سے جو بات ہم شروع کر رہے ہیں' جب اس پروگرام کے مطابق تم عمل پیرا ہو گے تو تم اس کے بعد دیکھو گے کہ تمہاری قوم وہاں سے نکل کر یہاں آئے گی اور اس سرزمین میں ہر قسم کی برکات اس کو ملیں گی۔ قرآن نے متعدد مقامات میں فلسطین اور اس کے گردونواح کی جو زمین ہے' اس کو بابرکت کہا ہے اور برکت ہمارے ہاں تو ایک Abstract (غیر محسوس) سی چیز ہے کہ ''پتہ نہیں کہ برکت ہوندی کی اے؟ روٹی بسم اللہ پڑھ کے کھاؤ تو بڑی برکت ہوندی اے' او ہوندی کی اے؟ کسے نوں پتہ نئیں۔'' ❶

''برکت'' یہ ہوتی ہے کہ یہ ''جو برسات میں اتنی زیادہ گھنی سبزی ہو کہ وہ سیاہی مائل ہو جائے یا جو افراط سے پیدا ہونے والی چیزیں ہوں''۔ یہ ہوتی ہے جسے برکت کہتے ہیں۔ یہ تولنے ماپنے کی چیز ہے' دیکھنے کی چیز ہے کہ ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ ''بسم اللہ دی پڑھو تے روٹیاں تے پنج دیاں پنج ای رہندیاں نیں''۔ ❷ اور بسم اللہ سے واقعی برکت ہوتی ہے لیکن یہ معلوم تو ہو کہ بسم اللہ ہے کیا؟ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ❸۔ خدا کی صفتِ رحیمیت اور رحمانیت کو عام کرنے کے لیے میں اس کام کو شروع کر رہا ہوں۔ اس کام کے شروع کرنے کا مقصد

---

❶ معلوم نہیں کہ برکت ہوتی کیا ہے؟ بس یہ کہ کھانا بسم اللہ پڑھ کر کھاؤ تو بڑی برکت ہوتی ہے۔ یہ ہوتی کیا ہے؟ اس کا کسی کو علم نہیں۔

❷ بسم اللہ بھی پڑھو' تو بھی چپاتیاں تو پانچ کی پانچ ہی رہتی ہیں۔

❸ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الفاتحۃ' ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور' 2007ء' بالخصوص ص ص۔ 73 تا 76 اور انہی صفحات کے فٹ نوٹ۔

یہ ہے' میرا اپنا مقصد نہیں ہے۔ خدا کی صفتِ رحمانیت ورحیمیت جو ہے اس کو عام کرنے کے لیے میں یہ کام کر رہا ہوں۔ اور جس کام کا مقصد آپ دل میں یہ لے کر شروع کریں تو آپ سوچیے کہ اس میں واقعی کتنی برکت ہوتی ہے۔ کہا کہ یہ برکت ہے۔ ذہن میں یہ آیا کہ اچھا' یہ اتنا سا خطہ زمین ہے' اس کو کہا ہے کہ یہ برکت والا خطہ زمین ہے۔ کہا ہے کہ یہ نہ سمجھ لینا۔ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (27:8) اس تصور سے خدا بہت اونچا ہے کہ اس کی برکات دنیا کے کسی خاص خطے کے اندر ہی محدود اور محصور ہو جائیں۔ وہ تو رب العالمین ہے' وہ تو کائنات کا رب ہے۔ یہ تو تمہاری نسبت سے (With Reference to you) یہ بات کہی گئی ہے کہ اس سر زمین میں برکت ہے ورنہ وہ تو رب العالمین ہے' اس کی جو برکات ہیں وہ محدود و محصور نہیں ہیں۔ يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ❶ (27:9)۔ یہ آواز ہے۔ اس میں ایک لفظ ہے ''انا''۔ عربی زبان میں ایک ''انی'' آتا ہے اور ایک ''انا'' بھی آتا ہے۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جہاں محبت اور پیار کے ساتھ کہنا ہو تو وہاں عام طور پر ''اِنِّیْ'' کہتے ہیں اور جہاں جلال و جبروت ہوتا ہے تو وہاں لفظ ''انا'' ہوتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ ہم ''الٰہ'' ہیں۔ یہ کیوں کہا ہے؟ اس لیے کہ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (27:9) ہم غلبے اور قوت اور اقتدار کے مالک ہیں۔ عدالت سے پتہ نہیں کہ اب بھی وہ اس قسم کے جملے شائع ہوتے ہیں یا نہیں جن میں یہ لکھا ہوتا تھا کہ یہ ہمارے دستخط اور ہماری عدالت سے جاری ہوا۔ جس میں اقتدار ہوتا ہے تو وہاں ''انا'' کا صیغہ آتا ہے۔ یعنی ہم عزیز ہیں' بڑے غلبے کے مالک ہیں۔ اور یہ بھی کہ یہ غلبہ فرعون کا غلبہ نہیں ہے' یہ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (27:9) ہے۔ Reason (عقل و استدلال) پہ مبنی ہے' حکمت پر مبنی ہے لیکن بہر حال ہم خدا ہیں۔

## کسی شخصیت کا نبوت کی نعمت سے سرفراز ہونا اتفاقیہ نہیں ہوتا

اور وہ بات جو میں دو لفظوں میں پھر کہہ دوں کہ وہ جو حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے' میں جاؤں اور وہاں سے دیکھوں۔ اب ہمارے ہاں تو یہ پرانا شعر مشہور ہے کہ ''خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال۔ کہ آگ لینے کو جائیں پیغمبری مل جائے''۔ یعنی اتفاقیہ وہ حضرتِ موسیٰؑ چلے گئے اور ان کو پیغمبری دے دی ''کوئی چلا جانداا ونوں دیندے۔ اوتے لے کے کھلوتا ہیگا سی کہ کوئی آئے''۔ ❷ وہ جو کہتے ہیں کہ بادشاہ مر گیا' شہزادہ کوئی نہیں تھا تو پھر انہوں نے فیصلہ کیا کہ کس کو اپنا بادشاہ بنائیں۔ آپس میں لڑائی ہونے لگی۔ انہوں

---

❶ (موسیٰؑ حیران تھا کہ یہ آواز کہاں سے آئی اور کس نے دی؟ اس پر) ندائے جمال نے کہا کہ اے موسیٰؑ! یہ آواز تمہارے خدا کی طرف سے آئی ہے جو بڑی قوتوں کا مالک اور عمدہ ترین تدابیر کا حامل ہے۔ (اس کی قوت وحکمت کا مظاہرہ اس کشمکش میں ہوگا جو تیرے سامنے آنے والی ہے)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔862)۔

❷ کوئی دوسرا چلا جاتا تو اسے دے دیتے۔ وہ تو انتظار میں لیے ہی کھڑا تھا کہ کوئی آئے۔

نے کہا کہ لڑنے کی کوئی بات نہیں ہے۔شہر کا دروازہ بند ہے اور صبح دروازہ کھولو جو سب سے پہلے دروازے میں قدم رکھے اس کے سر کے اوپر تاج رکھ دو۔جب وہاں یہ کہا کہ موسیٰؑ ! یہ اتنا بڑا سرفرازیوں کا مقام ہے جس کے لیے تمہیں منتخب کیا گیا ہے' تو انہوں نے کہا کہ آپ کا بے حد شکریہ' آپ کا بہت بڑا احسان ہے۔کہا کہ موسیٰؑ !**وَ لَقَدۡ مَنَنَّا عَلَیۡکَ مَرَّۃً اُخۡرٰۤی** (20:37) یہ پہلا احسان نہیں ہے جو یک لخت اور اتفاقیہ طور پر تم پہ کر دیا گیا ہے' تم آ گئے اور تم پہ کر دیا۔یہ تو بہت دور سے چلتا ہے۔جب تم پیدا ہوئے تھے تو وہاں سے ہی تمہاری ماں کی طرف ہم نے حکم بھیجا تھا کہ اس کو صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دو۔محکوم قوم کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ شہنشاہ کے محلوں میں پرورش پائے کہ اس نے کل کو اس کی سیاست کے ساتھ لڑائی کرنا ہے' اس کو علم ہونا چاہیے کہ محلوں کی سیاست کیا ہوتی ہے۔اس ترتیب سے وہاں تمہیں بھیجا۔وہیں تم رہتے تو فرعون کے شہزادے بن کر رہ جاتے۔جس قسم کا استبداد کا مجسمہ وہ ہے اسی قسم کے تم بن جاتے۔ وہاں سے تمہیں نکالا اور نکال کر مدین کی وادیوں میں پہنچایا۔اور ایک سائرس کے لیے مشکل ترین کام بھیڑ بکریاں پالنا اور چرانا ہے۔

## حکومتی فرائض سرانجام دینے کے لیے بکریوں کو چرانے والے چرواہے کے حوصلہ سے سرفراز ہونا ضروری ہے

یہ سب سے مشکل کام ہے' ان بھیڑ بکریوں کو نظم وضبط کے اندر رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔کبھی یہ دیکھیے کہ باہر کہیں بکریوں والا ہو تو اس بیچارے کو کیا مصیبت پڑی ہوئی ہوتی ہے۔شہر میں سڑک کے اوپر بھیڑیں لے کر چلنے والے کو دیکھو' اسے کیا کیا مصیبتیں پڑتی ہیں' ایک کو اِدھر لاتا ہے تو وہ دوسری اُدھر نکل جاتی ہے' ان کو لاتا ہے تو چار ادھر نکل جاتی ہیں۔وہ اگر دس میل چلتی ہیں تو یہ پچاس میل چلتا ہے۔گھیر گھیر کر لا رہا ہے' بھیڑیوں سے حفاظت کر رہا ہے' سردی گرمی سے حفاظت کر رہا ہے' غلط راستے پہ چلنے سے حفاظت کر رہا ہے' ایک ایک کو لا کر گلہ بنا رہا ہے۔یہ شبانی آسان کام نہیں ہے۔ اقبالؒ (1877-1938ء) کہتا ہے:

اگر کوئی شعیب آئے میسر شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

شبانی کی تعلیم بڑی ضروری ہے۔وہ جو غالباً مصر کا یا یمن کا گورنر تھا' اس کے متعلق حضرت عمرؓ (581-644\45AD) نے دیکھا کہ وہ تھوڑا سا ڈسپلن کی پابندی نہیں کرتا تو حضرتِ عمرؓ نے ان کو بلا لیا اور کہنے لگے کہ تم میں کچھ تھوڑی سی تربیت کی خامی رہ گئی ہے۔کہنے لگے کہ جی! بہت اچھا۔انہیں کہا کہ یہ کمبل اور یہ پچاس بھیڑیں لو' ان کو ذرا جا کر چراؤ تو اس سے سمجھ میں آ جائے گا کہ امت کی گورنری اس طرح کی جاتی ہے۔عزیزانِ من! کوئی گڈریا اپنی بھیڑ کو ذبح کر کے نہیں کھاتا' وہ اپنی بھیڑ کی زیادہ سے زیادہ پرورش کیے جاتا ہے' کھانے والے بھیڑیئے سے اس کو بچاتا ہے۔حفاظت' پرورش' نشوونما' دن رات کیے جاتا ہے۔اور یہ اس قسم کی Indisciplined (غیر تربیت یافتہ) قوم ہے۔عزیزانِ من! بھیج دیا کہ جاؤ ان بھیڑوں کو چراؤ' پھر تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ تمہیں گورنر بنایا جائے۔

بارہ برس تک وہاں مدین میں یا دس برس تو قرآن میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے ہی یہ بھیڑ بکریاں چرانے کا معاہدہ کیا تھا اور اس

کے بعد کہا تھا کہ بڑی اچھی بات ہے۔ بہر حال بکریاں چرائیں۔ کہا کہ موسیٰؑ ! ہم نے تم سے یہ کچھ کرایا' اس طرح سے تمہاری تربیت کرتے رہے۔ یہ جو سنار کی کٹھالی ہوتی ہے جس میں یہ سونا ڈالتے ہیں' بار بار ڈالتے ہیں' بار بار نکالتے ہیں' تو سونا کندن ہو جاتا ہے۔ کہا کہ موسیٰؑ یہ کٹھالیاں تھیں جس میں ہم نے تم کو گزارا اور اس طرح سے کندن بنایا۔ **ثُمَّ جِئۡتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوۡسٰی** (20:40) تب جا کر ہمارے پیمانے پہ پورے اترے ہو **وَ اصۡطَنَعۡتُکَ لِنَفۡسِیۡ** (20:41) اور تب جا کر ہم نے تمہیں اپنے ایک کام کے لیے منتخب کیا ہے۔ ہر ایک کے سپرد تو ہم اپنا کام نہیں کر سکتے۔ تمہیں ہم پیدائش کے دن سے اس کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ کیا بات ہے! کٹھالیوں میں سے تمہیں گزارا' تب کہیں جا کر تم ہمارے پیمانے پہ پورے اترے اور ہم نے تمہیں اپنے ایک کام کے لیے منتخب کیا ہے۔ یہ بات نہیں تھی کہ تم آگ لینے کو آئے اور ہم نے تمہیں پیغمبری دے دی۔ لہٰذا وحی یا نبوت نبی کے کسب و ہنر کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ جسے اتنے بڑے عظیم کام کا اہل بنانا مقصود ہوتا ہے تو کیا یہ کوئی چھوٹا کام ہوتا ہے؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ یہ اتنا بڑا انقلابِ عظیم لانا تھا۔ یہ عام ہستی تو نہیں لا سکتی۔ یہ بات نہیں ہے کہ ایک شخص تھا' خدا کی طرف سے اُسے یونہی آٹو میٹک وحی مل گئی اور اس نے بس سمجھ لیا کہ رسول ہو گیا۔ وحی تو اس طرح سے ملتی تھی۔ یہ وحی کا ملنا نبوت ہے۔ اور آگے جو رسالت ہوتی تھی' پھر اس رسالت کی یہ کیفیت تھی کہ اتنے بڑے انقلابات لانے ہوتے تھے۔ دنیا بھر کی مستبد قوتوں کے ساتھ مزاحمت اور مخاصمت اور جنگ آزمائیاں کرنا پڑتی تھیں تو اس کے لیے ایسی شخصیت کی ضرورت تھی۔ یہ نہیں تھا کہ آگ لینے کو جائے اور پیغمبری مل جائے۔

## مقامِ نبوت ریاضتوں اور چلّوں کا رہین منت نہیں ہوتا

ہمارے ہاں یہ بھی تصور ہے کہ جو صوفیائے کرام ہیں' وہ تو غاروں میں' جنگلوں میں' بیٹھ کے تپسیا اور ریاضتیں اور چلّے اور مراقبے کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ہمیں یہ کچھ مل گیا۔ اب اس کی سند ان کو کہیں نہیں ملتی۔ اس سند (Authority) کے لیے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہینہ مہینہ غارِ حرا میں جا کر اسی طرح سے کیا کرتے تھے (معاذ اللہ)۔ یعنی وہ بھی چلّہ کاٹا کرتے تھے (معاذ اللہ)۔ اس لیے چلّے کاٹتے کاٹتے ان کو نبوت مل گئی اور ہمیں چلّے کاٹتے کاٹتے ولایت مل جاتی ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ چلّے کاٹنے سے نہیں ملتی۔ یہ شخصیت تو اتنی بلندیٔ کردار کے اوپر فائز ہوتی ہے جس نے اتنا بڑا انقلاب لانا ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! آگے وہ عصا کی بات آ گئی ہے جسے وہ لٹھ کہتے ہیں اور میں اس کے معنی سورۃ طٰہٰ میں بالخصوص بتا چکا ہوں' آج یہیں تک یہ درس ختم کرتے ہیں۔

سورۃ النمل کی آیت 9 تک ہم آئے اور 10 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط**

# دوسرا باب: سورۃ النمل (آیات 10 تا 17)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝۱۰ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۱ وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِىْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۫ فِىْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝۱۲ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۳ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۱۴ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۵ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَىْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۝۱۶ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝۱۷

عزیزانِ من! لاؤڈ اسپیکر بند کر دیں۔ مجھے ابھی یاد آیا کہ حال ہی میں نئے احکام جاری ہوئے ہیں' اگرچہ ان میں بات ایسی واضح تو نہیں ہے کہ درس کی ایک مجلس میں جو گھر کے اندر ہو' اس کی اجازت ہے یا نہیں ہے۔ چونکہ بات واضح نہیں ہے اس لیے ہم نے کوشش کی ہے کہ اس کی Clarification (وضاحت) ہو جائے۔ جب تک یہ بات واضح نہ ہو جائے' یہ استثنا (Exception) ہے۔ اس میں یہ ہو سکتا ہے اور احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہم بھی اس کو استعمال نہ کریں۔ میرا خیال ہے آئندہ درس تک شاید یہ بات ہمیں واضح ہو جائے گی کہ یہ کیا ہے۔

عزیزانِ من! آج ستمبر 1978ء کی 8 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النمل کی آیت 10 سے ہو رہا ہے: (27:10)۔

## قرآنِ حکیم نے ہر دور میں ایک ہی نظامِ حیات عطا کیا ہے

گزشتہ جمعہ خصوصی درس تھا جو روزوں کے فلسفے یا غایت کے متعلق تھا۔ اس سے پہلے درس میں سورۃ النمل کی پہلی 9 آیات آئی تھیں۔ تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ جیسے قرآن نے کہا ہے' حضرتِ نوحؑ سے لے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی کو وہی الدین دیا گیا تھا۔ دین نظامِ حیات کو کہتے ہیں۔ یہ زندگی کا ایک ضابطہ ہے۔ اور جب ضابطہ یا نظام کہیں گے تو زندگی کے مختلف شعبے

کے اندر آ جائیں گے اور جب مکمل دین ہوگا پھر کوئی گوشہ اور زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہے گا جس کے متعلق اس دین میں ہدایت یا احکام موجود نہ ہوں۔ ہر رسول وہی دین لے کر آتا تھا۔ اس دین پر عمل پیرا ہونے کے طریقے، جنہیں آپ جزئیات کہیے، مختلف ہوتے تھے۔ یہ ہر دور کے تقاضوں کے مطابق الگ ہو سکتے تھے لیکن دین کی اصل اور اساس ایک ہی ہوتی تھی اور اسکے معنی نظامِ زندگی، نظامِ مملکت، خدا کے بتائے ہوئے احکام اور اقدار کے مطابق متشکل کیا ہوا نظام کے ہیں۔ اس طرح اگر خدا کے بتائے ہوئے احکام واقدار کے مطابق اسے متشکل کیا جائے تو وہ الدین ہوتا ہے اور اگر وہ انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق ہو تو وہ لادینی مملکت ہوتی ہے خواہ اسے کوئی بھی نام کیوں نہ دے لیا جائے۔ پہلے زمانے میں اسے ملوکیت کہا جاتا تھا کیونکہ وہ دور شہنشاہیت یا بادشاہت کا ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ دور بدلتا گیا، ہمارے دور میں اگرچہ ڈکٹیٹرشپ بھی ایک انداز رہا لیکن اب انداز جمہوریت ہے یا جسے آپ پارلیمنٹ کا سسٹم کہتے ہیں، یہ عام ہے۔ جمہوریت یا ملوکیت ہو، ڈکٹیٹرشپ ہو، آمریت ہو یا کوئی بھی ہو، جس نظام میں خدا کے قوانین کے مطابق حکومت قائم نہیں ہوگی وہ الدین کے علی الرغم ایک اور چیز ہوگا۔ اسے قرآن کفر کہتا ہے۔

ایک نبی کے زمانے میں الدین کے یہ جتنے اہم گوشتے تھے ان کے برعکس جو نظامِ حیات مروج تھا اس میں جو سب سے زیادہ اور بڑی خرابی تھی قرآنِ کریم نے خاص طور پر اس کا ذکر اس نبی کی نسبت سے کیا ہے۔ اور اس نبی کی اس جدوجہد کا ذکر بھی یونہی کیا ہے کہ جیسے وہ خاص طور پر اس خرابی کو مٹا کر اس کی جگہ صحیح نظامِ خداوندی قائم کرنے کے لیے آیا تھا۔ یہ جتنے بھی انبیائے کرامؑ کے تذکرے قرآن میں ہیں، اقوامِ سابقہ کی جتنی بھی داستانیں ہیں، وہ اسی کشمکش کے مختلف شعبے یا گوشے ہیں کہ فلاں نبی کے زمانے میں وہ جو انسانوں کا وضع شدہ اور قائم کردہ نظام تھا اس کے فلاں گوشے میں یہ خرابی بڑی نمایاں طور پر ابھری ہوئی تھی اور اس نبی نے اسے دور کیا۔ یہ نہیں ہے کہ وہ صرف اسے ہی دور کرنے کے لیے آتا تھا بلکہ وہ اس نظام کی جگہ نظامِ خداوندی کو مسلط اور متشکل کرتا تھا۔ وہ یہ نظام متشکل کر کے چلا جاتا تھا۔ یہ الدین ہوتا تھا۔ اس کے بعد مخالفین نہیں، کیونکہ مخالفین تو اس کے زمانے میں اس کی مخالفت کرتے تھے اور مزاحمت کرتے تھے، خود اس نبی کے پیرو، نام لیوا، اس دین کو پھر سے انسانوں کے وضع کردہ نظام میں بدل دیتے تھے۔ فرق یہ ہوتا تھا کہ اب ملوکیت کی بجائے یہ پیشوائیت آ جاتی تھی۔

## تھیوکریسی مذہبی پیشوائیت کا ہی دوسرا نام ہے

مذہب کے نام پر غیر خداوندی نظام کو مسلط کرنا تھیوکریسی (Theocracy) ہے، یہ مذہبی پیشوائیت ہے۔ اسی لیے جو نیا نبی آتا تھا، قرآن بتاتا ہے کہ جب بھی وہ نظامِ خداوندی کی دعوت دیتا تھا تو سب سے پہلے مذہبی پیشوائیت اس کی مخالفت کرتی تھی۔ یعنی اس سے پہلے نبی کی امت جو اس کے متشکل کردہ دین کو مذہب میں بدل چکی ہوتی تھی اُس نے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا ہوتا تھا۔ یہ سب

سے پہلے اس نبی کے پیش کردہ دین کی مخالفت کرتے تھے۔ان کی Back (پشت) پہ ہمیشہ وہ اقتدار کی قوتیں ہوتی تھیں لیکن مخالفت سب سے پہلے ان کی طرف سے ہوتی تھی کیونکہ یہی مذہب کے نام لیوا ہوتے تھے اور رسول بھی جو نظام پیش کرتا تھا وہ بہر حال خدا کے نام پہ پیش کرتا تھا۔ یہ عجیب کشمکش ہے جو شروع سے چلی آ رہی ہے۔ یہ عجیب چیز ہے جو مذہبی پیشوائیت نے بطور تکنیک اختیار کی تھی۔ پوری تاریخِ انسانیت میں یہ کبھی براہِ راست برسرِ اقتدار نہیں آتے تھے' ہمیشہ پیچھے بیٹھتے تھے۔

## حکومتی ادارے میں مذہبی پیشوائیت کا مقامِ بلند

کھشتری راجہ ہوتا تھا' یہ اس کے ماتھے پہ تلک لگاتے تھے' سنگھاسن ❶ پہ منتر پڑھ پڑھ کر خود بٹھاتے تھے۔ سب کچھ یہ خود کرتے تھے' نام اس کا ہوتا تھا۔ کلیسا یا جسے چرچ کہتے ہیں' میں بھی یہی صورت تھی۔ اب ہم پادری کہتے ہیں' ان کی بھی یہی صورت تھی۔ کونسٹنٹائن (Constantine) شہنشاہ ہوتا تھا اور یہ اس کے پیچھے بیٹھے ہوئے ہوتے تھے۔ سارا نظام ان کے ہاتھ میں ہوتا تھا مگر نظم و نسق چلانے کی یہ چیز اس کے نام سے جاری ہوتی تھی۔ ملوکیت میں یہی چیز تھی۔ مسلمانوں میں بھی جب دین کی جگہ مذہب نے لے لی تو وہاں بھی ہمیں یہی صورت نظر آتی ہے۔ یہ خود کبھی تخت کے اوپر نہیں بیٹھے ہیں۔ بادشاہ کو بھی یہی تخت پر بٹھاتے تھے لیکن اس کے پیچھے وہ ساری جتنی قوت ہوتی تھی' وہ ان کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ یہ جو نیا نبی آتا تھا' نیا رسول آتا تھا' جب وہ دینِ خداوندی کی دعوت دیتا تھا تو سب سے پہلے اس کی زد ان کے اقتدار اور مفاد پر پڑتی تھی اس لیے یہ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ اصل مخالفت کرنے والا' جو اقتدار والا طبقہ ہے' وہ پیچھے ہی ہوتا تھا۔ اس میں حضرتِ نوحؑ سے لے کر حضرتِ شعیبؑ تک آ گئے۔ یعنی اس سورۃ کی سابقہ آیات میں یہاں تک ذکر آ گیا تھا۔ حضرتِ شعیبؑ کے بعد حضرتِ موسیٰؑ بنی اسرائیل کا ذکر آتا ہے۔ یہ ذکر بہت ہی تکرار اور اصرار سے قرآن میں آ رہا ہے' جا بجا جگہ بہ جگہ یہ بڑی تفصیل سے ہے' کہیں اجمالاً ہے' کہیں مفصلاً۔ اس کی وجہ خاص تھی۔ میں نے کہا ہے کہ پہلے جو نبی آتے رہے وہ جو انسانی زندگی کا کوئی خاص شعبہ تھا' جس میں زیادہ فساد پھیلتا تھا' وہ اس کی طرف ہی اپنی توجہ مرکوز رکھتے تھے۔ یہاں حضرتِ موسیٰؑ کے سلسلے میں فرعونیت کا ایک پورا نظام تھا اور یہاں وہ ملوکیت براہِ راست سامنے ہے۔

## انسانیت کی سب سے زیادہ تین مخالف قوتیں

یہاں قوم بنی اسرائیل کے سلسلے میں دیکھتے ہیں کہ مذہبی پیشوائیت ہے اور اس کا نمائندہ ہامان ہے۔ فرعون ہامان کو بلاتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کی سیاست حضرتِ موسیٰؑ کے مقابلے میں ناکام ہو گئی ہے تو پھر وہ حربے کے طور پر مذہبی پیشواؤں کو بلاتا ہے اور ان

---

❶ سنگھاسن: شاہی تخت' راج گدی

سے کہتا ہے کہ تم ذرا اس سے بھڑ و مناظرے کرو مباحثے کرو۔ اس میدان میں یہ شکست کھا جائے گا تو کام ہو گا ورنہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ گویا یہاں براہِ راست حضرتِ موسیٰؑ کا ٹکراؤ ملوکیت سے ہے مذہبی پیشوائیت سے ہے اور نظامِ سرمایہ داری سے ہے جس کا نمائندہ قارون تھا' حضرتِ موسیٰؑ کا ان تینوں سے براہ راست ٹکراؤ تھا۔ اسی لیے یہ صاحب ضربِ کلیم تھے۔ بڑے اولوالعزم الانبیاء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ یہ جو اس قدر چوکھی لڑائی ہے' ہم نہیں کہہ سکتے کہ پہلے باقی انبیائے کرامؑ کے زمانے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہو لیکن قرآنِ کریم نے اس کا بڑی ہی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہ تین ہی قوتیں ہیں جو انسانیت کا گلا گھونٹنے کے لیے دنیا میں ابلیس نے پیدا کی ہیں۔ ان میں سے ایک ایک قوت بھی کچھ کم خون آشام نہیں ہوتی لیکن یہاں یہ تینوں قوتیں یکجا جمع تھیں اور مقابلے میں وہ قوم بنی اسرائیل تھی۔

## ملکی معاملات میں ملوکیت کی تکنیک اور ذبح کا مفہوم

ملوکیت یا فرعونیت کی تکنیک یہ ہوتی ہے کہ ان میں ابنائے قوم پیدا ہی نہ ہونے دے۔ ایسے انسان نہ پیدا ہوں جو ذرا سر اٹھا کر چلیں۔ وہ ان کو ذبح کرتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ گلا کاٹ دیتے ہیں۔ ذبح کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں: ان کو کمزور کر دینا' ضعیف کر دینا' ناتواں کر دینا' ذلیل کر دینا' معاشرے کے اندر ان کا کوئی مقام ہی نہ رہنے دینا۔ اس کے بالمقابل یہ وہ لوگ ہیں جن کے اندر عورتوں کی صفات ہوتی تھیں' ہم آج کے محاورے میں انہیں چوڑیاں پہنے ہوئے کہتے ہیں۔ میری بیٹیاں اور بہنیں معاف رکھیں' میں عورت کے مقابلے میں یوں نہیں کہہ رہا۔ میرے نزدیک تو قرآن نے مرد اور عورت کے مدارج میں کوئی فرق ہی نہیں رکھا۔ جیسے وہ محاورۃً کہتے ہیں۔ آج بھی ہمارے ہاں وہ بات چلی آتی ہے۔ جہاں ہمارے ہاں کی خواتین کی طرف سے مردوں کے خلاف احتجاج ہوتا ہے کہ تم نے کچھ نہ کر دکھایا تو یہ اب بھی ان کو چوڑیاں پارسل کر کے بھیجتی ہیں۔ یہ صرف محاورہ ہے۔ یہ اس میں اپنی کمزوری کا اعتراف نہیں کرتیں بلکہ ان کے محاورے میں ان کو جواب دیتی ہیں۔ وہ بھی دشمن کے مقابلے میں یہ کہتے ہیں کہ ہم چوڑیاں پہنے ہوئے نہیں ہیں۔ تو یہ جو قرآن میں آیا ہوا ہے کہ **يُذَبِّحُ اَبۡنَآءَ هُمۡ وَ يَسۡتَحۡىٖ نِسَآءَ هُمۡ** (28:4) وہ یہ بات نہیں ہے کہ ان کے بیٹوں کو وہ ذبح کر دیتا تھا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھا کرتا تھا۔ یہ تو محاورے کی گفتگو ہے کہ وہ ابنائے قوم کو کبھی ابھرنے نہیں دیتا تھا' ورنہ اگر وہ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح کرتا تو حضرتِ موسیٰؑ کے زمانے میں لاکھوں نہیں تو کم از کم ہزاروں کی تعداد تو تورات بھی بتاتی ہے کہ وہ موجود تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کہاں سے آ گئے تھے۔ ملوکیت تو یہ تھی کہ اس محکوم قوم کے اندر ایسے افراد کو اُبھرنے ہی نہ دیا جائے جن میں کچھ بھی حمیت و غیرت کا احساس ہو اور ان میں سے ان لوگوں کو مقرب بنایا جائے' انہیں Patronise کیا جائے جن میں قوتِ مردانگی کا فقدان ہو۔ جسے قرآن

نے ملوکیت یا فرعونیت کہا ہے اب تو یہ ضرب المثل ہوگئی ہے اس کی تکنیک یہ ہوتی ہے۔ وہ اگر ساری قوم کو ذبح کر کے ختم کر دے تو وہ حکومت کس پر کرے گا۔

## حضرت موسیٰؑ کا فرعون سے مطالبہ

حضرتِ موسیٰؑ کا فرعون سے مطالبہ کیا تھا؟ مطالبہ یہی تھا کہ میں تم سے کچھ لینے کے لیے نہیں آیا' تمہاری حکومت تمہیں مبارک ہو' میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ قومِ بنی اسرائیل جس پہ تم نے اتنے ظلم روا رکھے ہیں' ان کو اجازت دو کہ میرے ساتھ چلے جائیں' میں ان کو نکال کر کسی دوسری جگہ لے جاتا ہوں' تمہیں کچھ نہیں کہتا۔ کہا کہ ہاں ٹھیک ہے' مجھے تو کچھ نہیں کہتے' مگر یہ نہیں سمجھتے کہ اگر محکوم باقی نہ رہے تو حاکم کہاں رہ سکتا ہے' وہ کس پہ حکومت کرے گا؟ یعنی محکوم کے بغیر حاکم کا تصور ہی نہیں ہے۔ آج آپ اس کے مقابلے میں بڑا آزادی کا دور کہہ رہے ہیں' کہہ رہے ہیں کہ آج ہم فرعونیت کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں' آپ دیکھیے تو سہی یہ وہی کچھ تو ہے:

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم' جواں ہیں لات و منات

(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

## ڈیموکریسی (جمہوریت) میں اقلیت اور اکثریت کا چکر

آج آپ کی جو انتہائی ڈیموکریسی ہے اس میں اگر انچاس ووٹس والے نہ رہیں تو حکومت ختم ہو جاتی ہے اس لیے اپوزیشن کو زندہ رکھا جاتا ہے۔ کوشش ہوتی ہے کہ یہ اقلیت میں رہے اور کسی نہ کسی طرح سے اس کے ووٹس کھینچیں اور ہم اکیاون ہو جائیں۔ اس جزبِ اقتدار کی کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ اپوزیشن انچاس سے اڑتالیس [1] رہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ اگر موجود نہ رہے تو حکومت ہی نہیں ہو سکتی۔ آج یہ وہی اقلیت ہے جسے وہ محکوم کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ اڑتالیس ووٹ والے اس ڈیموکریسی میں کتنے ہی برسرِ حق کیوں نہ ہوں' آسمانوں سے ووٹ لے کر بھی کیوں نہ آئے ہوئے ہوں' انہیں اکیاون والوں کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ اور انہیں ہی نہیں ماننا پڑتا' یہ اڑتالیس والے جس طبقے کے نمائندے ہیں جو 48% آبادی کا ہو گیا' ان 48% کو اس 52% کے ہر قسم کے احکام و قوانین ماننے پڑتے ہیں۔ یہ طبقہ محکوم ہوتا ہے۔

اس میں آپ دیکھتے ہیں کہ یہ سامریت کس طرح سے الجھاؤ دیتی ہے۔ اسے اقبالؒ (1877-1938) حکمراں کی ساحری [2]

---

[1] جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں' تولا نہیں کرتے! (اقبالؒ: ضربِ کلیم)

[2] خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی سامری (اقبالؒ: ضربِ کلیم)

کہتا ہے۔ سارے خوش ہیں کہ ڈیموکریسی کے اندر کوئی محکوم نہیں ہوتا' کوئی حاکم نہیں ہوتا۔ یہ الجھاؤ [1] ہے کہ پہلے یہ سمجھنے سوچنے کی قوتیں مفقود کرتا ہے' کھڑے ہو کر کوئی نہیں سوچتا ہے کہ اگر تم محکوم نہیں ہو تو اور کیا ہو؟ جب دو ووٹ ادھر چلے گئے ہیں تو تم دیکھ رہے ہو کہ جو کچھ وہ فیصلہ کرتے ہیں وہ تمہیں ماننا پڑتا ہے۔ فرعونیت یہ تھی۔ عزیزانِ من! مختلف مقامات پر یہ چیزیں آ چکی ہیں' ہر جگہ میں نے انہیں بیان کیا ہے اور آئندہ بھی آئیں گی تو ہر مقام پہ میں یہ عرض کروں گا۔ سیاست کے میدان میں بھی جو چیزیں' جو دلائل حضرتِ موسیٰؑ نے پیش کیے ہیں تو وہ واقعی ان کا توڑ نہیں تھا اور آج بھی ان کا توڑ نہیں ہے۔ اور یہاں جب وہ فرعون ہار گیا تو اب پھر وہ مذہب کو درمیان میں لے آیا۔

## تحریکِ پاکستان کے دوران قائداعظمؒ کا پرویزؒ کے لیے فرمان

تحریکِ پاکستان میں ہم پہ یہ بیتی ہوئی ہے۔ جب ہندو انگریز دونوں قائداعظم محمد علی جناحؒ (1876-1948) سے شکست کھا گئے تھے تو جیسا انہوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ یہ جو ہندو انگریز کی مخالفت ہے' اب وہ قال اللہ اور قال الرسول کے آلاؤ میں آئے گی۔ یہ بڑا خطرناک محاذ (Front) ہوگا۔ میدانِ سیاست میں جب فرعون ہارا تو پھر ہامان بلایا گیا تھا کہ اس ان کے ساتھ مناظرہ کرو' اس میں اس کو شکست دو۔ لیکن وہ جو دلائلِ خداوندی تھے' وہ اژدھا کی طرح ان کے فریب کی رسیوں کو نگل گئے۔ وہ Physically (جسمانی طور پر) نہ کوئی اژدھا تھا' نہ کوئی رسیاں پھینکی جا رہی تھی۔ وہاں الجھاؤ کی یہ چیز تھی۔ اور اس کے بعد وہ آئے ہیں تو پھر وہ وہاں سے چھوڑ آئے' آزادی کی فضا میں آ گئے لیکن یہ کم بخت سامری ساتھ رہا۔ یعنی یہ قوموں کے اندر عجیب چیز ہے۔ قومیں آزاد ہو جاتی ہیں۔ آزاد قومیں کھلے ہوئے دشمنوں کو تو وہاں چھوڑ آتی ہیں جنہیں یہ شکست دیتی ہیں لیکن یہ جو سامریت ہے یہ ان کے اندر ہوتی ہے۔ وہ ساتھ آ گیا اور یہی کچھ تحریکِ پاکستان میں ہوا۔

## آزاد قوموں کے اندر سامریوں کا کردار

عبرانی زبان میں' تورات کے اندر اور عربوں کے ہاں بھی' سامری کہتے ہی اس کو تھے جو اچھے اچھے وعظ اور کہانیاں کہہ کر قوم کو سلائے۔ یہ سامری ساتھ آ گیا تھا۔ سامری نے کیا کیا تھا؟ اس نے ان کے لیے ایک اور خدا دینا تھا' وہ اپنے پاس سے دھیلا بھی خرچ نہیں کرتا۔ سامریوں کو تو کمانے کا ڈھنگ ہی نہیں آتا۔ وہ اپنے لیے ایک وقت کی روٹی بھی نہیں کما سکتے' دوسروں کے لیے کیا کریں گے!! کیا کرتا ہے یہ سامری؟ وہ اسی قوم سے کہتا ہے کہ تم نے یہ زیور کیا کرنا ہے' یہ وبالِ جان بن رہا ہے' لاؤ مجھے دے دو۔ انہی کا پیسہ لے کر ان کے لیے ایک معبودِ باطل کھڑا کر دیتا ہے۔ آپ ان کا مہامنتر' پروہت بن جاتا ہے۔ یعنی انہی کا پیسہ ہے' اس کا اپنا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس

---

[1] دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تُو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری (اقبالؒ: ضربِ کلیم)

کا وہی مداری کا ناٹک ہے جو ایک روپے کے دو بناتا ہے۔ یہ سامری یوں ساتھ آتا ہے۔ [1] حضرتِ موسیٰؑ کی داستان یا بنی اسرائیل کی داستان کا تکرار اس لیے ہوا ہے کہ انسانیت کی تاریخ میں جہاں بھی نظامِ خداوندی کا ٹکراؤ ہوگا اس کی مخالفت میں جو آئیں گے' وہ ان میں سے آئیں گے' کبھی ایک' کبھی دو' کبھی یہ تینوں یعنی فرعون' ہامان اور قارون۔ اس لیے یہ جو داستان بنی اسرائیل ہے بڑی تکرار سے آئی ہے۔

اب یہاں پھر اس بنی اسرائیل کی داستان ہے کہ انقلاب لانے والا کس طرح محکومیت کے شکنجے سے ان کو نجات دلاتا ہے' آزادی کی فضاؤں میں لے آتا ہے اور اس کے بعد پھر یہ قوم اس قدر ناشکر گزار ہوتی ہے۔ اور پاکستان میں تو اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اگر کسی کا پاؤں بھی کیلے کے چھلکے پہ آئے اور وہ پھسل کر جا گرے تو وہ کہتا ہے کہ ہت' تیرے پاکستان بنانے والے کی! مجھے تباہ کر دیا' میری ہڈی توڑ دی۔ پاکستان بنانے والے کو گالیاں دیتے ہیں۔ بنی اسرائیل کی یہی کیفیت ہوگئی تھی۔ کتنی مشقتوں سے حضرتِ موسیٰؑ انہیں وہاں سے نکال کر لائے تھے۔ یہ وہاں بیٹھ کر قدم قدم پہ کہتے تھے کہ حضرت موسیٰؑ ! اسی لیے تُو ہمیں لے آیا' کس مزے میں وہاں ہم اہلِ مصر کی ہانڈیاں پکایا کرتے تھے اور پھر ان میں سے ہم جو وہ بقایا چاٹتے تھے تو وہ بڑی لذیذ ہوتی تھیں۔ قدم قدم پہ وہ یہ کہہ رہے ہیں۔ ناشکر گزار قوم کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ **ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ** (2:61)۔ خدا کا عذاب کس طرح ان کے اوپر نازل ہوتا ہے۔ وہ قوم تمام دنیا کی قوموں کی نگاہوں میں ذلیل و خوار ہوگئی۔ کہا کہ یوں آیا کرتا ہے ہمارا عذاب۔ بھیک مانگتی ہے وہ قوم۔ دنیا کی کسی مملکت اور کسی قوم کے سامنے لے جاؤ' وہاں وہ ذلیل ہوتی ہے' جھکتی ہے ان کے سامنے۔ اس لیے بنی اسرائیل کی یہ داستان دہرائی گئی ہے:

ارے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

عزیزانِ من! اس کے بعد پھر ایک دور آتا ہے جس میں خدا کے اس قدر عظیم انبیائے کرام حضرتِ داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ آتے ہیں۔ وہ اس قوم کو اس مقام پہ لے جاتے ہیں جہاں سطوت داؤدی اور شوکتِ سلیمانی دنیا میں ضرب المثل ہوگئی۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کہ وہ بنی اسرائیل اپنی ذلت اور محکومیت میں The Wandering Jews ضرب المثل ہو گئے۔

## تجدیدِ یادداشت سابقہ درسِ قرآن

عزیزانِ من! اسی طرح سے خدا کے نبیوں نے اور رسولوں نے آ کر اس قوم کو ابھارا ہے تو اس میں شوکت اور حشمت آ گئی۔ قرآنِ

---

[1] خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری (اقبالؒ: ضربِ کلیم)

کریم کی یہ چند آیات جو میں پیشِ خدمت کروں گا' ان میں وہ مقام ہے۔ اسے پھر دہرا دوں کہ جب حضرتِ موسیٰؑ پہاڑِ طور کے قریب پہنچے ہیں تو وہ جاڑے کی اندھیری رات تھی۔ وہ وادی سے گزر رہے تھے' اِدھر اُدھر آبادی کا کوئی نشان نہیں تھا۔ تو دور سے انہیں آگ نظر آئی تھی۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ آگ اس بات کی دلیل ہوسکتی ہے کہ وہاں کوئی انسان ہو۔ میں جاتا ہوں' کوئی انسان وہاں ہوگا تو اس سے پتہ پوچھوں گا کیونکہ راستہ کھو گئے تھے۔ اور اگر یہ نہ ہوگا تو کم از کم کچھ تھوڑے سے الاؤ کے لیے آگ ہی لے آؤں گا تاکہ تم رات کو تاپ لو۔

## مروجہ تراجم میں لفظ ضآل کا غلط معنی: خدا کا نبی کبھی گمراہ نہیں ہوتا

رسول کے پیشِ نظر انسانیت کی دونوں ضرورتیں ہوتی ہیں: طبعی ضروریات کو پورا کرنا اور راہ گم کردہ انسانیت کے لیے ہدایت اور راہنمائی کی تلاش میں رہنا۔ اس کی کیفیت میں وہی ہوتا ہے' یہ ہر نبی کے متعلق ہے جیسے رسول اللہؐ کے متعلق ہے کہ **وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی** [1] (93:7)۔ یہ حضرتِ موسیٰؑ کا وہ دور تھا۔ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ہم نے تمہیں گمراہ پایا اور ہدایت دی۔ رسول تو اپنی نبوت سے پہلی زندگی میں بھی گمراہ نہیں ہوتا۔ ضآل کے معنی ہے کہ تلاشِ حقیقت میں سرگردان پھرنا۔ گمراہ تو وہ ہوتا ہے جو غلط راستے پہ مطمئن ہو کر چل نکلے۔

## نبوت پر فائز ہونے سے پہلے نبی کی تلاشِ حقیقت

رسول رسالت سے پہلے بھی غلط راستے پہ مطمئن نہیں ہوتا لیکن صحیح راستہ اس کے سامنے نہیں ہوتا۔ تو یہ جو چیز ہے کہ جو موجود ہے اس سے عدمِ اطمینان ہو اور جو ہونا چاہیے وہ سامنے نہیں ہے' یہ ہے جسے قرآن نے کہا ہے: **وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی** (93:7)۔ معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ بات تشبیہاً تمثیلاً ہے جو کہی گئی ہے تو حضرتِ موسیٰؑ پہ بھی یہ دور تھا کہ وہ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں تھے اسی لیے تو یہ اس مردِ بزرگ کے پاس بھی گئے تھے' وہ مرد بزرگ جسے آپ حضرتِ خضر علیہ السلام کہتے ہیں۔ (قرآن میں ان کا نام نہیں لیا گیا) یہ نبوت سے پہلے کا دور تھا۔ اور یہ ایک نبی کی خصوصیت ہے اور واقعی جس انسان نے مستقبل میں کچھ بننا ہو تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اپنے دور میں جو غلط چیزیں ہوتی ہیں وہ ان پہ مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تو مجھے پتہ نہیں ہے کہ حقیقت ہے کیا لیکن یہ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ تو یہاں سے جو اگلا مقام ہے وہ آسان ہو جاتا ہے۔

---

[1] پھر کیا یہ بھی واقعہ نہیں کہ تُو تلاشِ حقیقت میں حیران و سرگرداں پھر رہا تھا' تو اس نے بذریعہ وحی زندگی کے صحیح راستے کی طرف تیری راہ نمائی کر دی؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 1459 تا 1460)۔

حضرتِ موسیٰؑ بہرحال کوہِ طور پر ایک طرف ہدایت کے لیے بھی گئے کہ اگر وہاں کوئی انسان ملتا ہے تو راستے کا پتہ پوچھتا ہوں اور نہیں ملتا تو پھر وہ جو انسانیت کی طبعی ضروریات ہیں‘ ان کو بھی پورا کرتا ہے۔ طبعی ضرورت یہ تھی کہ سردی لگ رہی ہے تو چلو وہاں سے آگ ہی لے آؤں گا۔ درحقیقت ان کی یہ دونوں ضرورتیں تھیں کہ صحیح راستہ ملے اور سردی سے بچاؤ ہو۔ آپ نے دیکھا کہ رسول کا نظام کس طرح دین اور دنیا کو اکٹھا کرتا ہے۔ کہنے کو تو حضرتِ موسیٰؑ کی زبان سے قرآن کے یہ دو ہی فقرے ہیں کہ میں وہاں جاتا ہوں‘ وہاں کوئی ایسا انسان ہوگا جس کو راستہ معلوم ہو تو اس سے راستہ پوچھوں اور اگر نہ ہوگا تو کم از کم آگ تو تھوڑی سی لے ہی آؤں گا۔

## ایک نبی کا فرضِ منصبی‘ حصولِ منزل کی مشکلات اور عصا وغیرہ کا تمثیلاتی ذکر

رسول‘ انسانیت کے لیے دونوں چیزیں چاہتا ہے۔ ٹھٹھرتی ہوئی انسانیت کے لیے حرارت کا سامان بھی کرتا ہے اور راستہ بھولی ہوئی انسانیت کے لیے صحیح راستہ بھی تلاش کر کے لاتا ہے۔ ان تمثیلات میں قرآن یہ باتیں بیان کرتا ہے۔ ہم تو وہ سچ مچ عصا یعنی لاٹھی اور اس کے بعد اژدھا اور اس کے بعد رسیاں وغیرہ سمجھ لیتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ **وَاَلْقِ عَصَاكَ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ** (27:10) جب ہم نے اس کو احکام دیئے‘ ضابطہ دیا‘ نظام کی وہ شکلیں دیں اور کہا کہ فرعون کی طرف جاؤ کیونکہ **انه طغى** (27:43) وہ تو بہت بے باک اور سرکش ہو گیا ہے‘ سیلاب کی طرح بپھرتا ہوا چلا جا رہا ہے‘ جاؤ اور اس کو روکو۔ آپؑ کھڑے ہو گئے کہا کہ بارالٰہا! آپ کا شکر یہ کہ آپ نے مجھے اس تاجِ نبوت سے سرفراز فرمایا ہے لیکن یہ جو مجھ پہ ذمہ داری عائد کی جا رہی ہے یہ بہت بھاری ہے۔ میں محکوم قوم کا فرد ہوں اور ان کی نگاہ میں ایک جرم مجھ سے سرزد ہو گیا ہے حالانکہ میں نے اس کو دانستہ قتل نہیں کیا تھا۔ وہ تو ایک حادثہ تھا جس کی وجہ سے اس قوم کا ایک فرد مر بھی گیا تھا اور میں وہاں سے بھاگا ہوا ہوں۔ مجھے دس بارہ برس ہو گئے‘ میں ان وادیوں میں بکریاں چراتا پھرتا ہوں اور مجھ سے یہ کہا جا رہا ہے کہ جاؤ اور فرعون سے جا کر ٹکر لو اور اس کی لگام پکڑو اور اس کی مملکت میں اس پروگرام کا اعلانِ عام کر دو۔ بارالٰہا! میں یہ کہنے کی جرات نہیں کر سکتا:

ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر

## خوف اور حزن میں فرق

عزیزانِ من! اس پر حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ کیسے کروں گا‘ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ کہا کہ **يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ** [1] (27:10)۔ یہ بہت بڑی چیز ہے اور یہ ہے وہ اتنی بڑی ضمانت کہ جس کی بنا پہ وہ اتنے بڑے عظیم پروگرام کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

---

[1] اے موسیٰ! ڈرو نہیں۔

یہاں **لَا تَخَفْ** (27:10) کہا ہے کیونکہ یہ محسوس طور پر سامنے آنے والی چیز ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب غارِ ثور میں تھے جسے ہم ہجرت کی رات کہتے ہیں، وہاں بھی یہ ایک اسی قسم کا خطرہ تھا لیکن وہ خطرہ سچ مچ کا سامنے نہیں آیا تھا۔ میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ کو معلوم ہو کہ قرآن کے الفاظ کا انتخاب کیا ہوتا ہے۔ یہاں حضرت موسیٰؑ سے جو چیز کہی جا رہی ہے، وہ سچ مچ کا ایک محسوس فرعون ہے، اس کا نظام ہے، اس کی فوج ہے، اس کے لشکر ہیں، اس کے لیے ''لاتخف'' کہا ہے۔ ''خوف'' عربی زبانی میں بھی اور عام طور پر قرآن میں بھی جو محسوس خطرات ہوتے ہیں، ان کی وجہ سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ خوف ہوتا ہے۔ وہاں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کے سلسلے میں یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکے کو چھوڑ کر آئے ہیں، راستے میں حفاظت کے لیے ایک غار میں پناہ لی ہے، جہاں آگے جانا ہے یعنی مستقبل کے متعلق کچھ معلوم نہیں کہ وہاں کیا ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سوچ میں ہیں کہ پیچھے اتنا بڑا دشمن ہے، جہاں جا رہے ہیں، اس کے متعلق وہ جیسے کہ قافلے والے لٹے پٹے پناہ گزیں آتے تھے، کچھ پتہ نہیں کہ کہاں جا رہے ہیں اور وہاں کیا ہوگا، ہمارا مستقبل کیا ہوگا؟ یہ جو احساس تھا، یہ کسی مرئی (Visible)، محسوس خطرے کا نہیں تھا بلکہ ایک تصوراتی چیز تھی، تدبیری چیز تھی۔ جب یہ مقام آیا تو وہاں ''آواز'' آئی۔ اس نے اپنے ساتھی سے جس کے دل میں یہ خیالات ابھر رہے تھے، کہا کہ **لَا تَحْزَنْ** (9:40) یہ تحزن ہے۔ حزن قلبی کیفیت کو کہتے ہیں، جو کسی احساس سے پیدا ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ وہاں ''حزن'' ہوتا ہے اور جہاں محسوس خطرہ سامنے ہو تو وہاں ''خوف'' ہوتا ہے۔ حضرتِ موسیٰؑ سے کہا کہ **لَا تَخَفْ** (27:10) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ **لَا تَحْزَنْ** (9:40)۔ اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھی سے کہا کہ **اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا** (9:40) ہم تو خدا کے قوانین کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اس کے پروگرام کے مطابق چل رہے ہیں۔ اس کے وعدے جھوٹے نہیں ہوا کرتے کہ جو ہمارے پروگرام کے مطابق چلے گا، ہم اس کو غالب بنا کر رہیں گے۔

## رسالت کا انتخاب خدا تعالیٰ کے پروگرام کے مطابق عمل میں آتا ہے

یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ **لَا تَخَفْ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ** (27:10) ہمارے پیغمبر، ہمارے منتخب پروگرام کو محسوس شکل میں لانے والے! جسے رسالت کہتے ہیں، جن کا ہم انتخاب کرتے ہیں، ان کے لیے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ آپ کو یاد ہے کہ پچھلے سے پچھلے درس میں، میں نے بتایا تھا اور جو کہا گیا تھا اسے پھر دہرا دوں کہ ''ہمارے جو مرسل ہیں، وہ ڈرتے نہیں ہیں۔'' میں نے کہا تھا کہ ہمارے ہاں تو تصور یہ ہے کہ خدا کی دین کا موسیٰ علیہ السلام سے پوچھیے احوال کہ آگ لینے کو جائیں اور پیغمبری مل جائے۔ وہ جیسے کہتے ہیں کہ کسی مملکت کا بادشاہ مر گیا، اس کا تو وارث یعنی شہزادہ کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے طے کیا کہ شہر کا دروازہ رات کو بند کرو اور صبح کو کھولو اور جو آدمی سب سے پہلے اندر آئے اُس کے سر پہ تاج رکھ دو۔ اگلی صبح وہ دروازہ کھولا تو گدڑی والا فقیر تھا۔ اُس کو پکڑ لیا کہ تم ہمارے بادشاہ ہو۔ دشمنوں نے کہا کہ ٹھیک ہے، وہاں پتہ لیا کہ یہاں تو یہ حالت ہو رہی ہے کہ ان کے ہاں بادشاہتیں یوں بٹ رہی

ہیں' گدڑی والوں کے سر پر تاج رکھے جا رہے ہیں تو انہوں نے وہاں حملہ کر دیا۔ بادشاہ (گدڑی والا فقیر) کہنے لگے کہ نہایت عمدہ حلوہ پکا کر لاؤ۔ حلوہ لے آئے۔ اسے بتایا کہ حملہ آور بہت قریب آ گئے ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ اور حلوہ لاؤ۔ اسے بتایا کہ حملہ آور دروازے پہ پہنچ چکے ہیں۔ کہنے لگے کہ آخری مرتبہ تو لاؤ' ہمیں تو اپنے حلوے سے غرض تھی۔ وہ فقیر سمجھدار تھا' بادشاہ کے کپڑے تو اس نے پہن لیے تھے لیکن اپنی گدڑی لپیٹ کے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ حلوہ کھایا اور اندر گیا اور ان سے کہا کہ السلام علیکم' ہمارا کام تو حلوہ کھانا تھا' کھا لیا' تم جانو تمہاری مملکت جانے۔

عزیزانِ من! پیغمبری یوں نہیں ملتی تھی کہ آگ لینے کو جائیں اور پیغمبری مل جائے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ قرآن کی آیتوں میں کہا تھا کہ اے موسیٰ! کیا کہتے ہو کہ تم یوں آئے اور ہم نے تمہیں یوں نبوت دیدی۔ تمہیں علم نہیں ہے' ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ ہم نے کب سے تمہیں تیار کرنا شروع کیا ہوا تھا؟ جب تم پیدا ہوئے تھے تو دوسرے ہی دن جو تمہاری ماں سے کہا گیا تھا کہ اس کو اس طرح سے صندوق میں ڈال کر بھیج دو تو وہ پہلی کڑی تھی۔ تمہیں اتنی بڑی سیاست سے' میکاؤلی سیاست [1] والوں سے ٹکراؤ لینا تھا۔ محکوم قوم کا ایک فرد' محکوم

---

[1] یہ اصطلاح سیاسی دنیا کے مسالک و مشارب کی عکاسی کرنے کے لیے استعارۃً کہی گئی ہے۔ دنیائے قدیم کے مقنن کے نزدیک' اس سیاست میں' معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو اپنے اندر پھانس لیتا ہے اور اپنے سے قوی کے ہاتھوں فوراً ٹوٹ جاتا ہے۔'' دنیائے جدید کی سیاست کا امام اطالوی مدبر میکیاؤلی ((Machiavelli:1469-1527) ہے جس کا ضابطہ اصول و مبانی تمام مغربی سیاست کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔ سنیے کہ وہ اس باب میں کیا لکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''بادشاہ کے لیے صفت روباہی نہایت ضروری ہے تاکہ وہ دجل و فریب کے جال بچھا سکے۔ اس کے ساتھ ہی خوئے شیری بھی تاکہ وہ بھیڑیوں کو خائف رکھ سکے۔ صرف شیر کی قوت کافی نہیں اس لیے عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب دیکھے کہ کوئی عہد یا معاہدہ اس کے مفاد کے خلاف جاتا ہے یا جن مصالح کے پیش نظر وہ معاہدہ کیا گیا تھا وہ باقی نہیں رہے تو اس معاہدہ کو بلا تامل توڑ ڈالے لیکن یہ ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لیے نہایت نگاہ فریب دلائل پہلے سے تلاش کر لے۔'' (The Prince, Chapter18)

قدیم ہندوستان کی سیاست میں صرف ایک مدبر کا ذکر ملتا ہے جو کوٹلیہ (Kautilya) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ Narayan Chandra Bandy opadh opadhaya نے اس کی کتاب ارتھ شاستر کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔ وہ اس کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ کوٹلیہ کے لفظی معنی ''فریب کار'' کے ہیں۔ Spalding نے اپنی کتاب Civilisation in East and West (مشرق و مغرب میں تہذیب) میں اس کے اصولِ سیاست کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اُسے ''ہندوستان کا میکیاؤلی'' کہہ کر پکارا ہے۔ اس کے اصولِ سیاست بالکل میکیاؤلی کے سے ہیں اور وہ بھی عہد و معاہدہ کو وقتی مصالح کے حصول کا ذریعہ قرار دیتا ہے اور ان سے بلا توقف پھر جانے کی تلقین کرتا ہے (ماخوذ از پرویزؒ: معراجِ انسانیت (معاف القرآن جلد چہارم)' ناشر ادارہ طلوع اسلام' کراچی' ص ص۔ 456 تا 457)۔

کوٹلیہ (چانکیہ) کی اس کتاب کا ایک ترجمہ ارتھ شاستر کے نام سے سلیم اختر نے بھی کیا ہے جو نگارشات' میاں چیمبرز 3 ٹمپل روڈ' لاہور کے ہاں سے 2001ء میں شائع ہوا ہے۔ ''اکثر محقق اس پر متفق ہیں کہ ارتھ شاستر 311 سے 300 ق م کے دوران تصنیف ہوئی۔ اس کتاب کا اصل سنسکرت متن 1904ء میں دریافت کیا گیا۔ 1905ء میں اسے پہلی مرتبہ کتابی شکل میں منظم کیا گیا اور پھر اس کے بعد حکومتِ ہند نے جناب شام شاستری کی مرتب کردہ ''ارتھ شاستر'' کو سنسکرت متن اور انگریزی ترجمہ کے ساتھ بارہا شائع کیا۔''

قوم کے گھرانے کے اندر پرورش یافتہ ہوگا تو اسے کیا پتہ ہوگا کہ محلات کی سیاست گری کیا ہوا کرتی ہے۔ تمہیں بہت سکھانا تھا۔ اُس کے لیے تدبیر یہ کی کہ تمہیں وہاں پہنچا دیا۔ تو تم اب فرعونیت کے ایک ایک حربے سے واقف ہو' تمہیں ایک ایک تدبیر باطل کا پتہ ہے۔ تمہارے سامنے تو وہاں یہ سب کچھ ہوتا تھا۔ وہاں نہ پہنچاتے تو وہ کس طرح سے تمہیں یہ سب کچھ مل جاتا۔ سمجھ لیا! اور پھر آگے آئے۔ حکومت یہ نہیں تھی کہ فرعون کے بعد وراثت میں وہ آگے مل جاتی۔

## نبوت کی ذمہ داری کو پورا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا

نبوت بادشاہ کا بیٹا ہونے کی جہت سے وارثت میں نہیں ملتی۔ کیا اس کی کوئی Qualification (لیاقت) ہے یا نہیں؟ یا یہ کہ بس کچھ نہیں صرف یہ ہو کہ وہ بادشاہ کا بیٹا ہے۔ یہ یوں نہیں ملا کرتی۔ یہ بنی اسرائیل تو ایک قوم تھی جسے تم نے تیار کرنا تھا۔ یہ قوم بنی اسرائیل تو تھی ہی ایسی کہ ادھر لاؤ تو اُدھر نکل جائیں' اُدھر لاؤ تو اِدھر چلے جائیں۔ اس کے لیے بھی ایک ٹریننگ (تربیت) کی ضرورت تھی۔ کہا کہ تم سے بکریاں چروائیں۔ اس سے بڑا مرحلہ Self Discipline (نظم وضبطِ خویش) کا ہوتا نہیں ہے۔ بکریاں چرانے والے کو دیکھو' یا اس سے پوچھو کہ اس کی حالت کیا ہوتی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اگر ایک بکری دن بھر میں دس میل چلتی ہے تو یہ گڈریا پچاس میل چلتا ہے۔ اور پھر تتا تتا تتا تتا[1] ہے' اِدھر بھاگ اور اُدھر سے لا۔ وہ سرکشی اختیار کرتی ہیں' قانون شکنی اختیار کرتی ہیں' بے راہ روی اختیار کرتی ہیں' راستے سے دوسری طرف چلی جاتی ہیں۔ چرواہا جاتا ہے اور اُن کو موڑتا ہے لیکن ''ایہڈی ڈانگ نئیں ماردا کہ اوناں دی ہڈی ٹٹ جاوے۔''[2] یہ گڈریا ہے' قصاب نہیں ہے۔ صرف اُنہیں موڑتا ہے۔ اور یہ سارا کچھ کاہے کے لیے کرتا ہے؟ اُن کو چرانے کے لیے' اُن کی ربوبیت کے لیے' اُن کی پرورش کے لیے' انہیں Discipline (نظم ونسق) بھی سکھاتا ہے۔ یہ بکریاں چرانے کا مرحلہ بڑا سخت مرحلہ ہوتا ہے۔

آپ کو یاد ہوگا' میں نے عرض کیا تھا کہ حضرت عمرؓ (634-644/45 AD) کے زمانے میں ایک گورنر کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ بعض معاملات کے اندر وہ ذرا حدود کی کچھ خاص احتیاط نہیں برتتے۔ اُنہیں بلا لیا۔ کہا کہ یہ کچھ معلوم ہوا ہے۔ کہنے لگے کہ ہاں کچھ تھوڑی سی لغزش ہوگئی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ نہیں' لغزش نہیں بلکہ تمہاری ٹریننگ (تربیت) میں ابھی کچھ فرق ہے۔ انہیں بکریاں اور کمبل دیا اور کہا کہ چھ مہینے تک یہ بکریاں چراؤ' تم اُس میں پختہ ہو جاؤ گے۔ عزیزانِ من! جس نے بکریاں نہیں چرائی ہوتیں' وہ قوم کا کبھی راہبر اور مقتدر نہیں بن سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پتہ چلے کہ بکریاں کیسے چرایا کرتے ہیں۔ قوم کے افراد تو بکریاں ہوتے ہیں۔ یہ بھیڑیا نہیں ہوتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے اپنے ساتھ ایک کتا رکھا ہوتا ہے' وہ بھی مخالف بھیڑیئے سے بچنے کے لیے' حفاظت کے لیے ہوتا ہے۔

---

[1] بکریوں کے لیے گڈریئے کی آواز

[2] لیکن اتنی بڑی لٹھ نہیں مارتا کہ ان کی ہڈی پسلی ایک ہو جائے۔

وہ اِس لیے نہیں ہوتا کہ بکریوں کو پھاڑ کھائے' اُس کا کتا کبھی بکریوں کو نہیں پھاڑ کھاتا۔ حضرتِ موسیٰؑ نے بارہ برس تک یہ سب کچھ کیا۔ قرآن نے یہ سارا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ اے موسیٰؑ! ہم نے تمہیں ان کٹھالیوں میں سے گزارا اور اُس کے بعد پھر کہیں جا کر تم ہمارے پیمانے پہ پورے اترے ہو کہ تمہیں نبوت دے رہے ہیں۔ تم کہہ رہے ہو کہ میں آگ لینے کو آیا اور نبی بنا دیا۔ ہم یوں نہیں نبوت بانٹا کرتے۔ یہ رسالت کا فریضہ ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا تھا کہ اس بیچارگی کے عالم میں میں تو محکوم قوم کا فرد ہوں۔ کہا کہ جاؤ فرعون کی طرف اور لو اُس سے ٹکر۔ اِس لیے یہ کہا کہ اے موسیٰؑ! **لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ** (27:10) ڈرو نہیں۔ جب ہم اپنے پیغمبروں کے ساتھ ہیں تو ان کے لیے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

## حضرت موسیٰؑ کے سلسلہ میں اژدھا کی اصلیت

اس آیت یعنی (27:10) میں یہ لفظ مرسلون ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں کے ترجمے اور ترجموں کے ساتھ تفسیر ہیں' ان میں ہے کہ اللہ میاں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ یہ لاٹھی پھینکو' وہ لاٹھی ڈالی تو وہ اژدھا بن گیا۔ جب اژدھا بنا تو انہوںؑ نے دیکھا کہ وہ اتنا بڑا سانپ ہے تو وہ بھاگ گئے۔ ارے بھئی! کبھی بارہ برس تک جنگل اور وادیوں میں بکریاں چرانے والا گڈریا سانپ کو دیکھ کر بھاگا کرتا ہے۔ آج بھی ہمارے دور کے گاؤں کے لوگ ہیں وہ سانپ سے ڈر کر نہیں بھاگتے۔ سانپ تو ہم سے ڈر کر بھاگتے ہیں۔ ''سانوں ڈرون واسطے تے شی شی کافی ہوندی ہیگی' اوسپ بھاویں نہ ہووے''۔ ❶ وہ جو گاؤں والا ہے' وہ نہیں ڈرتا' وہ لٹھ لے کر پیچھے پڑتا ہے۔ یہ بات عزیزانِ من! سانپ اور اُس سے ڈرنے کی نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اُس کے لیے سند کیا ہے؟ یہاں کہا کہ **لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ** (27:10) رسول کی حیثیت سے اُن سے کہا گیا ہے کہ رسول ان چیزوں سے نہیں ڈرتے۔ رسالت اور سانپ کا تو کوئی تعلق ہی نہیں ہے' ورنہ اگر یہ بات صرف سانپ سے ڈرنے کی ہوتی تو کہنے کی بات یہ تھی کہ ''میاں تیرے ورگا گھبرو سپ کولوں ڈردا پیا ہیگا۔'' ❷ کہا یہ کہ **لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ** (27:10)۔ قرآنِ کریم یوں سمجھ میں آتا ہے' عزیزانِ من! کہ وہ کیا چیز تھی جسے کہا کہ جب ہم کسی کے ذمے ایک فریضہ ڈالتے ہیں' ذمہ داری تفویض کرتے ہیں' وہ ہماری طرف سے آتی ہے تو ہم اُس کی ضمانت دیتے ہیں کہ لاتخف (27:10) جو ایسا شخص ہے اُس کو خوف کھانے کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ یہاں تو '' وہ سیاں بھئے کوتوال' اب ڈر کا ❸ ہے کا''۔ اگر کوتوال کا

---

❶ ہمیں ڈرانے کے لیے تو شی شی کی آواز ہی کافی ہوتی ہے خواہ وہ سانپ نہ بھی ہو۔

❷ ارے میاں! تم جیسا بہادر جوان' سانپ سے ڈرتا ہے۔

❸ (مثل) جس کا رشتہ دار یا واقف کار حاکم ہو' اُسے قانون کا ڈر نہیں ہوتا۔

بھی کوئی ساتھی ہو جائے تو وہ کہتے ہیں کہ اسے کوئی ڈر نہیں ہے۔ اور خدا جس کے ساتھ ہو تو آپ سوچیے کہ اسے ڈر کا ہے کا۔ یہاں مرسل کا لفظ آیا ہے' عزیزانِ من! اس لیے یہ وہ سانپ نہیں ہے جیسے کہا جاتا ہے۔

## لغزشوں کی تلافی حسنات سے مشروط ہے

یہاں کہا ہے کہ **لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ o اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا م بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ** (27:10.11)۔ عام طور پہ ہمارے ہاں اس کے ترجمہ اور تفسیروں میں بھی آپ یہ دیکھیں گے کہ مرسل جو رسول ہیں' وہ خائف نہیں ہوتے بجز ان کے جس نے ظلم کیا ہو' کہیں زیادتی کی ہو اور اُس کے بعد پھر اُس نے اپنی اُس زیادتی کو' اپنی اُس غلطی کو' حسنات سے تبدیل کر دیا ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ ہاں وہ ڈرا کرتے ہیں۔ قرآن خود یہ کہتا ہے کہ جس سے کبھی کوئی لغزش ہو گئی اور اُس کے بعد اُس نے اُس کا اعتراف کیا اور حسنات کے ذریعے سے اُس کا ازالہ کر دیا' تلافی کر دی تو وہ جو پہلی چیز تھی وہ محو ہو گئی' مٹ گئی۔ قرآن کہتا ہے کہ **اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ** (11:114) کہیں لغزشیں ہو جاتی ہیں تو وہ اُس سے مٹ جاتی ہیں کہ اُس سے زیادہ بہتر اچھا کام کیا جائے۔ قرآن تو سند دیتا ہے کہ جب کہیں حسنات عمل میں آ جائیں تو اُس سے جو پہلی سیاٰت ہوتی ہیں' وہ مٹ جاتی ہیں۔ جس نے اس طرح سے اپنی سیاٰت کو حسنات سے مٹا دیا ہو تو اُس کو تو ڈرنے کی بات ہی نہ رہی۔ قرآن تو اُس کی سند دیتا ہے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ رسول تو نہیں ڈرا کرتے' بلکہ ڈراوہ کرتے ہیں جن سے کبھی کوئی ظلم ہو گیا' زیادتی ہو گئی **اِلَّا مَنْ ظَلَمَ** (27:11)۔ مگر قرآن کہتا ہے کہ اسے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے جس سے کبھی نادانستہ کوئی زیادتی ہو گئی' لغزش ہو گئی مگر اس کے لیے شرط یہ ہے کہ **ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا** (27:11) اُس نے حسنات سے اپنی اس لغزش کا ازالہ کر لیا ہو اور یہ کہتے ہیں کہ وہ ڈرا کرتے ہیں۔ کونسے ڈرتے نہیں ہیں؟ وہ کہ جنہوں نے ظلم بھی کیا ہو اور ازالہ بھی نہ کیا ہو' تے فیر کرلو کی کرنا اے۔''[1] قدم قدم پر نظر آتا ہے کہ یہ قانونِ مکافاتِ عمل کے خلاف ہے۔

عزیزانِ من! مجھے اسی لیے اپنی قوم پہ ترس آتا ہے کہ جو ترجموں سے اس قرآن کو سمجھتی ہے۔ اگر کسی مقام پہ کہا جائے کہ نہیں' صاحب! ڈرتے تو وہ ہیں جن سے کبھی زیادتی ہو گئی ہو اور پھر ساتھ **ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا م بَعْدَ سُوْٓءٍ** (27:11) کہہ دیا۔ اگر یہ ہوتا کہ ان سے زیادتی ہوئی اور پھر اس کی تلافی نہیں کر سکے' تو وہ مکافاتِ عمل سے ڈرا کرتے ہیں اور جنہوں نے اُس کی تلافی کر دی ہے وہ نہیں۔ قرآن دوسرے مقام پہ سند دیتا ہے کہ اُس کے بعد اُس پہلے جرم کی لغزش کا نشان تک باقی نہیں رہتا۔ وہ کیوں ڈرے گا۔ یہ اس الا یعنی ''مگر'' کے یہ معنی نہیں ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ تو وہ جو ہمارے رسول ہیں' جن کو ہم اتنی بڑی ذمہ داری سونپتے ہیں' وہ ڈرتے ہیں اور نہ

---

[1] تو پھر کرلو جو کرنا ہے۔

ہی وہ لوگ جن سے ایک دفعہ کوئی لغزش ہوگئی ہو اور پھر انہوں نے اس کی تلافی کر دی ہو۔ یہ ہے اس الا کا ترجمہ۔ اس لیے کہا گیا کہ فَاِنِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (27:11) ہمارا جو قانون ہے وہ پھر ان کی محافظت بھی کرتا ہے' ان کی نشوونما بھی کرتا ہے۔ لہٰذا ان کے لیے خوف کھانے کی کوئی بات نہیں۔ وہ تھی حضرت موسیٰؑ کے ذہن میں یہ بات کہ میں وہاں غلطی سے ایک شخص کو مار آیا ہوں اور ممکن ہے کہ میں جاؤں تو پھر مجھے اشتہاری مجرم سمجھ کر گرفتار کر لیں اور یہ کچھ کریں۔ کہا کہ اُن کی بات چھوڑیئے' تمہارا معاملہ ہمارے ساتھ ہے۔ ہمارا اصول یہ ہے کہ اگر کسی سے بھولے سے کوئی لغزش ہو جاتی ہے اور وہ ہمارے بتائے ہوئے قانون کے مطابق اُس کی تلافی کر لیتا ہے تو پھر اُس کو خوف کھانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ کتنی صاف بات ہے جو قرآن نے کہی ہے۔

اگلی آیت میں کہا کہ وَاَدۡخِلۡ یَدَکَ فِیۡ جَیۡبِکَ تَخۡرُجۡ بَیۡضَآءَ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ فِیۡ تِسۡعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَقَوۡمِہٖ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَوۡمًا فٰسِقِیۡنَ (27:12)۔ ان آیات کے لیے ہمارے ہاں تو پھر وہی کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنا وہ عصا پھینکا تو وہ اژدھا بن گیا۔ پھر کہا کہ اپنا ہاتھ ذرا اپنی جیب سے باہر نکالو۔ وہ نکالا تو وہ چاند کی طرح روشن تھا' چمکتا ہوا تھا۔ یہ تھیں نشانیاں۔ اسے اقبالؒ (1877-1938) نے سمجھا۔ وہ تھا قرآنِ کریم کی یہ بات سمجھنے والا۔ اس یَدِبَیۡضَآء کے معنی ہوتے ہیں: روشن دلائل۔

## جلال و جمال' رسول کی دعوت کے روشن دلائل کے پہلو ہوتے ہیں

جب بھی کوئی رسول آتا ہے یا انقلابی Personality (شخصیت) آتی ہے تو قرآن کہتا ہے کہ پہلے آ کر اسے کہا جاتا ہے کہ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ [1] (74:2)۔ اس کے اندر جلال ہوتا ہے کہ یہ نہ کرو گے تو تباہ ہو جاؤ گے' برباد ہو جاؤ گے' خدا کا غضب آ جائے گا۔ پہلی چیز تو یہ ہوتی ہے۔ اس میں بڑا جلال ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہ اگر تم نے یہ کر دیا تو پھر تمہاری پچھلی ساری لغزشیں معاف ہو جائیں گی' برکات' خوشگواریاں' سعادت مندیاں اور سرفرازیاں تمام تمہارے حصے میں آئیں گی۔ اس میں کس قدر ٹھنڈک ہے! کس قدر جمال ہے اس کے اندر! ہر رسول جو آتا ہے' ہر انقلابی جو آتا ہے بشرطیکہ وہ فرعون نہ ہو' وہ خدا کا بھیجا ہوا رسول ہو' اُس کے دو فریضے ہوتے ہیں۔ ایک انذار ہوتا ہے' وہ غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا ہے اور دوسرا وہ بشیر ہوتا ہے' وہ خدا کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے سے خوشگوار نتائج کی بشارتیں دیتا ہے۔ پہلا حصہ جلال ہوتا ہے اور دوسرا جمال ہوتا ہے۔ وہ جو اژدھا بننے والی بات کہی گئی ہے' وہ اس کا پہلا پہلو ہے۔ اُس سے کہنا ہے کہ خدا کا قانونِ مکافات تمہیں کھا جائے گا۔ اور اگر تم نے اُس کی تلافی کر لی تو یہ اس کے درخشندہ نتائج ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ

---

[1] اُٹھ! اور خود فراموش انسانوں کو ان کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1379)۔

ملتِ بیضا اُمت مسلمہ کو کہتے ہیں یہی وہ لفظ ہے جسے بیضا کہتے ہیں یعنی درخشندہ چمکنے والی روشن۔خدا نے اپنے کلام کونور [1] کہا ہے۔ جو بھی خدا کے ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اُس کی پیشانی کے اندر قسمتیں جگمگ جگمگ کرتی ہوئی آجاتی ہیں، مطلعِ انوار ہوجاتی ہیں۔

## ''ملتِ بیضا'' کا مفہوم علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں

یہ ہے ملتِ بیضا۔یہیں سے اُس نے یہ لفظ لیا ہے، کس انداز سے پھر وہ مسلمان کہتا ہے:

نورِ قدیمی شب را برافروز!

او مسلمان! تُو تو خدا کے قدیم نور کا مظہر تھا۔تُو شمع گل کر کے بیٹھ گیا ہے۔اسے روشن کر۔

دستِ کلیمی در آستینی!

تیرا ہاتھ تو یدِ بیضا ہے، تُو اِس کو جیب میں ڈالے ہوئے ہے، اِس کو باہر نکال۔بس اتنا ہی کہنے کی یہ بات ہے۔اِس کو غلافوں میں نہ لپیٹ، اِس کو Manifesto (دستورالعمل) بنا اور دنیا کے سامنے پیش کر:

نورِ قدیمی شب را برافروز
دستِ کلیمی در آستینی

یعنی کرنے کو کچھ اور ہے ہی نہیں۔ہاتھ جیب میں ڈالا ہوا ہے، ارے! ہاتھ باہر نکال۔راستے روشن ہوتے چلے جائیں گے۔یدِ بیضا کہا ہے کہ یہ ہیں وہ احکام، انہیں لو، ان کے ساتھ وہاں جاؤ، ہمارے پیغام میں جلال بھی ہے، جمال بھی ہے۔اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ (27:12) وہ قوم جو زندگی کے صحیح راستے کو چھوڑ کر غلط راہوں پر چل نکلی تھی، اس کے افراد حدود فراموش ہوگئے ہیں، سرکش ہوگئے ہیں، اِس دریا نے ساحل توڑ دیا ہے، وہ سیلاب بن گیا ہوا ہے۔

## نبی اکرمؐ کی محنتِ شاقہ کے متعلق قرآن کا اعتراف

آپ دیکھیے کہ کتنی بڑی ذمہ داری ہے۔یہ وہ ذمہ داری ہے جس کے متعلق نبی اکرم ﷺ کو بعد میں یہ کہا گیا تھا کہ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (94:2.3) کتنا بڑا احسان ہے اے رسول! کہ تجھ پہ وہ بوجھ تھا جس نے تیری

---

[1] اس کی تشریح وتبیین کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظورالحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ النور، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2007ء، ص ص۔145 تا 165، مع انہی صفحات کے فٹ نوٹ۔

کمر توڑ دی ہوئی تھی۔ وہ بوجھ ہم نے اٹھا لیا ہے۔ جب یہ پروگرام ملتا ہے تو رسول کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ کتنی بڑی چیز ہے صاحب! کہ زندگی کا ایک ایک سانس اس میں بسر ہو' صعوبات ہوں' مشقتیں ہوں' مخالفتیں اور مزاحمتیں ہوں' میدانِ جنگ میں ساری زندگی گزری جارہی ہے۔ کہا جائے گا کہ آپ لوگ بھی تو یہ کرتے ہیں' جو انقلاب لانے والے ہیں وہ سب کچھ کرتے ہیں۔ آخر میں اقتدار ان کے ہاتھ میں آتا ہے۔ اس کے برعکس یہ نبی سب کچھ کرتا ہے اور اقتدار بھی اپنے ہاتھ میں نہیں لیتا بلکہ خدا کا اقتدار قائم کرتا ہے اُس کا محکوم بن کر جیتا ہے صاحب! اس کے پاس کونسا Incentive (جذبہ محرکہ) ہوتا ہے' اس میں سے وہ ایک پیسہ نہیں لیتا' لینے کا سوال ہی نہیں ہے۔ اقتدار ایک چیز ہوتی ہے' جس کی ہوس یہ سب کچھ کرا دیتی ہے جس کے لیے جسے اتنی اتنی بڑی قربانیاں کہتے ہیں لوگ دیتے ہیں۔ اقتدار کے لیے یہ کچھ کرتے ہیں۔ رسول کی اس ذمے داری کے اندر تو اقتدار بھی نہیں مل رہا۔ اقتدار تو ایک طرف رہا' وہاں تو اعلان کرایا جارہا ہے کہ ان سے کہدو کہ اگر میں نے بھی کبھی خدا کے کسی قانون کی خلاف ورزی کی' تو میں بھی اُس کے عذابِ عظیم سے ڈرتا ہوں۔ تم پہ تو شاید خالی عذاب ہی آئے گا مجھ پہ تو عذابِ عظیم آئے گا۔ جتنی بڑی ذمہ داری ہوگی اتنا ہی زیادہ سختی سے مواخذہ ہوگا۔ یہ ہوتی ہے رسول کی زندگی' پیغمبر کی زندگی۔

## مُبْصِرَةً کا قرآنی مفہوم

قرآن کہتا ہے کہ ان کی طرف جاؤ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً (27:13) وہ ایسے روشن دلائل لے کر وہاں ان کے پاس گیا۔ یہاں مُبْصِرَةً کہا ہے یعنی جس سے ان کی بصیرت روشن ہو جائے۔ یہ اژدھا والی بات نہیں تھی۔ وہ اگر اپنا عصا پھینکتے اور وہ اژدھا بنتا تو وہ ان کی کون سی بصیرت روشن ہوتی؟ ''اوتے رہندی سہندی جیہڑی بینائی اووی دور ہو جاندی اے' جے سپ نظر آ جاوے' انھّا ہو جاندا ے بندا۔''[1] یہاں مُبْصِرَةً سے دیکھیے قرآن کس طرح واضح کرتا چلا جاتا ہے کہ بات وہ نہیں' جو تم ذہن میں سمجھ رہے ہو یا جو تمہارے مفسر بتا رہے ہیں۔ یہ تو بصیرت سے روشن ہونے والی بات ہے۔ اور یہ وہی چیز ہے جو نبی اکرم ﷺ اور ہر رسول کہتا تھا کہ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِىْ (12:108) ہم جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں تو علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتے ہیں اور جو میرے Followers (متبعین) ہونگے' وہ بھی یہی کرینگے۔ یہ دعوت الی اللہ ہے اور وہ بھی علی وجہ البصیرت ہے۔ یہ ہے جو انہوں نے مُبْصِرَةً کہا ہے۔ انہوں نے جا کر یہ دلائل پیش کیے۔ رسول کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ میں یہ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا' میں تو خدا کی طرف سے یہ بات کہتا ہے۔ اور وہ مخالفین اسی کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نہیں برابر کی سطح پہ آؤ۔ اپنی طرف سے تم بات کرو

---

[1] وہ تو جو رہی سہی بینائی (Eyesight) ہے وہ سب بھی ختم ہو جاتی' اگر سانپ نظر آ جائے بندہ اندھا ہو جاتا ہے۔

اور اپنی طرف سے ہم بات کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ میں اپنی طرف سے کیا کروں' کیوں کہ میں تو اپنی طرف سے بات کرتا ہی نہیں ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یہ نہیں مانتے' یہ جھوٹ ہے جو تم کہتے ہو کہ میں خدا کی طرف سے آیا ہوں۔ یہ ہے وہ بات جس کے لیے ہر رسول کو کہتے تھے کہ تُو فریب کار ہے' تُو جھوٹا ہے۔ یہ خدا کو الگ کر کے کس طرح سے خود آئے؟ پھر تو یہ اور وہ دونوں ایک جیسے ہو گئے۔

## ایران کا گورنر حضرت عمرؓ کے دربار میں

ایران کی فتح کے پہلے مرحلے میں جب وہ گورنر ❶ ان کے ہاں قید ہو کر مدینے میں آیا تو حضرت عمرؓ (581-644/45AD ء) نے اُس سے پوچھا کہ میں صرف تم سے ایک بات کی وضاحت کرانا چاہتا ہوں: تم وہ ایرانی تھے جو ہمارے ساتھ بات تک کرنا اپنے لیے وجہ تذلیل سمجھتے تھے۔ یہ ایرانی عربوں کو بڑا ہی ذلت والا سمجھتے تھے۔ اُن کے ہاں کبھی یہ ہوتا تھا کہ اگر اِن کے اندر مخالفت میں عرب بھی ہے تو وہ ان کے ساتھ لڑنے سے انکار کر دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ان کے ساتھ دوستی تو ایک طرف رہی' یہ تو اس قابل بھی نہیں ہیں کہ ان سے دشمنی کی جائے۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ تم تو ہمیں یہ کہا کرتے تھے۔

زشیر شتر خوردن سوسمار

شاہنامے ❷ والا بعد میں ان کے لیے یہ ❸ کچھ کہہ گیا کہ یہ قوم اونٹنی کا دودھ پینے والی ہے اور گوہ جیسی چیز کھانے والی ہے۔ کیا یہ انسان ہے؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ تم تو ہمیں یہ کچھ سمجھتے تھے۔ آج کیا بات ہے کہ یہی عرب وہاں جا رہے ہیں اور تم ان کے آگے آگے بھیڑ بکریوں کی طرح بھاگ رہے ہو؟ تمہارا اتنا بڑا بادشاہ یزدگرد جان بچانے کے لیے ایک پن چکی کے اندر چھپ گیا تھا۔ انہوں نے پوچھا کہ میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ کیا بات ہو گئی کہ وہی عرب ہم ہیں' وہی ایرانی تم ہو۔ آج یہ کیوں فرق پڑا؟ عزیزانِ من! ایک کافر

---

❶ وہ ایران کا گورنر ہرمزان تھا۔

❷ فردوسی

❸ ایران کا بادشاہ یزدگرد جنگ قادسیہ سے پہلے جب اسلامی وفد سے اپنے دربار میں ملا اور اسلامی وفد نے کہا کہ یا تو اسلام قبول کر کے ہم میں سے ہو جاؤ۔ یا اسلامی مملکت کے اقتدار کی برتری تسلیم کر لو تا کہ تم بھی محفوظ رہو' اور تمہارا ملک اور اس کے باشندے بھی اور اگر یہ بھی قبول نہیں تو پھر تلوار کے فیصلے کا انتظار کرو' تو وہ غصے کے مارے آگ بگولا ہو گیا۔ کہنے لگا کہ تم وحشی اور بدتہذیب عرب (فردوسی کے الفاظ میں) سوسمار کھانے اور اونٹوں کا دودھ پینے والے گنوار' اور تمہاری جرأتوں کا یہ عالم! کیا تم بھول گئے ہو کہ تم ذرا سی سرکشی اختیار کرتے تھے تو ہم (ایرانی) خود تمہارا مقابلہ کرنے کے لیے نہیں نکلا کرتے تھے (ہم اسے باعثِ تنگ و عار سمجھتے تھے) اپنے سرداروں سے کہہ دیا کرتے تھے اور وہ تمہاری گوشمالی کر کے تمہیں سیدھا کر دیتے تھے۔ اب اگر تم لوگوں کو بھوک اور افلاس نے تنگ کر کے آمادہ بہ جنگ کر دیا ہے تو ہم تمہاری روٹی کپڑے کا انتظام کر دیتے ہیں جاؤ' آرام سے بیٹھو۔ کیوں اپنی جان کے لاگو ہو رہے ہو۔ (ماخوذ از پرویزؒ: شاہکار رسالت' ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور' 1987' ص۔175)۔

کی زبان سے اعتراف ہو رہا ہے۔ جواب دیا کہ عمرؓ! بات بڑی صاف ہے کہ پہلے تم اور ہم سامنے آتے تھے، ہم ایرانی ہوتے تھے تم عرب ہوتے تھے اور برابر کی یہ بات ہوتی ہے۔ اب جو تم آتے ہو تو ہم تو وہی اکیلے ایرانی ہوتے ہیں اور تم عرب ہوتے ہو تو تمہارے ساتھ خدا ہوتا ہے، یہ ہمارے ساتھ نہیں ہوتا۔ مجوس یہ کہہ رہا ہے کہ عمرؓ! یہ وجہ ہے ورنہ عرب تو تم بھی وہی ہو اور ایرانی ہم بھی وہی ہیں۔ بس درمیان میں یہ ایک فرق ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (9:40) وہ یہ بات کہتے تھے کہ خدا کو بیچ میں سے الگ کر کے پھر مقابلے میں آؤ۔ آج چونکہ خدا تمہارے ساتھ ہے اس لیے ہم شکست کھا گئے۔

## سحر کے معنی ایسا فریب جو سامنے نظر نہ آئے نیز قوت کا نشہ جو انسان کو بدمست کر دیتا ہے

عزیزانِ من! جب حضرت موسیٰؑ ایسے روشن دلائل لے کر اس قوم فرعون کے پاس گئے تو انہوں نے کہا کہ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (27:13)۔ یہاں یہ نہیں ہے کہ یہ جادو ہے۔ عربی زبان میں ''سحر'' فریب کو کہتے ہیں، ایسا فریب جو بظاہر پتہ نہ چلے۔ وہ جو میکیاوَلی سیاست والا فریب ہوتا ہے، اسے سحر کہتے ہیں۔ آگے ساری بات آ گئی۔ انہوں نے جادو نہیں کہا تھا۔ جو آیات تھیں جو دلائل تھے، وہ مبصرۃً تھے۔ وہ کہتے تھے کہ نہیں، یہ تمہارا دعویٰ جھوٹ ہے، فریب ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ آگے بات واضح ہو گئی جب کہا کہ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (27:13)۔ بڑی اہم بات ہے، عزیزانِ من! کہا کہ یہ جو قوت کے نشے میں بدمست ہوتے ہیں، ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر ان کے سامنے یہ اس قسم کے دلائل پیش کرو تو یہ لوگ بدھو نہیں ہوتے کہ بات کو سمجھے نہیں، یہ بات کو سمجھتے ہیں۔ کہا کہ اندر سے ان کا من، ان کا جو دل تھا وہ یقین کر گیا تھا کہ یہ بات بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے لیکن وہ جو قوت کا نشہ تھا وہ اس اعتراف کے اوپر آنے نہیں دیتا۔ قرآن دو لفظوں میں ساری کہانی کہہ گیا ہے۔ یہ جو کئی دفعہ بیٹھ کر سوچا کرتے ہیں کہ صاحب! یہ بات میری تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے، یہ جو اتنے بڑے اربابِ سیاست و اربابِ اقتدار ہیں کیا اُن کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آتی؟ وہ کہتا ہے کہ سمجھ کی بات نہیں ہے۔ سمجھ میں تو اُن کے آ گئی ہوئی ہوتی ہے لیکن جو کچھ اُس سے چھنتا نظر آتا ہے، وہ اس کا اعتراف نہیں کرنے دیتا اور یہی چیز ہے جو آخر میں اُن کی موت کا باعث ہو جاتی ہے۔

## انسان نفسیاتی ریب کے ہاتھوں مارا جاتا ہے

عزیزانِ من! قرآن نے کہا تھا کہ نفسیاتی تبدیلی کے اوپر قوم کا دارومدار ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ اندر سے دل ایک حقیقت کا اعتراف کر رہا ہو اور باہر کی جو مفاد پرستی ہے وہ اُس کی مخالفت کر رہی ہو، اس سے اندر ایک Contradiction (تضاد، کشمکش) پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ جو نفسیاتی کشمکش ہے یہ ان کی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کبھی بھی گولی نشانے پہ جا کر نہیں لگتی۔ وہ تو پوری خود

اعتمادی ہونی چاہیے اور جب بھی آپ کے ہاں کسی قسم کا ریب آ جائے تو ضعف پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآن نے اسی لیے ریب کہا ہے' شک نہیں کہا۔ الٓمٓ (2 : 1) کے بعد قرآن کریم نے اپنے متعلق یہ کہا ہے کہ **ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ** (2:2)۔ ریب کہتے ہیں کہ جو اس قسم کی کشمکش پیدا ہوتی ہے' اُس سے جو ایک ضعف پیدا ہوتا ہے' کپکپی پیدا ہوتی ہے' اضطراب پیدا ہوتا ہے' تو کہا کہ اس کتاب کو Follow (اتباع) کرو گے تو اِس قسم کی کبھی کپکپی تمہارے اندر پیدا نہیں ہوگی۔ اس سے تمہارے اندر ایک Self Confidence (خود اعتمادی) پیدا ہو جائے گا۔ اور یوں اُس نے کہا کہ ایک ایک تم میں سے بیس بیس کے اوپر بھی حاوی ہو جائے گا۔ یہ جو کیفیت ہے کہ اندر سے دل مان رہا ہے کہ یہ ٹھیک کہہ رہا ہے' باہر کی جو مصلحتیں ہیں وہ اُس کے اعتراف کی اجازت نہیں دیتیں' یہ بڑی گہری نفسیاتی کشمکش ہوتی ہے' اِس سے وہ مارا جاتا ہے۔

## مفسد کا قرآنی مفہوم اور اس کا انجام

قرآن نے اِس سے آگے کہا کہ **فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ** (27:14)۔ مفسد ناہمواریاں پیدا کرنے والے کو کہتے ہیں۔ کہتا ہے کہ پہلے جن کے اپنے اندر ناہمواری پیدا ہوگئی ہے پھر وہ قوم میں یہ کچھ پیدا کرتے ہیں۔ وعدہ کچھ کرتے ہیں اندر دل میں کچھ اور ہوتا ہے۔ قوم میں ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں۔ کہتا ہے پھر دیکھو کہ اس قسم کے لوگوں کے دل میں Self Contradiction (تضادِ خویش) کی کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کا انجام کیا ہوا کرتا ہے؟ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یوں نظر آتا ہے کہ قرآن ایک تاریخی کہانی بیان کر رہا ہے۔ تاریخی کہانی میں کیا کچھ وہ کہتا چلا جا رہا ہے۔ زندگی سے متعلق' اجتماعی حیات سے متعلق' بنیادی اساسی جو پرابلم اور مسائل اور جو ان کا حل ہیں وہ یوں لفظوں لفظوں میں آگے بیان کرتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ اور یہ حضرتِ موسیٰؑ کے متعلق ہے۔

## فرعون کی داستان کے بعد حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ کا ذکرِ خیر کیوں؟

بنی اسرائیل کی پوری درمیانی داستان یہاں نہیں آئی' وہ دوسرے مقامات پہ آئی ہے۔ اُس کے بعد اُس کا جو آخری دور ہے جس میں پھر حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ آتے ہیں' تو بات وہاں سے شروع ہو جاتی ہے۔ اور یہاں فرعون کی داستان کے فوری بعد یہ جو ان کا ذکرِ خیر کرنا ہے تو اِس کے اندر بہت بڑی گہری مصلحت ہے۔ اقتدار فرعون کے پاس بھی تھا' اقتدار سلیمانؑ اور داؤدؑ کے پاس بھی تھا۔ یہی علاقہ جہاں ان کی مملکت تھی' یہ پہلے فرعون کی مملکت کا حصہ تھا اور اسی علاقے میں اب سلیمانؑ اور داؤدؑ کی مملکت بھی ہے۔ ایک ہی علاقہ ہے۔ اب اس نے مثبت طور پر دوسری جھلک میں بتانا ہے کہ وہی سر زمین' وہی اقتدار جب خدا کے رسولوں کے ہاتھ آتا ہے تو پھر کیا کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ تو یہ جو فرعون کی ملوکیت سے Contrast (تقابلی موازنہ) تھا اُس کے لیے قرآن فوراً ان کا دور لایا ہے' جسے دورِ

شہنشاہیت کہتے ہیں۔

## نبیؐ کی ذات وحی کے علم کے علاوہ کائناتی علم سے بھی آگاہ ہوتی ہے

قرآن کریم کہتا ہے کہ **وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا** ❶ (27:15)۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ داؤدؑ اور سلیمانؑ کو مملکت ملی۔ وہ بزورِ شمشیر نہیں ملی ہے، نہ ہی وہ دہشت اور وحشت کی بنا پر اُس کو قائم رکھتے تھے۔ یہاں آیا ہے کہ **اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا** (27:15) ہم نے انہیں علم سے نوازا۔ اس علم کے اندر تو انسانوں کا یہ اقتصادی علم جو کائنات کے متعلق ہے وہ بھی ہے، اور وحی کا علم بھی اُس کے اندر شامل ہے۔ نبی کے پاس دونوں علم ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہاں وحی کا علم اُس کو مل جاتا ہے اور اُس کے بعد جب وہ وحی کے علم والی بات ختم ہوئی ہے تو پھر یہ جو نبی ہے، یہ بالکل (معاذ اللہ معاذ اللہ) محض فضول رہ جاتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا۔ یہ آٹو میٹک ہوتا ہے کہ وہاں سے تو یہ بات اس میں آ گئی اور ٹیپ ریکارڈر کی طرح اِس نے یہ جو چیز تھی پلے بیک کر دی اور پھر اُس کے بعد ڈبے کا ڈبہ رہ گیا۔ یہ نہیں ہوتا۔ اُس کی ہستی تو بڑی عظیم ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ** (27:15)۔ کیا بات ہے! عجز اور انکسار کی بھی یہ کیفیت ہے کہ خدا کے رسول بھی ہیں، نبوت بھی ملی ہوئی ہے، مملکتِ عظیم بھی ملی ہوئی ہے اور اُس کے بعد کہا یہ جا رہا ہے کہ وہ اس موہبت عظمیٰ پر خدا کے حضور شکر گزار ہیں، کہتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے، اس کے سامنے شکریہ میں ہمارا سرِ نیاز جھکا ہوا ہے کہ اُس نے اکثر مومنین پہ ہم کو فضیلت عطا کی ہے۔ یہاں اس آیت میں اکثر مومنین کہا ہے، سب پہ نہیں کہا حالانکہ مقام یہ تھا کہ وہ یہ کہہ سکتے تھے۔ ''تے ایتھے چونگی دا ملازم جیہڑا ہیگا وے او سمجھدا ہیگا اے پئی جو ایتھوں لنگدا اے ٹرک والا، ایناں ساریاں دا حاکم میں آں بیٹھا ہویا۔'' ❷ وہ نبوت اور شہنشاہیت کے مقام کے اوپر ہیں۔ یہ ہے صحیح علم کا نتیجہ۔

## بعض رسولوں کو بعض رسولوں پر فضیلت حاصل ہے

قرآن کہتا ہے کہ **فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ** ❸ (27:15)۔ اور عبادہ المؤمنین میں انبیاء بھی آئیں گے کیونکہ قرآن نے خود کہا ہے۔ ایک طرف تو یہ کہا ہے کہ کہو کہ **لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ** (2:136) ہم ان رسولوں کی رسالت میں کسی قسم کا فرق نہیں کرتے لیکن انہوں نے یہ کہا ہے کہ **فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ** (2:253) یہ جو رسول ہیں ان کو اس اعتبار

---

❶ اور ہم نے (بنی اسرائیل میں) داؤدؑ اور سلیمانؑ جیسے (اولوالعزم) پیغمبر پیدا کیے اور انہیں وحی کے علم سے نوازا (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔863)۔

❷ یہاں جو چُنگی کا ملازم ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہاں سے جو بھی کوئی ٹرک والا گزرتا ہے میں اُن سب کا حاکم ہوں جو یہاں براجمان ہوں۔

❸ ہم نے انہیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔645)۔

سے کہ ان کے فرائض کتنے وسیع تھے' کتنے اہم کام انہوں نے کیے' تو بعض کو بعض پہ فضیلت حاصل ہے۔ جب بعض کو بعض پہ فضیلت حاصل ہے تو یہ ہوسکتا ہے کہ نبی ہونے کی جہت سے بھی ایسے نبی ہوں جن کو ہم پہ بھی فضیلت حاصل ہے۔ تو یہ اعتراف کیا ہے کہ **فَضَّلَنَا عَلٰی كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ** (27:15) اس نے انہیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی۔ میں اس کو انکسار نہیں کہونگا بلکہ اسے کیسا حسین ناز اور نیاز کا امتزاج کہیں گے کہ فضیلت بھی اپنی معلوم ہے کہ یہ ہے' اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تمام مومنین سے ہم افضل ہیں' ہوسکتا ہے کہ ہم سے بھی زیادہ افضل ہوں۔ واہ! کیا کردار ہے جس کی عکاسی یہ الفاظ کررہے ہیں!

## صرف انسان ہی اشرف المخلوقات نہیں

عزیزانِ من! ضمناً بات یاد آگئی۔ ہمارے ہاں عام طور پہ انسان کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ اشرف المخلوقات ہے۔ یہ کچھ اپنے ہی متعلق آپ کچھ کہنا ہے۔ ہمارے ہاں والے تو اپنے آپ کو خدا سے بھی بڑا سمجھتے ہیں۔ قرآن میں یہ اشرف المخلوقات نہیں آیا' وہاں بھی لفظ **كَثِيْرٍ مِّمَّنْ** [1](17.70) آیا ہے کہ مخلوق میں سے اکثر پر اس کو فضیلت حاصل ہے۔ کیا پتہ ہے کیا کیا اُس کی مخلوق ہے' کہاں کہاں وہ بستی ہے! اتنا بڑا دعویٰ ہم یہاں بیٹھے ہوئے اُن کے متعلق کردیں جن کے متعلق ہمیں پتہ بھی نہیں ہے کہ وہ کیا ہیں کہ ہم سب سے اشرف ہیں۔ یہ قرآن ہے عزیزانِ من! یہ اُس کا دعویٰ نہیں ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس نے تو کثیر ممن کہا ہے کہ اکثر مخلوق جو اُس کی ہے اُس میں سے وہ ہے۔ اور مخلوق میں تو پھر یہ اب آپ کے ہاں کے سارے حیوانات پرندے سب مخلوق ہیں لیکن کیا معلوم ہے کہ اُس کی مخلوق کی کوئی انتہا ہے۔ تو ابھی سے یہ دعویٰ کردینا تو باطل ہوجاتا ہے۔ قرآن تو اِس کا سٹیفکیٹ نہیں دے سکتا تھا' اُس نے یہ نہیں کہا۔ ہم خود اپنے آپ کو ہی اشرف المخلوقات کہہ رہے ہیں۔ ''تے ساڈا منہ ویکھو اشرف المخلوقات دا۔'' [2]

---

[1] پوری آیت یوں ہے۔ ولقد کرمنا بنی ادم وحملنهم فی البر والبحر ورزقنهم من الطیبات وفضلنهم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلا (17.70) ہم نے تمام فرزندان آدم کو واجب التکریم بنایا ہے (اور انہیں قوانین طبعی کا وہ علم دیا ہے جس کی بنا پر وہ) خشکی اور تری کی تمام قوتوں کو مسخر کرسکتے ہیں اور اس طرح اپنے لیے نہایت خوشگوار سامانِ زیست حاصل کرلیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انسان کو اپنی اکثر مخلوق پر فضیلت اور برتری عطا کی ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص645)۔

[2] کہ ہمارا' اشرف المخلوقات کا منہ تو دیکھو۔

## مقامِ نبوت وراثت کا رہین منت نہیں ہوتا

قرآن نے اگلی آیت میں کہا ہے کہ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ [1] (27:16)۔ یہاں سے ایک چیز اور چل پڑی۔ ہم اپنی زبان میں سلیمانؑ کو وارثِ داؤدؑ لے لیتے ہیں۔ حضرت داؤدؑ کے بیٹے حضرت سلیمانؑ تھے۔ تو ہم یہ لے لیتے تھے کہ حضرت داؤدؑ کے وارث سلیمانؑ ہوئے۔ اب یہاں سے یہ بات آ گئی کہ صاحب! وہ بادشاہ تھے۔ ٹھیک ہے جی! تھے۔ تو پھر بیٹے کو وارثت میں بادشاہت مل گئی۔ چل بھئی، سند آ گئی کہ وراثت میں بادشاہت مل سکتی ہے۔ اُن سے پوچھیے کہ وہ تو نبی بھی تھے، تو وراثت میں تو دونوں چیزیں آئیں۔ تو اب نبوت بھی وراثت میں آ رہی ہے اور مملکت بھی وراثت میں آ رہی ہے۔ وراثت کے معنی وہ ہیں جو ہم اپنے ہاں لیتے ہیں۔ اس کا یہ سوال ہی نہیں ہے۔ یہ ہمارے ہاں کی اصطلاح ہے۔ خدا نے تو اپنے آپ کو کہا ہے کہ ہم اس کائنات کے وارث [2] ہیں۔ تو وراثت اگر باپ کے بعد بیٹے کی ہو تو ''اللہ میاں دا پیو کیہڑا ہیگا جیہدا اووارث بنڑدا پیا [3] اے۔'' یعنی یہ عجیب صورت ہے۔

## لفظ وارث کا حقیقی مفہوم

قرآنِ کریم بار بار کہتا ہے کہ بابا! ایک مقام پہ ایک لفظ ہے تو دوسرے مقامات میں دیکھو کہ اِس کے معنی کیا ہیں۔ ہمیں نہیں دیکھنا بلکہ ہم اُسی ایک مقام پہ آ جاتے ہیں اور اپنے ہاں کا ترجمہ کرتے ہیں ''جیویں پنجابی اچ قرآن اتریا ہویا اے۔'' [4] اور اُس کے مطابق پھر اُس پر تنکوں کے پل بنا کر اوپر ہاتھی گزارتے ہیں کہ وراثت میں یہ چیز آ سکتی ہے۔ اور پھر یہ وراثت والی جو بات ہے وہ اولاد میں چلتی ہے، پوچھو نہیں پھر وہ اولاد کیا سے کیا بنتی چلی جاتی ہے۔

''ورث'' کے معنی اس طرح کا وارث نہیں ہوتا جو باپ کے بعد بیٹا ہوتا ہے۔ اس کے معنی ''ملکیت کے ہوتے ہیں''، یعنی کسی چیز کے کسی کی ملکیت میں آنے کے ہوتے ہیں [5] کسی طرف سے بھی کوئی آئے۔ جس کے قبضے میں کوئی چیز ہو، وہ وارث ہوتا ہے تو ورث کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ جسے ہم Inherit کرنا کہتے ہیں، یہ وہ معنی نہیں ہوتے۔ یہ کسی چیز کا جو قبضے میں ہونا ہوتا ہے اُسے کہتے ہیں۔ حضرت

---

[1] اور داؤدؑ کے بعد، سلیمانؑ اس کا جانشین ہوا۔

[2] وللہ میراث السموت والارض (3:19)۔

[3] اللہ تعالیٰ کا وہ کونسا باپ تھا جس کا وہ وارث بن رہا ہے۔

[4] جیسے کہ پنجابی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا۔

[5] اور ''پھر اس کے پاس سے دوسروں کی طرف منتقل ہونا ہیں''۔ یہ ابن فارس کے الفاظ ہیں۔ اس اعتبار سے خدا کے لیے اَلْوَارِثُ کے معنی واضح ہیں۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد چہارم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، 1961، ص ص 1700 تا 1701۔

داؤدؑ کی جو مملکت اتنی بڑی تھی‘ اس کے بعد جو سلیمانؑ تھے‘ وہ ان کے قبضے میں آئی‘ ان کی ملکیت میں آئی‘ ان کے پاس آئی۔ اسے ہم عربی زبان میں کہیں گے کہ وہ اُس کے وارث ہوئے۔ لیکن ہم اسے کہتے ہیں کہ وہ اس کے مالک ہوئے۔ یہاں پر باپ اور بیٹے کا سوال نہیں ہے۔ اور یاد رکھیے اگر باپ اور بیٹے کا بھی سوال ہو تو یہ جتنی Qualifications (لیاقتیں)‘ جتنے جوہر‘ جتنی خصوصیات‘ کسی ایک خاص منصب کے لیے چاہئیں اگر وہ کسی باپ کے بیٹے میں موجود ہیں تو اُس بیٹے کو کیوں نہ ملیں۔

## حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے کو خلافت کے لیے کیوں نامزد نہ کیا؟

عزیزانِ من! یہ چیزیں اُس کے بیٹے ہونے کی جہت سے نہیں ملیں گی بلکہ انفرادی طور پر خود اُس میں یہ چیزیں موجود ہوں۔ قرآن یہاں کسی بیٹے کو باپ کی تمام چیزوں کا اس لیے مستحق نہیں قرار دیتا کہ محض وہ اُس کا بیٹا ہے۔ اسی طرح اس بنا پر کسی بیٹے کو Disqualify نہیں کرتا کہ ساری خوبیاں تجھ میں موجود ہیں ٹھیک ہے لیکن تم چونکہ اس کے بیٹے ہو اس لیے تم نہیں بن سکتے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہماری تاریخ میں احتیاط کے تقاضے ایسے ہوئے کہ انہوں نے کہا کہ اُس سے اس کا شائبہ پڑ جائے گا کہ شاید بیٹے کی حیثیت سے یہ دیا ہے۔ حضرتِ عمرؓ (581-644/45AD ء) کو جب کہا گیا ہے کہ اس وقت جو عبداللہ بن عمرؓ ہیں‘ یہ مملکت میں ہمیں سب سے زیادہ موزوں نظر آتے ہیں‘ کیوں کہ وہ خلافت تو انتخابی ہوتی تھی‘ تو حضرت عمرؓ سے کہا گیا کہ آپؓ ان کو کیوں نہیں Suggest (تجویز) کرتے۔ آپؓ نے کہا کہ ٹھیک ہے‘ مجھے بھی معلوم ہے کہ اس بچے میں یہ بڑی خوبیاں ہیں‘ اس نوجوان میں یہ ایسی خوبیاں ہیں‘ لیکن احتیاط کا تقاضا ہے کیوں کہ ابھی ایران کا اثر غالباً ان لوگوں کے اوپر کہیں آ سکتا ہے کہ جہاں یہ موروثی چیز تھی کہ ایک Qualified کو جو چھوڑ دینا ہے اُس سے ایسا نقصان نہیں پہنچے گا جیسا کہ اگر یہ بات اثر پذیر ہو گئی کہ عمرؓ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اس کو یہ چیز مل گئی ہے تو یہ قوم کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔ اس لیے نہ صرف یہ کہ یہ نہیں کہ اُن کو نامزد نہیں کیا‘ وہ جو انہوں نے Suggest (تجویز) کیا تھا وہ تو انتخابی کونسل بنائی تھی تو کہا تھا کہ اس بیٹے کو اس کونسل کا ممبر بھی نہ بنانا۔ ٹھیک ہے یہ بھی تقاضا ہے۔ تو میں نے عرض کیا ہے کہ وارث کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ Inherit کر کے وارث ہو جاتا ہے۔

## حضرت سلیمانؑ کے متعلق مروجہ تراجم کی بنا پر قرآنی آیات کا تفسیری بیان

اس آیت میں قرآنِ کریم نے کہا کہ **قَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ** (27:16)۔ حضرت سلیمانؑ کے تذکرہ جلیلہ میں دو تین چیزیں آئیں گی جن کے اوپر غور کی ضرورت ہے۔ ایک **مَنْطِقَ الطَّيْرِ** (27:16) ہے۔ آپ کے ہاں کے ترجمے اور ساری تفسیریں یہ ہیں کہ اُن کو پرندوں کی بولی سکھائی گئی۔ اور آگے ہے کہ

هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ (27:16) یہ بھی خدا کا بہت بڑا فضل ہے۔ پرندوں کی بولی وحی کے ذریعے سکھائی گئی ہوگی!! یہ کونسا فضلِ عظیم ہے صاحب! جس کا ذکر کیا جا رہا ہے؟ اب آپ دیکھیے کہ اس کے بعد پھر جب ہمارے ہاں دلائل لائے جاتے ہیں' تفسیروں کا نام دلائل رکھا جاتا ہے کہ جی وہ ٹھیک ہے' پرندے ہمارے آپ کی طرح تو نہیں بولتے لیکن ان کی حرکات' سکنات' چہچہاہٹ' یہ جو چڑی مار ہوتے ہیں' پرندوں کے پکڑنے والے جتنے ہیں' وہ خوب ان چیزوں کو پہچانتے ہیں کہ اب وہ کیا چیز چاہتے ہیں' وہ کیا آواز دیتے ہیں' اُن کو بھوک لگی ہے' وہ ان چیزوں کو خوب پہچانتے ہیں۔ اگر یہ وہ چیز تھی جن کو چڑی مار بھی جانتے ہیں تو یہ خدا کے ایک پیغمبر کو وحی کے ذریعے یہ باتیں بتانا اور اُس کا کہنا کہ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ (27:16) چہ معنی دارد! کیا بات ہے اس فضلِ مبین کی! آگے جا کر ھُد ھُد آتا ہے کہ جی یہ ہُد ہُد ہے۔ اِسی میں آگے جا کر وہ آتا ہے کہ وہ ایک وادی میں سے گزرے' وہ چیونٹیوں کی وادی بھری ہوئی تھی۔ النمل اس سورۃ کا نام ہی وہاں سے ہے۔ نمل چیونٹی کو کہتے ہیں کہ وہ چیونٹیوں کی وادی تھی تو وہ جوان کی سردار چیونٹی تھی اس نے باقیوں کو دہائی دی کہ آنکھ جھپکنے کے عرصے میں بلوں میں گھس جاؤ' سلیمان آ رہا ہے' اُس کا لشکر آ رہا ہے' کچل دے گا۔ وہ سب بھاگ کر بلوں میں گھس گئیں۔ اور پھر آگے تھا کہ انہوں نے گھوڑ سوار ہرکاروں کو طلب کیا تھا' اُس نے کہا تھا کہ میں اُس کا تخت یوں لے کر آتا ہوں۔

## مروجہ تفاسیر میں زیبِ داستان کے لیے کیا کچھ دے رکھا ہے!!

عزیزانِ من! یہ سارا کچھ وعظ کے لیے بڑی دلچسپ چیز ہے' سامری کے لیے اُس میں بڑا میٹریل (مواد) ہے اور پھر جب کچھ بڑھا بھی دیتے ہیں زیبِ داستاں کے لیے' تو پھر تو پوچھو نہیں۔ وہ زیبِ داستاں ہی ہوئی اور وہ وادی ہوئی چیونٹیوں کی اور چیونٹی جو اُس کی ملکہ تھی تو اُس کے متعلق تفسیروں کے اندر آپ دیکھیے۔ چیونٹی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بھیڑیئے کے برابر تھی۔ کہا کہ لنگڑی تھی۔ نام تک دیا ہوا ہے۔ یہ کچھ اگر اس کے ساتھ نہ لگائے' Sugar Coated (شکر ملفوف) نہ بنائے' تو مال بکے کیسے۔ ساری تفسیروں میں آپ کو یہ ملے گا۔ منطق الطیر ''اونہاں دیاں بولیاں سمجھدے سن پئے۔''[1] ایک بات ہے ساری جو پوچھنے کی ہے۔ ان سے کہیے کہ صاحب! یہ بات آپ کو کیسے پتہ چلا کہ وہ چیونٹی بھیڑیئے کے برابر تھی اور اس کا نام یہ تھا؟ کہنے لگے کہ صاحب! وہ کتاب میں لکھا ہے' تفسیر میں لکھا ہوا ہے۔ وہ تفسیر والا جو بیضاوی ہے' اُس سے کوئی نہیں پوچھتا کہ تمہیں یہ کیسے پتہ چلا۔ اُس سے بھی تو کچھ پوچھنا چاہیے۔ اور یہ بات ایسی نہیں ہے کیونکہ وہ تاریخی بات کہہ رہے ہیں۔ وہ حضرت سلیمانؑ کی ایک یورش ہے۔ انہوں نے حملہ کیا ہے' یروشلم سے وہ چل رہے ہیں' یمن میں پہنچ رہے

---

[1] وہ ان کی بولیاں (Languages) سمجھتے تھے۔

ہیں اور ملکہ سبا کا جو ملک ہے وہ تاریخی چیز ہے' تاریخ میں یہ واقعات موجود ہیں۔ اس دور کی تاریخ مرتب ہوئی ہے' اس راہ گزر کا اس میں پتہ دیا ہوا ہے اور نشانات دیئے ہوئے ہیں۔ اب یہ تاریخ کی ایک بات ہوگئی تو اس کے کہنے کے لیے کوئی تاریخی سند ہونی چاہیے کہ وہ چیونٹی بھیڑیئے جتنی تھی اور یہ اس کا نام تھا۔ ان لوگوں کو سند دینے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی' یہ خود سند ہوتے ہیں' وہ لکھ جاتے ہیں اور اِس کے بعد جو آنے والے ہیں ان کے لیے تو جی' وہ تفسیر میں لکھا ہے' دیکھ لو۔

## دارالعلوموں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کی علمی سطح کا میعار

آپ ان دارالعلوموں کے جو طالبعلم ہوتے ہیں کبھی اُن سے بات کیجیے کہ تمہیں کیسے پتہ ہے۔ کہتے ہیں کہ جی' میں نے کتاب میں پڑھا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ میں نے کتاب میں پڑھا ہے۔ یعنی یہ ہے آپ کے ہاں علم کی سطح۔ تو اِن سے کوئی نہیں پوچھتا یعنی یہ چیز کہ حضرت آدمؑ جمعۃ الوداع کو پیدا ہوئے تھے: ''اوتوں دس پئی او آدم پہلا جیہڑا جمیا اے تے تُوں کتھے سیں کھلوتا ہویا جے تینوں پتہ اے کہ جمعہ والے دن جمیا سی۔''[1] اور یہ درسِ قرآن کریم ریڈیو کے اوپر اناؤنس (اعلان) ہوا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا اس درس کو دینے والے آپ کے مذہبی امور کے وزیر مملکت اسلامیہ پاکستان تھے۔ یہ کون کہنے والا تھا؟ یہ اتنا ممتاز تھا اور ریڈیو کے اوپر بین الاقوامی نشریات ہو رہی ہے' حضرتِ آدمؑ کی تاریخ بیان ہو رہی ہے اور وہ جمعۃ الوداع کی فضیلت بیان کر رہے تھے اور پہلی فضیلت یہ تھی۔

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ جو تاریخی واقعات ہیں ان کے لیے تو تاریخ کی سندیں آپ کے پاس ہونی چاہئیں لیکن نہیں۔ کہتے ہیں کہ منطق الطیر کتاب میں لکھا ہے' تفسیر میں لکھا ہے۔ اس زمانے کی تاریخ سے پوچھیے' حضرتِ سلیمانؑ کے واقعات میں دیکھیے' تورات میں بھی یہ دیکھیے۔ طیر کے معنی ہوتا ہے اڑ کے جانے والی چیز' پرندے کو طیر کہتے ہی اس لیے ہیں اور اِسی سے آپ کے ہاں Aeroplane کو آپ طیارہ کہتے ہیں۔ یہ وہی ''ط'' کے ساتھ ہے' یہ طیر ہی ہے۔ اور اس لیے انہوں نے یہ طیارہ لفظ استعمال کیا کہ یہ بہت تیز جاتا ہے۔ فوج میں اس زمانے کے گھوڑوں کے رسالے ہوتے تھے اور اُس دور کے اندر تو پھر یہ تیز رفتار گھوڑے تو بڑی Asset (قیمتی ورثہ) کی چیز تھی۔

## مملکتِ حضرت سلیمانؑ کی وسعت' اس کے وسائل اور پھر آپؑ کے قائم کردہ ڈسپلن کی نوعیت

حضرت سلیمانؑ کی مملکت بڑی وسیع تھی۔ قرآن نے بتایا ہے کہ ان کے پاس نیوی کا سامان بھی تھا' ان کی جو کشتیاں تھیں وہ دن میں اتنا سفر کرلیا کرتی تھیں۔ ان کے ہاں بری (خشکی کی) فوج تھی۔ قرآن نے کہا کہ اس کے اندر یہ باہر کے وحشی کوہستانی قبائل

---

[1] ارے بھائی! بتاؤ کہ جب وہ پہلا آدم پیدا ہوا تھا تو تم کہاں کھڑے تھے کہ تجھے معلوم ہوا کہ وہ جمعہ کے دن پیدا ہوا تھا۔

بھی تھے‘ وہ اُن کے لیے بڑے بڑے قلعے بناتے تھے‘ بڑے بڑے برتن بناتے تھے۔ یعنی اس قسم کا جو کام ہے وہ بھی کرتے تھے‘ پتھر کاٹتے تھے۔ یہ آج بھی شاہراہِ قراقرم بنانے والے جو تھے تو اُس میں دونوں قسم کے لوگ تھے: ایک کوہستانی‘ صحرائی گاؤں کے باشندے‘ ان کو عربی زبان میں جن کہتے ہیں۔ یہ انہیں Near Neighbours (قریبی‘ مقامی‘ ہمسائے) کہتے تھے۔ اور دوسرے وہ جوان کے ہاں Technician تھے‘ انجینئر تھے‘ تو ان کو وہ الناس کہتے تھے یعنی شہری آبادی والوں کو۔ قرآن نے کہا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے اس لشکر کے اندر یہ کوہستانی آبادیاں بھی تھیں یعنی وہ جو اُس زمانے کے یہ جنگلی تھے۔ یہ ہمارے ہاں جو لائل پور ❶ اور منٹگمری ❷ آباد کی ہے‘ یہ ہمارے بچپن میں ہی آباد ہوئی ہے‘ وہاں کے جو اوریجنل (اصلی) رہنے والے ہیں‘ آج بھی اُن کو جانگلی کہتے ہیں۔ عربی زبان میں اسے جن کہتے ہیں۔ ناس کا لفظ ان کے ہاں موانست سے ہے یعنی Social Animal‘ شہروں کے رہنے والوں کو جو سوسائٹی میں رہتے تھے۔ عربوں کی عجیب قوم تھی۔ کہا ہے کہ اُن کی فوج میں وہ بھی تھے جو آنکھوں سے اوجھل رہتے تھے‘ اور الناس بھی تھے‘ کشتیاں بھی تھیں اور اس کے ساتھ گھوڑوں کا رسالہ بھی بہت بڑا تھا۔ آگے چل کر دوسرے مقام پہ یہ آتا ہے کہ حضرتِ سلیمانؑ نے ایک دن ذرا Inspection (معائنہ) کرنا چاہی جسے وہ آج کل پریڈ دیکھنا کہتے ہیں تو اس طرح ان کو کھڑا کیا اور انسپکشن کی اور ایک ایک کو وہ پرچی دیتے گئے‘ شاباش دیتے گئے۔ نظر آتا ہے کہ ان کے ہاں وہ گھوڑوں کا بھی ایک بہترین لشکر تھا۔ قرآن بتا رہا ہے۔ گھوڑوں کی ٹریننگ کے لیے یہ ہمارے ہاں جو پولو والے ہیں وہ گلگت والے مشہور ہیں‘ سارے پاکستان میں وہ بہترین پولو کے کھلاڑی ہیں۔ خاص قومیں خاص قبیلے ہوتے ہیں۔ خاص فن کے وہ ماہر ہوتے ہیں۔ اس زمانے کے اندر تاریخ میں یروشلم کے باہر کے علاقوں کے اندر یہ قبیلہ طیر ملتا ہے۔ وہ گھوڑے پالتے تھے اور گھوڑوں کو سدھاتے (Horness) تھے‘ فوج کے اندر یہ گھوڑوں کے اوپر ملازم ہوتے تھے۔ ''منطق'' کے معنی بولی نہیں ہوتی بلکہ فن ہوتا ہے جو چیز کسی کو Train (تربیت) کرنے کے لیے سکھایا جاتا ہے۔ کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ گھوڑوں کا لشکر بھی تھا‘ وہ فن والے بھی تھے لیکن ان کی کیفیت یہ نہیں تھی کہ وہ اس طرح ان کو ملازم کیا اور آپ ان کو جانتے ہی نہیں تھے بلکہ آپ خود بھی اُس فن کے ماہر تھے اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ یہ تھا منطق الطیر۔ آگے چل کر میں عرض کرونگا کہ وہ ہُدہُد کیا تھا۔ یہاں کہا ہے کہ **وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ** (27:16)۔ دیکھو تو کیا بات قرآن کہہ رہا ہے کہ ایک مملکت کے استحکام کے لیے جن جن ساز و سامان کی ضرورت تھی وہ حضرت سلیمانؑ کو حاصل تھیں اور یہ تھی وہ چیز جس پہ وہ کہتا تھا کہ **اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ**

---

❶ لائل پور۔ آج اس کا نام فیصل آباد ہے۔

❷ منٹگمری۔ آج اس کا نام ساہیوال ہے۔

الْمُبِيْنُ (27:16) خدا کا کتنا بڑا فضل ہے میرے حال کے اوپر! اتنی بڑی مملکت' مملکت کے استحکام کے لیے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ ساری موجود ہیں' گھوڑوں کے رسالے موجود ہیں' نیوی موجود ہے' ان کا علم بھی مجھے معلوم ہے۔ یہ نہیں ہے کہ میں ان پہ Depend (انحصار) کر رہا ہوں بلکہ خود بھی سیکھا ہوا ہوں۔ کہا کہ ان سب چیزوں کا علم ہم نے سلیمانؑ کو دیا ہوا تھا۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ (27:17)۔ حضرت سلیمانؑ کا لشکر تھا۔ حشر کے معنی ''لوگوں کا جمع کرنا''۔ اُس زمانے کے اندر یہ فوجیں جمع کی جاتی ہیں۔ عربی زبان میں اس کے لیے حشرِ اول اور حشرِ دوم آتا ہے۔ اُس کے لیے یہاں ''جنود' لفظ ہے کہ سلیمانؑ کے جمع کیے ہوئے لشکر تھے۔ آگے کہا کہ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ (27:17)۔ یہاں طیر کا لفظ پھر آیا ہے۔ اب یہ کہ صاحب! سلیمانؑ کے لشکر میں جن بھی تھے۔ ''آجن جیہڑا جن بھوت سوار ہو جاندا' جینوں ڈھول وجاوجا کے کڈ دے پئے نیں۔'' [1] آگے قرآن میں لکھا ہوا ہے کہ جو اُن میں سرکشی کرتے تھے' وہ ان کو بیڑیاں پہنا دیتا تھا۔ جن بھی تھے یعنی کوہستانی قبائل' صحرائی قبائل' جانگلی قبائل' وہ بھی لشکر کے اندر تھے۔ اُس کے اندر انس بھی تھے یعنی دانشور بھی تھے' Technicians (ٹکنیشن) بھی تھے' والطیر بھی تھے یعنی گھوڑوں کا بہت بڑا برق رفتار لشکر تھا اور اُن کو سدھانے والے بھی تھے' وہاں قبیلۂ طیر تھا یعنی قبیلۂ طیر کے وہ لوگ بھی تھے۔

## مملکت کے استحکام کے لیے مادی وسائل کی اہمیت

عزیزانِ من! اس کے ساتھ ہی قرآن نے کہا کہ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ (27:17)۔ عجیب چیز یہاں آ گئی ہے۔ ''یوزعون'' آیا ہے' یہ ''وزع'' سے ہے۔ یہ جو فوج کا ڈسپلن قائم رکھا جاتا ہے' اسے ''وزع'' کہتے ہیں۔ اُس میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ فوج اگر راستے پہ چل رہی ہے تو وہ لیفٹ رائٹ کرتے ہوئے قدم ملا کر چلتے ہیں' اُن کے ساتھ باہر ایک ذرا اونچے عہدے کا فرد ہوتا ہے اُس کو کیپٹن کہہ لیجیے یا اُن کا صوبیدار کہہ لیجیے۔ وہ نگاہ رکھتا ہے کہ کسی کا قدم غلط تو نہیں اُٹھ رہا' آگے پیچھے تو نہیں پڑ رہا' صف سیدھی رہ رہی ہے۔ یہ عرب اس شخص کو ''وازع'' کہتے تھے۔ وہاں سے یہ لفظ ''یوزعون'' ہے کہ وہ تمام جتنے بھی یہ فوج اور لشکر اُس کے تھے' جوان لوگوں کے اوپر مشتمل تھے: جنگلی اور پہاڑی بھی' میدانی بھی' گھوڑوں والے بھی' اُن تمام کے اندر وہ ملٹری ڈسپلن کو قائم رکھتا تھا۔ یہ ہے ''یوزعون''۔ کیا لفظ ہے قرآن کا! اور میں نے کہا ہے کہ وہ تو عربوں سے پوچھیے۔ یہ جو شخص اس طرح سے چلتی ہوئی فوج کے قدموں کو دیکھتا تھا کہ کسی کا قدم آگے پیچھے نہ پڑے اور پڑے تو وہ فوراً اس کو للکار دے' یہ تھا جو ''وازع'' ہوتا تھا۔ نظر آتا ہے کہ یہ فوج ہی کی بات ہو رہی ہے کہ اُن کو پھر وہ پورے ڈسپلن کے اندر رکھتے تھے۔

---

[1] یہ جن جو وہ بھوت سوار ہو جاتا ہے' جسے ڈھول بجا بجا کر پرنکالتے رہتے ہیں۔

حضرت سلیمانؑ کی Disciplined فوج تھی، اور مشتمل تھی ان تمام مختلف فوج کے شعبوں کے اوپر: بری بھی، بحری بھی، بری کے اندر وہ پیدل چلنے والے بھی اور پھر یہ گھوڑ سوار بھی اور اُن میں ڈسپلن بھی قائم تھا۔ یہ تذکرہ کر کے اب وہ بتا رہا ہے کہ کسی مملکت کو مستحکم کرنا ہو تو اس ساز و یراق کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ خالی نبوت سے قائم نہیں ہوتی، نبوت تو وہ ڈسپلن قائم کرتی ہے، باقی یہ ساری چیزوں کے ساز و یراق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے قرآن نے پہلی مملکت اسلامیہ کو، ہمارے ہاں مدینے والوں کو، کہا ہے کہ اپنے ہاں تعلیمِ کتاب وحکمت دو، اور اپنی مملکت کی سرحدوں کی حفاظت کرو۔ تو یہ بھی ضروری چیز ہے۔ یہ نبی محض ایک واعظ نہیں ہوتا تھا، یہ محض اللہ ھو سکھانے والا، پیر طریقت نہیں ہوتا تھا بلکہ مملکت قائم کرتا تھا اور مملکت کے استحکام کے لیے جن ذرائع سامان اور ساز و یراق کی ضرورت جوتی ہے قرآن ان کی تفاصیل بھی دیتا ہے۔

عزیزانِ من! اب یہاں سے ہم اس آیت پہ آ جائیں گے جس میں کہا ہے کہ **حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوۡا عَلٰى وَادِ النَّمۡلِ** (27:18)۔ یہ وہی چیونٹیوں والی بات ہے جو ہمارے ہاں بیان کی جاتی ہے کہ پھر جب وہ وادی نمل میں لشکر آیا، جہاں کہا گیا ہے کہ وہاں چیونٹیاں تھیں، بھیڑیے جتنی چیونٹی ان کی ملکہ تھی اور لنگڑی بھی تھی، اس کے صحیح مفہوم کے بیان کرنے کے لیے آج درس کا وقت پورا ہوا۔ سورۃ النمل کی 17 ویں آیت تک ہم آ گئے۔ 18 ویں آیت سے یعنی وادی نمل سے ہم آئندہ شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

# تیسرا باب: سورۃ النمل (آیات 18 تا 37)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾ وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآىِٕبِيْنَ ﴿۲۰﴾ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاْذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۱﴾ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿۲۲﴾ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۲۴﴾ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۶﴾ قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَتْ يّٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَتْ يّٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۖ فَمَآ اٰتٰىنِيَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

عزیزانِ من! آج ستمبر 1978ء کی 15 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ النمل کی آیت 18 سے ہو رہا ہے: (27:18)

## مذہب سیکولر اسٹیٹ کا ہی ترجمان ہوتا ہے

بات حضرتِ سلیمانؑ کی شوکت اور سطوت کی چلی آ رہی ہے۔ آپ دیکھیے کہ یہ جو ہمارے ہاں مذہب اور سیاست الگ الگ ہیں' ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے' تو سیکولر اسٹیٹ میں یہی ہوتا ہے۔ یہاں حضرت سلیمانؑ اتنے عظیم ''بادشاہ'' بھی ہیں' اتنی بڑی مملکت کے مالک ہیں' قرآن کریم نے اسے ملکِ عظیم کہا ہے۔ اور اس کے ساتھ آپؑ خدا کے رسول بھی ہیں۔ قرآنِ کریم میں یہ جو حضرتِ داؤدؑ اور حضرتِ سلیمانؑ کی داستانیں بیان کی ہیں' اِن میں ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ یہ کس انداز کی ہوتی ہیں۔

## حضرتِ سلیمانؑ کے دورِ اقتدار کی نوعیت اور لفظ ''جن'' کی وضاحت

یہاں پہلے یہ کہا گیا کہ ان کا کتنا بڑا لشکر تھا۔ ایک جگہ تو ان کے بحری بیڑے کا ذکر ہے۔ ان کی کشتیاں بڑی تیز رفتار تھیں۔ پھر سابقہ آیت 17 میں یہ کہا گیا ہے کہ **جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ** (27:17)۔ جیسا کہ میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا کہ آپ عام ترجمے دیکھیں گے تو ان میں تو نظر آئے گا کہ ان کے لشکر میں جنات بھی تھے' انسان بھی تھے اور پرندے بھی تھے۔ اور پھر ان ''جنوں'' کے متعلق یہ ہے کہ وہ انہیں زنجیروں میں جکڑ کر رکھتے تھے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ خود قرآنِ کریم میں اور عربی زبان میں بھی یہ ''جن'' اور انس جہاں آتے ہیں وہ وہاں کی آبادی ہے۔ عربوں کی دو قسم کی آبادی تھی۔ ان میں زیادہ تعداد ان کی تھی جو خانہ بدوش صحراؤں میں نگاہوں سے دور رہا کرتے تھے۔ عربی زبان میں جو نگاہوں سے دور ہوتا ہے اسے ''جن'' کہا جاتا ہے۔ وہ عرب اپنے ہاں ان صحرائی خانہ بدوش آبادیوں کو جنہیں بدو کہا جاتا ہے' جن کہتے ہیں اور جو آبادیاں شہروں میں بستی تھیں جنہیں آپ سوشل کہتے ہیں' وہ انس تھا۔ اِنس کے معنی ہی یہ ہیں کہ جو سوسائٹی کے اندر رہنے والے ہوں۔ ان کے لشکر میں' تاریخ بتاتی ہے' اور وہ تو کل کی بات ہے' اس دور کی تاریخ موجود ہے کہ ان کے لشکر میں جو کوہستانی قبیلے تھے' وہ جنگجو وحشی سخت کوش بھی تھے اور بڑے تندخو بھی تھے۔ کہا ہے کہ **فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ** (27:17) وہ انہیں ملٹری ڈسپلن کے اندر رکھتے تھے۔ اور ٹھیک ہے کہ ان میں سے جو ڈسپلن توڑتا ہوگا' جو قانون شکنی کرتا ہوگا' تو انہیں زنجیریں بھی پہنائی جاتی ہوں گی۔ اور پھر شہری آبادیوں کے دانشور جنہیں آج کل آپ Technologists (تکنیکار) کہتے ہیں' وہ بھی تھے۔ اور الطیر بھی جنہیں کہا گیا کہ صاحب! یہ پرندے بھی تھے۔ کیا کبھی دنیا میں کسی نے کوئی لشکر ایسا بھی دیکھا ہے جس میں پرندے فوج ہوں لیکن اس کا کیا علاج کہ آپ کے ہاں اس سے تفسیریں بھری پڑی ہیں اور پھر ترجمے بھی اسی کے مطابق ہوئے ہیں۔ کوئی ترجمہ اُٹھا کر دیکھ لیجیے' یہی ملے گا کہ لشکر کے اندر ''جن'' بھی تھے' انسان بھی تھے اور پھر پرندے بھی تھے۔

میں نے پچھلے درس میں عرض کیا تھا کہ ''طیر'' کے معنی ہوتا ہے بڑا ''برق رفتار' تیزی سے اڑنے والا''۔ آج آپ بھی ہوائی جہاز کو

طیارہ کہتے ہیں۔تو یہ اس زمانے میں گھوڑوں کا جو لشکر ہوتا تھا' جسے ہمارے ہاں رسالہ کہتے تھے'اب تو ان کی زیادہ اہمیت نہیں رہی' ہمارے دور سے ذرا پہلے' وہ فوج کا بڑا اہم حصہ ہوتا تھا اور گھوڑی پال لوگوں کو مربعے ❶ ملا کرتے تھے۔ وہ جو تیز رفتار گھوڑے پالنے والا قبیلہ تھا' خاص طور پہ اس فن کا ماہر تھا' وہ قبیلہ الطیر کہلاتا تھا اور گھوڑوں کے ان لشکر کو طیر یا طیار کہا جاتا تھا۔اس میں رسالے بھی تھے' انفنٹری تھی' اس میں پیادہ بھی تھے' آج کی طرح توپ خانہ تو نہیں تھا لیکن تیر انداز تو ہوں گے ہی۔لشکر کے مختلف قسم کے حصوں میں یہ ذکر آیا ہے۔

اب حضرت سلیمانؑ وہاں سے چلے ہوئے ہیں۔یمن میں سبا ایک قوم تھی۔آپؑ اس کے علاقے کی طرف آ رہے تھے۔قرآن نے تفصیل تو نہیں دی کہ وہاں کیا کیفیت تھی جس کی وجہ سے آپؑ لشکر کشی کر کے وہاں اتنی دور سے آ رہے تھے۔اس زمانے میں دیکھیے کہ یہ یروشلم میں' فلسطین میں تھے اور وہ یمن میں سبا کا علاقہ ہے جہاں آپؑ آ رہے تھے۔ راستے کی وادی سے آپؑ کا گزر ہوا۔اب یہاں سے آج کا درس شروع ہوتا ہے۔

## مروجہ تفسیروں میں چیونٹیوں کے تذکرہ کے علاوہ ان کی کیفیت و ماہیت

آیت یہ ہے کہ **حَتّٰٓی اِذَآ اَتَوْا عَلٰی وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ یّٰٓاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ** (27:18)۔اب ہماری تفسیر بھی اور ہمارے ترجمے بھی آئے کہ وہ چیونٹیوں کی وادی میں آئے۔نمل کے معنی چیونٹی ہوتا ہے۔ وہاں چیونٹیوں کا بہت بڑا لشکر تھا۔ وہ ایک قوم تھی اور ان کی ایک ملکہ چیونٹی نملہ تھی۔تفسیر میں اس کا نام بھی دیا ہوا ہے۔ یہ چیونٹی کا نام ہرنی یا ہرنیسٹ لکھتے ہیں۔اور لکھا ہے کہ اب وہ اتنی بڑی ملکہ اتنی بڑی مملکت کی مالکہ تو وہ عام چیونٹی ہو نہیں سکتی لکھا ہے کہ وہ بھیڑیئے جتنی بڑی تھی لیکن وہ لنگڑی تھی' پتہ نہیں اس کو کیا ہو گیا تھا۔ یہ اس کی تفسیر دی ہوئی ہے۔ جب یہ لشکر وہاں آیا تو نملہ' جو ان کی ملکہ تھی' نے تمام چیونٹیوں کو آواز دی کہ اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ۔سلیمان کا لشکر آ رہا ہے' کہیں وہ تمہیں کچل ہی نہ دے اور ان کو پتہ ہی نہ چلے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔وہ بلوں میں گھس گئیں۔

## اہل مغرب کے ہاں کے تراجم بھی انہی تصورات کے اسیر ہیں

یہ بات ہم آپ تک ہی نہیں ہے' عزیزانِ من! مغرب کی دوسری زبانوں میں' یہی ہمارے ہی ہاں کی تفسیروں کے جو ترجمے ہوتے ہیں' یہی ترجمے ان کے ہاں انگریزی میں ہوتے ہیں۔اب ان کے ہاں تو History (تاریخ) بھی موجود ہے' نہ بھی ہو تو ان کے ہاں ان کا ترجمہ یہی کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کی تفسیروں سے لے کر وہ ترجمہ کرتے ہیں۔ان کی تو غلطی نہیں ہے۔کوئی انگریزی ترجمہ بھی اٹھا کر

---

❶ قطعاتِ زمین

دیکھیے تو وہ جو طیر ہے وہ پرندوں کا لشکر ہے اور یہ جو نمل ہے یہ چیونٹیوں کا لشکر ہے۔ اب سوچیے کہ وہ لوگ جن کے سامنے قرآن ان الفاظ کے ساتھ جائے گا کہ پرندوں کا لشکر ہے جس وادی سے وہ گزرے اور آگے ابھی ہدہد اور آتا ہے تو وہ لوگ قرآن کے متعلق کیا تصور قائم کرتے ہوں گے۔

## پرندوں اور جانوروں کے نام پر انسانوں کے نام کی ریت اور تذکرہ ایک کتاب کا

میرے سامنے تو یہ چیزیں آتی رہتی ہیں اور مجھے تو ملنے کے لیے بھی وہ لوگ آتے ہیں۔ ٹھیک ہے نمل کے معنی اگر وہی چیونٹی بھی لیا جائے تو یہ عام قاعدہ تھا' سامی اقوام میں بھی تھا اور وہیں نہیں بلکہ دنیا کی مختلف قوموں میں بھی جانوروں کے نام کے اوپر یہ نام رکھنے کی بات عام تھی۔ اب تک یورپ میں' انگلینڈ میں' یہ ہوتا ہے مثلاً Mr. Fox, Mr. Lamb۔ یہ ان کے ہاں نام ہیں اور بڑے فخر سے یہ نام چلے آتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاں ہندوستان میں طوطا رام' چوہامل نام ہیں' وہ وہاں موجود ہیں۔ ہمارے ہاں بھی تو یہ شیر باز خان' شہباز خان نام ہیں۔ نواب رام پور کا نام کلب ولی خان تھا' کلب کے معنی کتا ہوتا ہے۔ جانوروں کے نام پہ نام رکھنا' یہ ریت چلی آتی ہے۔ میں تاریخ میں نہیں جانا چاہتا کہ Originally (ابتداءً) یہ بات کیوں آ گئی تھی۔ ایک دور تھا جس کے اندر پرندوں اور جانوروں کو دیوی دیوتا مانا جاتا تھا تو اس لیے ان کے یہ نام رکھتے تھے اور بعد میں یہ صرف پرندے یا جانور ہی رہ گئے۔ ان کے ہاں یہ دیوی دیوتا مانے جاتے تھے۔ بہرحال ہر قوم کے اندر جانوروں کے نام پہ انسانوں کے نام رکھنے کا رواج تھا۔ عربوں کے ہاں تو اس کا عام رواج تھا۔ خود اسلام کے دور میں آئے ہیں تو وہاں اس نام کے قبیلے موجود تھے مثلاً بنوکلب' بنواسد۔ یہ قبیلوں کے نام تھے۔ کلب کتے کو کہتے ہیں اور اسد شیر کو کہتے ہیں۔ وہ چلے آ رہے تھے یہ نام۔ ان میں ان کے ہاں افراد کا نام ''یعسوب'' ہوتا ہے' یہ شہد کی مکھی کو کہتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ جس وادی میں سے گزرے ہیں وہاں کوئی قبیلہ بستا تھا اور اس قبیلے نے اپنا نام اسی انداز سے' جو بنوکلب اور بنواسد ہے' بنونمل بھی رکھا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس وادی کے اندر یہ جو دیمک White Ants وغیرہ ہیں' جنگلوں میں' صحراؤں میں' میدانوں کے اندر' ان کے ڈھیروں مسکن ہوتے ہیں' تو ہوسکتا ہے کہ وہاں یہ ہوں لیکن جس کی بات ہو رہی ہے' وہ چیونٹیوں کی بات نہیں ہو رہی' وہ اس وادی میں رہنے والا جو قبیلہ تھا' اس قبیلے کی بات ہو رہی ہے۔ اب بھی وہ موجود ہے۔ ایک مصنف Walter Harris ہے۔ اس نے ایک کتاب لکھی ہے: Jouney to Yemen (سفرِ یمن)۔ اس کے اندر اس نے وادیٔ نمل کا ذکر کیا ہے کہ وہ وہاں موجود ہے۔ اس نے اس کی ساری Description (تفصیل) دی ہے۔ اور ان قبیلوں کا ذکر بھی کیا ہوا ہے۔ آج تک بھی وہ چیز چلی آ رہی ہے۔

## عبرانی زبان میں نمل کو مختون بھی کہا جاتا ہے

عزیزانِ من! ہمارے ہاں نمل کو چیونٹی لیا اور تفسیر یہ ہوئی کہ اس وادی کے اندر بہت چیونٹیاں تھیں اور چیونٹی ہی ان کی ملکہ تھی' چیونٹیوں کا لشکر تھا۔ اس میں حضرتِ سلیمانؑ کا لشکر آیا۔ ویسے میں تو کچھ یوں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے تو پھر بات کہیں اور چلی جاتی ہے کیونکہ عبرانی زبان میں نمل مختون کو کہتے تھے' جن کا ختنہ ہوا ہو۔ حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں ملتِ ابراہیمی پر جو قومیں چلی آ رہی تھیں' ان کے ہاں ختنہ کیا جاتا تھا' یہودیوں کے ہاں ختنہ تھا۔ عرب حضرتِ ابراہیمؑ کی ذریت میں سے تھے۔ اگرچہ ان کے دوسرے بیٹے اور اولاد میں سے تھے تو ان کے ہاں بھی یہ ختنہ تھا۔ یہ جو ہم سامی النسل قومیں کہتے ہیں' ان کے ہاں یہ ختنہ چلا آ رہا تھا اور عبرانی زبان کے اندر یہ نمل مختون کو کہتے ہیں۔ اگر اس اعتبار سے لیا جائے کہ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہاں کوئی ایسا قبیلہ بستا تھا جو حضرتِ ابراہیمؑ کی ذریت میں سے تھا یا ان کی ملت پہ چلا آ رہا تھا اور ان کی جو نشانی تھی' وہ ختنہ تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ہو یا کوئی دوسری بات ہو' بہر حال ایک وادی تھی' اس میں انسانوں کا ایک قبیلہ بستا تھا اور وہ نمل کے نام سے مشہور تھا' خواہ چیونٹی کے نام سے کہہ لیجیے یا دیمک کے نام سے کہہ لیجیے یا وہ مختون ہونے کے اعتبار سے کہہ لیجیے۔ یہ انسانوں کا ایک قبیلہ تھا۔ وہاں سے حضرتِ سلیمانؑ گزرے ہیں وہاں کی جو ملکہ تھی وہ عورت تھی۔

## موجودہ تحقیق کے مطابق وادیٔ نمل آج بھی موجود ہے

اس دوران میں خُصوصی طور پر ایک وہ دور گزرا ہے جس دور کے اندر عورتوں کی حکمرانی ہوا کرتی تھی۔ جو ہم ملکہ سبا کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں تو اب جو ٹکراؤ ہو رہا ہے وہ بھی خود عورت ہے۔ اس علاقے میں یہ چیز بھی چلی آ رہی ہو گی کہ وہ عورت ملکہ تھی اور وہ قبیلہ تھا جو مشہور تھا نمل کے نام سے' وادی مشہور تھی نمل کے نام سے۔ اب یہ سیدھی سی بات ہے اور جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ جن جغرافیہ دانوں نے یا تاریخ والوں نے وہاں جا کر تحقیق کی ہے' وہ بتاتے ہیں کہ اب بھی وہ وادی موجود ہے اور اس کا یہی نام ہے اور اس میں چیونٹیاں نہیں بستیں بلکہ انسان ہی بستے ہیں۔ حضرتِ سلیمانؑ اس وادی میں آئے تو اس وادی کی' اس قبیلے کی' جو ملکہ تھی' اس نے اپنے اہلِ قبیلہ سے کہا کہ باہر نہ رہو کیونکہ وہ بڑا لشکر جرار ہے' اپنے اپنے گھروں کے اندر پابندِ مسکن ہو جاؤ' اس طرح سے تمہاری حفاظت ہو جائے گی۔ تم باہر رہے تو وہ یہ جانے بغیر کہ تمہارا تعلق ان کے دشمن سے ہے یا نہیں' ہو سکتا ہے کہ یونہی ان کے پاؤں تلے روندے جاؤ۔ لشکر بہت بڑا ہے تو حفاظت کا ذریعہ یہی ہے کہ ان کے سامنے نہ آؤ' ٹکراؤ کی شکل نہ پیدا ہو جائے' گھروں کے اندر چلے جاؤ۔ ایسا نظر آتا ہے کہ وہ ہم پہ حملہ کرنے کے لیے نہیں آئے کہ گھروں کے کواڑ توڑ کر وہ ہمیں بھی مار دیں لیکن بہر حال ان کے راستے میں تو نہ آؤ۔ بات بڑی صاف

سی ہے کہ کمزور سا قبیلہ تھا' اتنا بڑا اجرار لشکر تھا تو اس نے اسی میں یہی حفاظت سمجھی اور بڑا صحیح قدم تھا جو اس نے اٹھایا کہ تم اپنے گھروں کے اندر چلے جاؤ' ان کے راستے میں نہ پڑو' ہوسکتا ہے کہ یونہی غیر شعوری طور پر بھی' لا یشعرون قرآن نے بات کہی ہے' تو ہوسکتا ہے کہ یونہی غیر شعوری طور پر لشکر جہاں سے گزرتا ہے وہاں تباہی مچا دیتا ہے۔ لیکن اسے یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ لشکر کس کا لشکر ہے۔ یہ کسی نمرود اور فرعون کا لشکر نہیں ہے۔ خدا کے ایک رسول کی ایک فوج ہے۔ وہ انسانیت کو کچلنے کے لیے نہیں آیا کرتی بلکہ کچلے ہوئے انسانوں کو زندگی عطا کرنے کے لیے آیا کرتی ہے۔

حضرتِ سلیمانؑ نے جب اس کی یہ بات سنی کہ وہ اپنے قبیلے والوں سے کہہ رہی ہے کہ راستے سے ہٹ جاؤ' اندر چلے جاؤ' کہیں کچل نہ دیں' فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا (27:19) تو اس کی اس بات کے اوپر وہ مسکرائے کہ اس نے اپنے جی میں کیا سمجھا ہے اور اس اعتبار سے وہ اپنی حفاظت کا سامان اس طرح سے کر رہی ہے یعنی انہوں نے اسے بڑا Lightly (ہلکے پھلکے انداز سے) لیا ہے۔ اور اس پہ تبسم فرمایا مگر انہوں نے ضاحکاً کا ترجمہ یہ کیا کہ وہ قہقہہ لگاتا ہے۔ تو کیا عرض کیا جائے بار ہا رکہنا پڑتا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ وہ خوشی کے موڈ میں آیا اور مسکرا دیا۔

## نبوت کے کنٹرول اور ملوکیت کے اقتدار میں فرق

قرآن نے کہا ہے کہ وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ (27:19)۔ یہ دیکھا کہ مجھے اتنی بڑی قوتیں حاصل ہو رہی ہیں۔ ایک قبیلے کا قبیلہ میری فوجوں کی آہٹ سن کر' آمد کی خبر سن کر' ڈر کے مارے گھروں کے اندر جا کر گھس گیا ہے' تو بڑی خوشی ہوئی۔ اس کی بات کے اوپر تو ہنسی آئی لیکن سر بدرگاہِ رب العزت جھک گیا کہ یا اللہ! میرے حال پہ تیرا کتنا فضل اور کرم ہے۔ اتنی بڑی قوت تُو نے مجھے عطا کر دی ہے کہ جس کی آہٹ سن کر بھی قبیلوں کے قبیلے راستے سے ہٹ رہتے ہیں' اپنی حفاظت اس میں دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے راستے میں بھی وہ نہ آئیں' مقابلہ تو ایک طرف رہا۔ یہ بڑی بات ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ (27:19)۔ کیا بات ہے ایک لفظ کی! وہاں (27:17) میں بھی یہ یوزعون آیا تھا کہ وہ لشکر کو ڈسپلن کی زنجیروں کے اندر رکھتا تھا' یہاں (27:19) میں حضرت سلیمانؑ نے کہا کہ میں تو اپنے لشکر کو ڈسپلن کے اندر رکھتا ہوں لیکن تُو مجھے اپنی حدود کی زنجیروں کے اندر رکھ۔ واہ واہ واہ! ۔ وہی لفظ ہے۔ بس یہ ہے فرق صاحب! کہتے ہیں کہ اسلامی نظام کیا ہوتا ہے؟ وہ یہ ہوتا ہے کہ جتنی خارج کی قوتیں ہیں ان کو تو اپنے حدود اور اپنی زنجیروں کے اندر رکھا جائے' اپنے ڈسپلن کے اندر رکھا جائے اور خود اس ڈسپلن کے اندر رہے۔ بات آ گئی کہ

ایک رسول جب صاحبِ تخت وتاج ہوتا ہے تو اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ ساری دنیا کے سامنے وہ ایک شہنشاہی قوت لیے ہوئے ہے اور خدا کے حضور میں جاتا ہے تو وہاں درخواست یہ ہے کہ تُو مجھے اپنی قوتوں کی زنجیروں کے تابع رکھ۔ اَنۡ اَشۡکُرَ نِعۡمَتَکَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ (27:19) تا کہ میں تیری اس نعمت کا شکر یہ ادا کر سکوں جس سے مجھے نوازا گیا' میرے ماں باپ کو نوازا گیا۔ یاد رہے کہ حضرت سلیمانؑ حضرت داؤدؑ کے بیٹے تھے۔

## ہمارے ہاں اللہ کے متعلق پایا جانے والا تصور

مجھے اس کی توفیق عطا فرما کہ اَنۡ اَعۡمَلَ صَالِحًا تَرۡضٰىهُ (27:19) میں وہ کام کروں جو تیرے قوانین سے ہم آہنگ ہوں۔ ہمارے ہاں تـرضٰـه کا ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ جس سے تو راضی ہو۔ کر لو بھئی! جو کرنا ہے۔ یہ عام بات آپ سنیں گے یعنی وہ ایسا اللہ ہے کہ وہ ہر وقت بگڑا بیٹھا رہتا ہے اور ہر وقت یہ کوشش ہوتی ہے کہ اسے منا لیا جائے' کسی طرح اس کو راضی کر لیا جائے صاحب! وہ اللہ کو بھی میاں کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں کا میاں تو ہمارے ہاں کی عورتیں خاوند کو کہتی ہیں' کچھ ایسا ہی انداز ہوتا ہے۔ وہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے اس خاوند کے انداز پہ اس اللہ کو سمجھ لیا۔ جب میاں کہا تو یہ کہ وہ ہر وقت روٹھے ہوئے ہیں' منہ بسورے ہوئے ہیں۔ اور عورت بیچاری کا زندگی کا فریضہ یہ رہ جاتا ہے کہ ہر وقت اسے مناتی رہے۔ اسی تصور سے انہوں نے یہ' جو کہا ہے کہ اس کو راضی کر لو' تو سوچتے نہیں کہ خدا کے متعلق تصور کیا آتا ہے کہ وہ بگڑ بھی جاتا ہے' غصے ہوا ہوتا ہے' پھر اس کو راضی کرنا پڑتا ہے' خوش کرنا پڑتا ہے' اور پھر وہ اس طرح سے خوشی میں آتا ہے تو مسکرا دیتا ہے اور وہ موج میں آجاتا ہے تو سب کچھ بخش بھی دیتا ہے۔

## خدا کا صحیح تصور تو انسان کی زندگی بدل دیتا ہے

قرآن کہتا ہے کہ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ (28:68)۔ میں عرض کر دوں' عزیزانِ من! کہ خدا کے متعلق صحیح تصور جو قرآن نے دیا ہے' وہ ذہن نشین ہو جائے تو سارا دین سمجھ میں آجاتا ہے۔ اور جب خدا کو آپ نے شہنشاہ کا تصور دے دیا تو پھر جو کچھ دنیا میں یہ بادشاہ کرتے ہیں' وہ سب کچھ سمجھا جاتا کہ وہ کرتا ہوگا کہ نہ کوئی قاعدہ' نہ کوئی قانون ''او تھے کی پرواہ! او تھے بے پروائیاں' پھڑ لے عملاں والیاں نوں' تے چھڈ دے او گنہاراں نوں''۔ ٹھیک ہے جی' کیونکہ بادشاہ ہے جی وہ۔ ''سکھوں لکھ کر دے تے لکھوں ککھ کر دے۔ جنہوں چاہے ذلیل کر دے جنہوں چاہے عزت بخش دے۔ [1] پھر خدا کا یہ تصور آجاتا ہے۔

---

[1] اس کے حضور کوئی رغبت' توجہ' ضرورت اور فکر و اندیشہ نہیں ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ اعمال صالحہ پر کاربند رہنے والوں کو پابند سلاسل کر دے اور غیر صالحہ اعمال والوں کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دے۔ کیوں کہ وہ بادشاہ جو ہوا۔ اس کی مرضی کہ وہ بے ثروت کو صاحبِ ثروت بنا دے اور صاحبان ثروت کو کنگال کر دے۔ جسے چاہے ذلیل کر دے اور جسے چاہے عزت بخش دے۔

## انسانوں نے خدا کو بادشاہ کے روپ میں سمجھ رکھا ہے

کہا یہ جاتا ہے کہ **السلطان ظلّ اللہ علی الارض** بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے۔ آپ سمجھ لیجیے کہ جس قسم کا وہ بادشاہ ہوا' خدا کا یہ سایہ ہوا تو وہ جو اوپر بیٹھا ہوا ہے وہ کتنا بڑا اور کتنا زور آور ہوا۔ بات یہ نہیں ہے کہ یہ بادشاہ خدا کا سایہ ہے بلکہ انہوں نے خدا کو اس بادشاہ کا سایہ بنایا ہوا ہے۔ جس قسم کا یہاں بادشاہ ذہن میں ہے' ویسا ہی اسے سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ یہ ہندوؤں کے دیوتاؤں کے بارے میں ہے کہ انسانوں کے دو دو ہاتھ تو جو دیویاں ہیں ان کے چار چار ہاتھ' راون کے دس سر تھے یعنی بڑا جو بنانا ہوا۔ تو وہ بہت بڑا بادشاہ ہو گیا۔ اب جو کچھ ایک بادشاہ کے متعلق ہے کہ عرش پہ تخت کے اوپر بیٹھا' حاجب اور دربان اس کے ارد گرد بیٹھے ہوئے ہیں' مصاحب بھی بیٹھے ہوئے ہیں' دور دور تک بچو ہٹو بھی ہو رہی ہے' اس تک عام کسی کی رسائی نہیں ہے۔ وہاں تک رسائی حاصل کرنا ہو تو ان وزراء میں سے' امراء میں سے' مصاحبین میں سے' کسی کی خوشامد کرو۔ یہ اللہ میاں کے لیے رشوت کا نام نہیں لیتے بلکہ کہتے ہیں کہ اس کی نذر نیاز مانگو' قصیدہ خوانی کرو' پھر اس کے دربار میں جا کر تمہاری درخواست پیش ہو' وہ بھی کسی کی وساطت سے کہ حضرت صاحب! ہمارے لیے بھی دعا کر دیجیے گا جب آپ اللہ کے ہاں پہنچیں۔ حضرت صاحب کی وساطت سے وہاں دعائیں کرائی جاتی ہیں۔ بعینہٖ جس طرح یہاں کا ایک مستبد بادشاہ ہوتا ہے تو بڑے پیمانے پر اس قسم کا خدا ہم نے بنا رکھا ہوا ہے۔

قرآن اسی لیے خدا کے تصور کے اوپر بار بار زور دیتا ہے اور بڑی تفصیل سے اس نے اس کا تصور دیا ہے کہ ایسا قاعدے قانون کا خدا کہ وہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے یہ قوانین بنائے ہیں لیکن ہم خود بھی ان کے پابند ہیں اور میں اپنے لیے بھی ان کو نہیں توڑتا۔ سوچیے کیا تصور آتا ہے خدا کا! اور اسی لیے وہ ٹھیک ہے کہ اس مغربی فلاسفر نے کہا تھا کہ اگر آپ مجھے یہ بتا دیں کہ فلاں قوم نے اپنے لیے اس قسم کا معبود تجویز کر رکھا ہے تو میں اس قوم کی تہذیب' تمدن' معاشرت ہر چیز تمہیں بتاؤں گا کہ کس قسم کی ہوتی ہے۔ خدا کا تصور کوئی چھوٹی چیز نہیں ہے۔ ہماری جو تباہیاں ہزار سال سے چلی آ رہی ہیں' اُن کا ایک بنیادی سبب یہ بھی ہے کہ ہم نے اپنے ہاں خدا کا غلط تصور رکھا ہوا ہے۔

## رضی اللہ عنہ کا قرآنی مفہوم

قرآن نے **صَالِحًا تَرْضٰهُ** (27:19) کہا ہے۔ اس میں لفظ ترضٰہ آیا ہے۔ اسی سے **رضی اللہ عنہ** وغیرہ کے الفاظ قرآن میں آتے ہیں۔ ان کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے کہ ''خدا کو راضی کر دیا جائے''۔ عزیزانِ من! خدا بگڑا ہوا نہیں ہوتا۔ ''رضی'' کے معنی ہم آہنگ ہونا ہوتا ہے۔ ہم اس کے جو قوانین ہیں' اس کی جو روش ہے' اس سے ہم آہنگ ہو جائیں' میرا ہر کام اس سے ہم آہنگ ہو جائے۔ تو

بات صاف ہوگئی۔ جو اس کا قانون ہے' جو اس کی مشیت ہے' اس کے مطابق میرا عمل ہو۔ آگے کہا کہ **وَاَدۡخِلۡنِیۡ بِرَحۡمَتِکَ فِیۡ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیۡنَ**(27:19)۔ اور اس طرح سے اپنی رحمت سے ان بندوں میں میرا شمار کر جن کے اعمال صالحہ ہوتے ہیں' جن میں صلاحیتیں برومند ہوتی ہیں۔ صالح کے معنی ہوتے ہیں سنوارنے والا' جو اپنی ذات کو بھی سنوارنے والے ہیں اور حسنِ کائنات میں بھی مشاطگی کرنے والے ہیں' تُو ان بندوں میں میرا شمار کر۔ کتنا بڑا اولوالعزم نبی ہے' اتنی بڑی مملکت کا مالک بادشاہ ہے اور درخواست یہ کرتا ہے کہ میرا شمار ان بندوں میں کر دے جن کے اعمال صالحہ ہوں۔

## مروجہ تراجم کی کیفیت سے پیدا ہونے والا تصورِ خدا

اب آگے آیئے' کہا کہ **وَتَفَقَّدَ الطَّیۡرَ** (27:20)۔ اس نے کہا کہ وہ لشکر و سپاہ تو آ گئی' وہ جو گھوڑوں کا رسالہ ہے' وہ ابھی تک نہیں آیا۔ اب وہی طیر کا ترجمہ انہوں نے پرندے کیا اور کہا کہ باقی تو سب آ گئے ہیں اور پرندے نہیں آئے تو ان کو بلاؤ۔ قرانِ کریم میں ہی دوسرے مقام پہ یہ لکھا ہے کہ گھوڑے تھے جن کو حضرتِ سلیمانؑ نے بلایا تھا۔ ان کی Inspection (معائنہ) کی تو وہ جو تھپکی دیتے ہیں اپنے ہاتھ سے گھوڑے کو' وہ تھپکی بھی دیتے گئے' یہ کہتے ہوئے ان کے گرد و غبار جھاڑتے گئے کہ یہ بھی مجاہدین ہیں اور مجاہدین کی تکریم و تعظیم نہایت ضروری ہے۔ اتنا بڑا بادشاہ' اتنا بڑا رسول' جہاد میں حصہ لینے والے گھوڑوں کی مالش خود کر رہا ہے۔ قرآن میں یہ چیز موجود ہے' گھوڑوں کا رسالہ لکھا ہے' یہ چیز لکھی ہوئی ہے۔ وہاں آؤں گا تو پھر بتاؤں گا کہ اس کے بعد انہوں نے اس کی کیا چیستاں بنائی کہ اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ گھوڑوں کو مالش کرتے ہوئے' Inspection (معائنہ) کرتے ہوئے' ان کی عصر کی نماز قضا ہوگئی اور اس پہ جو غصہ آیا تو سب گھوڑوں کی ٹانگیں کاٹ دیں۔ کیا بات ہے بادشاہ جو ہے!!

## ہدہد کون تھا اور حضرت سلیمانؑ نے اس کی غیر حاضری کو کیسے محسوس کیا؟

انہوں نے کہا کہ وہ (ہُدہُد) نہیں آئے۔ بہرحال جب وہ بھی آ گئے تو کہا کہ **فَقَالَ مَا لِیَ لَاۤ اَرَی الۡہُدۡہُدَ اَمۡ کَانَ مِنَ الۡغَآئِبِیۡنَ** (27:20)۔ یعنی لشکر کشی ہو رہی ہے اور کوچ کا وقت آ رہا ہے اور آگے بڑھنا ہے تو ظاہر ہے کہ انچارج کو ایک ایک چیز کا نوٹس لینا ہوگا کہ ہر شے اپنے اپنے ٹھکانے پہ ہے' ہر شخص موجود ہے۔ باقی سب کو دیکھا۔ اب آ گیا کہ وہ ہدہد ''آ ٹیڑا جنوں کیندے نیں''[1] کہ باقی تو یہ سب لشکر و شکر آ گئے یہ ٹیڑا نہیں ایا۔[2] کیا بتائیں!! اپنے ہاں یہ ہدہد کو ٹیڑا کہا ہے۔ کوئی انگریزی ترجمہ اٹھایئے'

---

[1] یہ وہی ہے جسے تیتر کہتے ہیں۔

[2] یہ تیتر نہیں آیا۔

ان کو خدا دے‘ ان کو ہی نہیں‘ یہ اپنے ہاں بھی جو آپ کے ہاں ہمارے ہاں‘ کے مسلمانوں نے جو ترجمے کیے ہوئے ہیں‘ اُن میں بھی یہی پرندہ یہ ہدہد ہی لکھا ہوا ہے۔ تو ساری دنیا میں یہ چیز چلی ہوئی ہے کہ جو سلیمانؑ تھے وہ سب سے آگے پوچھتے تھے کہ پورا لشکر تیار ہے اور وہ ہدہد نہیں آیا‘ وہ کہاں ہے؟ **لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاْذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ** (27:21) کہاں ہے وہ؟ غائب ہے وہ‘ نظر نہیں آتا‘ بغیر اجازت کے کہیں چلا گیا ہے؟ اگر اس نے آ کر صحیح Explanation (وضاحت) نہ دیا‘ ایسے نازک وقت کے اندر موجود نہیں ہے کہ اس وقت اس کی بڑی ضرورت ہے‘ اگر اس نے سرکشی برتی ہے تو میں اس کے قتل کا حکم بھی دے سکتا ہوں‘ میں اس کو سزا بھی دے سکتا ہو۔ معلوم کرو کہ وہ کہاں ہے۔ اب ہمارے ہاں اس کے معنی یہ کیے کہ میں اس کے پر نوچ دوں گا اور پھر آگے **اذبحنہ** ہے۔ اگر جرم زیادہ سخت ہوا تو اس کو ذبح بھی کر سکتا ہوں۔ وہ تو ہر چڑی مار روز ذبح کرتا ہے۔ مجھے‘ عزیزانِ من! اس پہ افسوس نہیں ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہم دنیا میں اس قرآن کو کس طرح سے پیش کر رہے ہیں‘ دنیا کی قومیں اسے کیا سمجھیں گی‘ اس کے اوپر ذرا نگاہ نہیں جاتی۔ پہلے مفسر نے یہ ٹیڑا لکھ دیا اور اس کے اوپر آج تک چلا ہوا ہے۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ دنیا کی قوموں میں پرندوں کے‘ جانوروں کے‘ نام انسانوں کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ یہ عام رواج تھا۔ تورات میں جو کتابِ سلاطین ہے‘ اول ہے‘ اس میں ارم کا ایک بادشاہ ہے‘ اس کا نام ابنِ ہدہد ہے۔ یہ جو آگے جائیں گے‘ یہ سبا کی ملکہ ہے جس کا نام انہوں نے بلقیس بتایا ہوا ہے‘ اس کے باپ کا نام ہدہد ہے۔ نظر آتا ہے کہ یہ عام طور پر نام رکھا جاتا تھا۔

## ہدہد کے غائب ہونے کی وجہ

ہُدہُد کون تھا؟ ابھی آگے چل کر بات آتی ہے۔ کیوں اسے اتنی اہمیت دی جا رہی تھی؟ کیوں لشکر روک دیا گیا تھا؟ کیوں یہ چیز تھی کہ وہ کہاں ہے اس کی تو اس وقت بڑی ضرورت تھی‘ وہ بغیر اطلاع کے چلا گیا؟ وہ غائب کیوں ہے؟ ایسے وقت میں اگر اس نے ایسا کیا ہے اور اگر میں نے دیکھا کہ اس کے اندر کوئی سازش ہے یا خود اس نے غفلت برتی ہے تو میں اس کو سخت سزا دوں گا۔ **فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ** (27:22) تھوڑا سا ہی وقت گزرا تھا کہ وہ آ گیا۔ اب نظر آتا ہے کہ اس شخص کی کتنی اہمیت تھی۔ یہ وہاں کی انٹیلی جنس کا ہیڈ نظر آتا ہے۔ محکمہ سراغ رسانی کا ہیڈ (سربراہ) اور واقعی اس کی اس وقت بڑی ضرورت تھی۔ وہ آیا۔ **فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ** (27:22) کہا کہ میں وہ معلومات لایا ہوں جو اس سے پہلے موجود نہیں تھیں۔ وہ معلومات لے کر آ رہا ہے۔ **وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ** (27:22) یہ جو سبا کی مملکت ہے جس کی طرف ہم رخ کیے ہوئے ہیں‘ میں اس کے اندرونی حالات معلوم کر کے چلا آ رہا ہوں اور وہ حالات بھی سنی سنائی خبر نہیں ہیں‘ آج کل کے اخباروں کی رپورٹنگ نہیں ہے۔ **نبا یقین** ہے۔ یقینی طور پہ میں وہ خبر دینے آیا ہوں‘ میں خود دیکھ کر آیا ہوں‘ میں پوری رپورٹ پیش کرنے کے لیے آیا ہوں۔ یہ بڑی ضروری چیز تھی کہ جس ملک پر لشکر کشی ہو رہی ہے‘

وہاں کے جو اندرونی حالات ہیں وہ معلوم ہوں۔ اب آپ دیکھ لیجیے کہ وہ ہدہد یہی ٹیڑا تھا تو کیا وہ یہ کچھ تھا جو وہ کرنے کے لیے آیا تھا؟

## ملکہ سبا کی ملکی کنٹرول کی روئیداد اور عرش کے مفہوم کے برعکس مروجہ تفسیری بیان

قرآن نے بتایا کہ ھدھد نے خبر دی کہ اِنِّیۡ وَجَدۡتُّ امۡرَاَۃً تَمۡلِکُھُمۡ وَاُوۡتِیَتۡ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ وَّلَھَا عَرۡشٌ عَظِیۡمٌ (27:23)۔ میں نے وہاں دیکھا یہ ہے کہ ان کی ملکہ ہے' ملک ہے جس میں خدا نے ان کو سب کچھ دے رکھا ہے' ان کا نظم ونسق' کنٹرول بھی بہت بڑا ہے۔ یہاں یہ جو عرش کا لفظ ہے یہ مجازی طور پہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ تخت کے لیے بولا جاتا ہے' یہ بھی ٹھیک ہے کہ پہلے زمانے میں تخت بھی وہ سچ مچ کا ایک محسوس تخت ہوتا تھا جس پہ بادشاہ بیٹھتا تھا لیکن اب تو وہ تخت بھی نہیں' تاج بھی نہیں' صرف الفاظ باقی ہیں۔ آج بھی خواہ وہ Court Ceremony ہو' تو اس کو تخت نشینی ہی کہتے ہیں۔ ''تختہ الٹنا'' آج بھی اس کے لیے آتا ہے جب کسی کی سلطنت الٹ دی جائے یا نظام الٹ دیا جائے۔ یہ لفظِ عرش جو ہے اگر وہ بادشاہ کا محسوس تخت ہے تو وہ تخت ہے ورنہ یہ حکمرانی کے نظم ونسق کی' کنٹرول کی علامت ہوتی تھی۔ اب جب یہ لفظ خدا کے لیے آتا ہے کہ عرشِ عظیم پہ متمکن ہے تو وہ بات نہیں ہے کہ وہ ایک بہت بڑا تختِ طاؤس ہے اور اس پہ بھی کوئی بڑا تخت بنا ہوا ہے اس کے اوپر خدا بیٹھا ہوا ہے۔ آپ کے ہاں تو تفسیر میں یہی ہے۔ اس عرش کی تفسیر یہ ہے کہ یہاں سے پہلے آسمان کا فاصلہ پانچ سو میل کا' پھر دوسرے آسمان کا فاصلہ' دوسرے سے تیسرے آسمان کا فاصلہ' اور یہ چلتا چلتا اوپر گیا' آخری آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے۔ وہ اتنا گہرا ہے۔ اس سمندر کے اندر آٹھ پہاڑی بکرے ہیں۔ وہ اتنے اتنے بڑے ہیں کہ یہ جو سمندر ہے اس کا پانی ان کے گھٹنوں تک آتا ہے۔ ان پہاڑی بکروں کے سینگوں کے اوپر' خدا کا عرش ہے اور اس عرش کے اوپر خدا بیٹھا ہوا ہے۔ آپ کے ہاں کی یہ حدیث ہے۔

## اس قسم کی تفسیریں مذہب کی بنیاد پر ہوئیں

اب میں یہ عرض کروں گا کہ واقعی آپ احباب کے دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کی باتیں تفسیر میں کیسے آئیں؟ پہلی تفسیر جو آپ کے ہاں لکھی گئی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے اڑھائی سو سال کے بعد لکھی گئی ہے۔ اسی طرح ایک تاریخ طبری ہے۔ اس نے یہ کیا۔ [1] یہ طبری طبرستان کا رہنے والا شیعہ ہے اور سنیوں کا امام بھی ہے۔ اس نے کیا یہ کہ قرآن کی یہ آیتیں لیں اور جو اس قسم کی وضعی حدیثیں تھیں' کچھ موجود تھیں' اور کچھ خود بنالیں' پھر ہر آیت کی تائید میں وہ حدیث لکھ دی اور کہا کہ اس لفظ کے یہ معنی ہیں۔ جب آگے اس کے بعد والے حضرات آئے تو انہوں نے دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے یہ معنی بتا دیئے ہیں تو پھر کس کی جرأت ہے کہ

---

[1] یہ ہے علامہ ابی جعفر محمد بن جریر الطبری (المتوفی 310ھ)۔ یہ طبرستان کے رہنے والے تھے۔ انہی نے 13 جلدوں پر مشتمل تاریخ طبری'' تحریر کی اور 30 جلدوں پر مبنی قرآنِ کریم کی پہلی تفسیر۔

اس کے خلاف کوئی معنی لے یا اس پر اعتراض کر سکے۔ اب وہ طبری کی تفسیر نہ رہی' اس نے وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر بنا کر پیش کر دی۔ جہاں خدا کا عرش آیا تو اس کے ساتھ اس نے یہ حدیث لکھ دی۔ نظر آتا ہے کہ یہ زیبِ داستان کے لیے بنائی ہوئی چیز ہے۔ لیکن جب انہوں نے کہہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے عرش کی یہ تفسیر کی ہے تو کس کی جرأت ہے کہ اس سے انکار کرے۔ وہ وہاں سے تفسیر چلی ہوئی ہے۔ جب یہ تفسیر چلی' جب ہمارے یہ تراجم ہوئے تو وہ اسی کی رو سے ہونے تھے۔ جب ترجمہ یہ ہوا تو پھر اس کے Translation (تراجم) اس تفسیر کے مطابق ہوئے۔ یوں ہیں یہ ساری چیزیں جو پھیلی ہوئی ہیں۔ اب اسی زبان میں انہی کے ہاں عرش کو Symbol (علامت) قرار دیا جاتا ہے اور اس کے معنی مرکزی کنٹرول (Central Authority) ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! قرآنِ کریم میں یہ ہے کہ خدا نے اس کائنات کو پیدا کیا۔ **ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ** (57:4) اس کا مرکزی کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا۔ بات بالکل صاف ہے۔ لیکن یہاں تو پھر اس طرح سے وہ عرش آسمان تک پہنچایا اور اس سمندر کے اندر بکرے کھڑے کیے اور ان کے سینگوں کے اوپر وہ ایک تخت بنا کر رکھا' اس کے اوپر خدا کو بٹھایا تو یہ عرشِ عظیم ہو گیا۔ یہاں کہا ہے کہ **وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ** ❶ (27:23)۔ ٹھیک ہے اس زمانے کے بادشاہوں کے لحاظ سے تخت بھی اس کے معنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس نے آگے جو بات کہی ہے وہ بڑی اعلیٰ ہے۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہے کہ اس (ملکہ سبا) کا تخت' جس کے اوپر وہ بیٹھی ہے' بہت بڑا ہے۔ اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے بلکہ اہمیت اس بات کی یہ ہے کہ اس کا کنٹرول بہت بڑا ہے' نظم ونسق بہت عمدہ قسم کا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ہر شے بھی وہاں موجود ہے' سامان بھی وہاں موجود ہے' ساز وبراق بھی موجود ہے اور کنٹرول بھی بڑا ہے۔ ابھی ہم دیکھیں گے کہ آگے جا کر قرآن اس کی وضاحت کرتا ہے کہ اس کا نظم ونسق کس قسم کا تھا۔

## ملکہ سبا کی قوم کی ذہنی پسماندگی ناگفتہ بہ تھی

اس (ہُدہُد) نے کہا کہ میں نے دیکھا ہے کہ اس کی مملکت بھی عظیم ہے' ساز وبراق بھی بہت ہے' کنٹرول بھی بڑا ہے لیکن تو ہم پرستی کی کیفیت یہ ہے کہ **وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (27:24) وہ سورج کی پرستش کرتے ہیں' اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ خدا کے حضور سجدہ ریز نہیں ہوتے۔ تو اس نے یہ بتا دیا کہ یہ سب کچھ تو معلوم ہے' ابھی ذہنی طور پہ ان کی سطح یہ ہے کہ وہ توہم پرستی کے اندر گرفتار ہیں' سورج کو سجدہ کرتے ہیں۔ یہ تو توہم پرستی ہے۔ دیدہ ور تو کسی اور بات سے

---

❶ اُس کا اندرونی نظم ونسق اور کنٹرول بھی بڑا عظیم الشان ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص865)۔ نیز ملکہ سبا اور اس کی قوم کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ المؤمنون' ادارہ طلوع اسلام' رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص185 تا186' کافٹ نوٹ 4

بھی دور تک پہنچ جاتے ہیں۔

## کسی قوم کی بدذوقی کو ماپنے کا ایک پیمانہ یہ بھی ہے

جب بابر [1] یہاں ہندوستان میں آیا تو چند رفقا اس کے ساتھ تھے۔ اپنی بادشاہت قائم کرنے کے لیے وہ یہاں پہنچا' صحیح بات تو یہ ہے کہ وہ پہنچا تو شاید پناہ لینے کے لیے تھا۔ یہاں آ کر اس نے اندازہ لگایا کہ اس ملک کو فتح کر لینا بہت آسان ہے۔ اس نے خود اپنی سرگزشت لکھی ہوئی ہے۔ وہ وہاں ہے اور پیچھے ان کا کوئی دوست ہے یا کوئی عزیز ہے جس کے ساتھ راہ و رسم ہے۔ وہ یہاں کے حالات لکھتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اس قوم کا فتح کر لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ دو چار باتیں اور بھی لکھیں۔ اُس نے لکھا ہے کہ اس قوم کی بدذوقی کی کیفیت یہ ہے کہ دریا کے کنارے مکان بناتے ہیں اور دریا کی طرف مکانوں کی پشت رکھتے ہیں۔ جن کی ذہنی سطح یہ ہو' ان کو فتح کرنا کیا مشکل ہے۔ کیا بات ہے! اور واقعی ہر میدان میں اس نے ان کو مارا ہے اور وہ مملکت قائم کی جو تین سو سال تک یہاں قائم رہی۔ اس نے یہ بھی ایک وجہ لکھی ہے۔ اس کی نگاہ بڑی دور تک جاتی ہے۔ آپ اندازہ لگائیے۔ وہ یہاں آ کر چار سال [2] زندہ رہا تھا' اس کی [3] تزک کو پڑھیے' اتنی تفصیل اس نے لکھی ہے اور اتنی گہرائیوں میں گیا ہے۔ یونہی آ کر دوسرے ملکوں کو فتح نہیں کر لیا جاتا۔ اس ہُدہُد نے بھی یہ بات کہی کہ یہ سب کچھ وہاں ہے' ساز و یراق بھی وہاں موجود ہے' نظم و نسق بھی حکومت کا موجود ہے لیکن ذہنی سطح کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ جو سورج ہے' یہ تو قدرت کے قاعدے کے مطابق چڑھتا ہے اور ڈوبتا ہے۔ وہ اسے خدا بنائے ہوئے ہیں۔ **وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ** (27:24)۔ یہ ہیں ان کے سطحی جذبات جن کے تابع وہ اپنا یہ مسلک اختیار کیے ہوئے ہیں۔ **فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ** (27:24) جو شرفِ انسانیت کا صحیح راستہ ہے وہ ان کے سامنے نہیں ہے۔ جب وہ مقامِ انسانیت کو نہیں پہچانتے تو ایسی قوم کا فتح کر لینا مشکل کیا ہے۔ کیا دلائل ہیں ہدہد کے! وہ صرف وقائع نویسی نہیں کر رہا کہ وہاں کے واقعات کی رپورٹ بھی دے رہا ہے' وہ گہرائیوں میں جا کر یہ چیزیں بھی بیان کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ عجیب بات ہے کہ اُن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی۔ **اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ** (27:25) حیرت ہے کہ وہ سورج جیسی پابندِ قانون چیز جو اس کے قانون میں جکڑا ہوا ایک کرّہ ہے' اس کو معبود بنائے ہیں۔ خدا کو معبود نہیں بنایا ہوا۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ جو کچھ ارض و سما کے اندر پوشیدہ ہے وہ ان کو بھی باہر نکال سکتا ہے' وہ دلوں میں

---

[1] بابر (1483-1530A)۔ ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا بانی' پہلا شہنشاہ (1526-1530AD)۔ اس کا اصل نام ظہیر الدین محمد تھا۔

[2] 1526-1530ء

[3] وہ ہے تزکِ بابری۔

چھپے ہوئے خیالات کو بھی ڈھونڈ نے والا ہے تو اس خدا کو چھوڑ کر وہ سورج کی پرستش کرتے ہیں۔ کہا کہ اس کا عرش عظیم ہے' اسے یہ معلوم نہیں ہے کہ اَللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ (27:26)۔اسے اپنے عرشِ عظیم پہ بہت ناز ہے۔ اسے معلوم نہیں ہے کہ صحیح معنی میں کائنات کے اندر عرشِ عظیم صرف خدا کا ہے اور اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک رسول یا نبی کو بھی مملکت حاصل ہے تو اس مملکت میں اربابِ دانش ومصاحب' وزراء' امراء' افسران' کی نگاہ کس قسم کی ہے' وہ اپنے گردوپیش کس قسم کے لوگوں کو رکھتے ہیں۔ یہ تھی اس کی نگاہ کہ ٹھیک ہے اس کا عرشِ عظیم بہت بڑا ہے لیکن اسے پتہ نہیں ہے کہ اصل حقیقت میں جو عرشِ عظیم ہے وہ کس کا ہے' وہ اَللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ (27:26) ہے۔ اس نے یہ رپورٹ دی۔ حضرت سلیمانؑ نے سنا اور غور کیا۔

## حضرت سلیمانؑ کی بصیرت اور ایک حسین تدبیر

اب حضرت سلیمانؑ کا یہ تدبر دیکھیے۔ ایک فردِ واحد کی رپورٹ ہے' یقیناً قابلِ اعتماد ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ اس کے اوپر کلیتاً اعتماد کر لیا جائے اور اسی پہ فیصلہ کر دیا جائے بلکہ اور ذرائع بھی استعمال کرنے چاہئیں۔ بڑی صحیح بات کہی ہے۔ دیکھا آپ نے کہ یہ ان بادشاہوں کے اوران رسالوں کے یہ ان باتوں کے تذکرے کیوں آرہے ہیں قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ کُنْتَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ (27:27) کہنے لگے کہ اس کی بھی تحقیق کر لینی چاہیے۔ میں ابھی تحقیق کر لیتا ہوں کہ تم صحیح کہتے ہو یا اس میں کوئی بات غلط ہوگئی ہے۔ غلطی پر مبنی جو فیصلہ ہے وہ آخر الامر نقصان پہنچائے گا اس لیے حسنِ تدبیر کا تقاضا یہی ہے کہ ذرا اس کو کسی اور ذریعے سے میں ٹیسٹ کر لوں کہ بات کیا ہے۔

## ملکہ سبا کی نظر میں حضرت سلیمانؑ کی چٹھی کی اہمیت

کہا کہ یہ ختم کرو اِذْھَبْ بِکِتٰبِیْ ھٰذَا فَاَلْقِہْ اِلَیْھِمْ (27:28) ہماری یہ چٹھی لے جاؤ۔ قرآن نے ''الیھم'' کہا ہے۔ یہی نہیں کہا کہ اس ملکہ کو چٹھی دو بلکہ اس کے سارے مصاحب' وزراء' امراء' اربابِ اقتدار' اربابِ حل وعقد' ان سب کے متعلق کہا کہ جاؤ میں نے ان کی طرف یہ چٹھی لکھی ہے' چٹھی ان کو دو۔ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْھُمْ فَانْظُرْ مَاذَا یَرْجِعُوْنَ (27:28) چٹھی دے کر آپ ذرا پیچھے ہٹ جانا اور یاد کرتے رہنا کہ ان کا Reaction (ردِعمل) کیا ہوتا ہے۔ کیا بات ہے! چٹھی لے گئے وہ ہدہد' چٹھی ان کو دی۔ قَالَتْ یٰٓاَیُّھَا الْمَلَؤُا اِنِّیْٓ اُلْقِیَ اِلَیَّ کِتٰبٌ کَرِیْمٌ (27:29) کہا کہ اے میرے مشیرو اور وزیرو' اے سرادرانِ قوم! میرے پاس ایک خط آیا ہے۔ خط بتا رہا ہے کہ بڑے ہی کسی شریف النفس انسان نے لکھا ہے۔ یہ فرق ہے' عزیزانِ من! اتنا بڑا حکمران جنود

عسا کر لیے آ رہا ہے اور مخالف اس خط کے متعلق یہ کہہ کر پکارتا ہے کہ یہ **کِتٰبٌ کَرِیمٌ** (27:29) ہے۔ خط بتا رہا ہے کہ لکھنے والا کتنا صاحب تکریم ہے' کیسا شریف واقع ہوا ہے! مخالف یہ کہہ رہا ہے۔ ایک وہ بادشاہتیں بھی ہیں' ایک وہ حکومتیں بھی ہیں کہ دشمن تو ایک طرف دوستوں کو ذلیل کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ وہاں مخالف کو بھی خط لکھ رہا ہے تو وہ مخالف کہہ رہا ہے کہ یہ **کِتٰبٌ کَرِیمٌ** ہے۔ کس انداز کا خط تھا! **اِنَّهٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ** (27:30) یہ سلیمانؑ کی طرف آیا ہے۔

## بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا قرآنی مفہوم

**وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ** (27:30)۔ قرآنِ کریم میں' عزیزانِ من! **بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ** صرف اسی ایک مقام پر اس طرح اکٹھا آیا ہے۔ [1] یوں تو یہ ہر سورۃ کی ابتدا میں (سوائے سورۃ توبہ کے) لکھے ہوئے ہوتے ہیں لیکن قرآن کے Text (متن) میں صرف یہیں یہ الفاظ آئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بات میں سے بات ہوئی ہے تو یہ بات بھی ہو ہی جائے کہ یہ **بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ** ہے کیا بات؟ ہر کام کے آغاز میں ہم یہ کہتے ہیں اور اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ''میں شروع کرتا ہوں ساتھ نام اللہ کے جو رحمٰن و رحیم'' ہے۔ رحمٰن ہے رحیم ہے کا بھی ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ''جو مہربان ہے' بڑا مہربان ہے' Compassionate & Merciful انگریزی میں ترجمہ ہو جاتا ہے' میں شروع کرتا ہوں ساتھ نام اللہ کے۔ ''شروع کرتا ہوں'' صرف اس میں آتا ہے۔ یہ اس جملے میں الفاظ نہیں ہیں' اس میں ''شروع کرتا ہوں'' لفظ نہیں ہیں کیونکہ اس کے علاوہ ذہن کسی اور طرف جاتا نہیں تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ساتھ نام اللہ کے جو رحمٰن اور رحیم ہے' اس سے تو بات بنتی نہیں ہے۔ تو اس کے ساتھ اپنی طرف سے' یہ جو الفاظ تھے وہ کہہ دیئے کہ میں ''شروع کرتا ہوں'' ساتھ نام اللہ کے۔ اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں' بات کیا ہوئی؟ ٹھیک ہے ثواب کی خاطر تو ذہن میں یہ چیز آ جاتی ہے' عقیدت کی رو سے تو آیا کہ صاحب! خدا کے نام سے شروع کرنا چاہیے' اس میں برکت ہوتی ہے۔ اس کا کوئی متعین مفہوم نہیں اور خدا کے نام سے برکت کا بھی کچھ پتہ نہیں ہے۔ یہ سب ذہنی چیزیں ہیں۔ عزیزانِ من! قرآن میں صرف ذہنی چیزیں نہیں ہیں' قرآن کے مفاہیم متعین ہیں اور وہ عملاً ان چیزوں کو بتاتا ہے کہ یہ ہے کیا۔ عربی زبان میں ''اسم'' کے معنی نام ہی نہیں ہوتا بلکہ نام تو اس کا ترجمہ بعد میں ہوتا ہے' اس کا معنی ہوتا ہے ''صفت''۔ خدا کی صفاتِ

---

[1] اس کے مفصل مفہوم کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ الفاتحۃ' ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور' 2007ء' ص ص۔ 73 تا 76۔

حسنہ جو قرآن کے اندر مذکور ہیں: **لہ الاسماء الحسنی** ( 59:24 ) خدا ایک ذات ہے' اس کی کنہ وحقیقت کو کوئی نہیں جانتا' ہم بھی نہیں جان سکتے' کوئی نہیں پہچان سکتا' یہ معرفت وغیرہ سب بعد کی ایجاد کی ہوئی چیزیں ہیں۔ خدا کی معرفت نہیں ہوسکتی۔ ذاتِ خداوندی کی کنہ وحقیقت کوئی نہیں جان سکتا۔ اس نے جو اپنی صفات بتائی ہیں کہ رزاق ہے' **عالم** ہے' **خالق** ہے' **علیم** ہے' **رحیم** ہے' تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کیسا ہے۔ رحمٰن اور رحیمیت کی بنیاد ہی اس کے مادہ ''رح م'' سے شروع ہوتی ہے۔

## لفظ رحیم کے سلسلہ میں رحمِ مادر کی ایک روشن مثال

رحمِ مادر تو آپ نے سنا ہوگا۔ اس پرورش کی بنیاد وہاں ہے۔ دیکھیے کہاں بات جا پہنچتی ہے! یعنی اس انداز کی پرورش کرنے والا جیسے رحمِ مادر میں بچے کی پرورش ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! ایک لفظ کے اندر آپ سوچیے تو سہی کہ ایک دنیا اس کے اندر سمو کر رکھ دی ہے۔ اس سے بہتر پرورش کا اور کوئی تصور ہی نہیں ہوسکتا۔ رحمِ مادر میں ماں بغیر کسی معاوضہ یا جزا کے تصور کے بچے کی پرورش کر رہی ہوتی ہے' اپنے جسم کا خون دے دیتی ہے' اپنے جسم کے حصے دے دیتی ہے۔ یہ بچہ کس چیز سے وہاں بنتا ہے؟ کیا آپ باہر سے چیزیں بھیجے چلے جا رہے ہوتے ہیں کہ وہ کمہار کی طرح کا کالا کا کچھ بناتا ہے۔ ماں کے جسم کے یہ حصے ہوتے ہیں' اس کی یوں گوشت کیلشیم ہڈیاں بن رہی ہیں۔ اپنا سارا جسم انڈیل انڈیل کر ایک بچہ بناتی چلی جاتی ہے بغیر کسی صلے کی تمنا کے' جزا کی خواہش کے۔ اگر ڈاکٹر اس کو بتاتے ہیں کہ بچے کی ہڈیاں کمزور ہیں تو یہ زیادہ کیلشیم کھاتی ہے۔ یہ ماں زیادہ سے زیادہ دودھ جو پی رہی ہوتی ہے تو اپنے لیے نہیں پی رہی ہوتی بلکہ اس بچے کی پرورش کرنے کے لیے پی رہی ہوتی ہے' اسی لیے خود کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جاتی ہے' زرد رو ہوتی چلی جاتی ہے' ہمت نہیں رہتی لیکن اس کی پرورش اور اس کی حفاظت جو ہے اس پہ ساری توجہ مرکوز ہوتی ہے بغیر کسی صلہ کی امید کے۔ یہ رحم دیکھیے صاحب! یعنی اندازہ لگائیے! پہلے تین مہینے تو چلیے چھوڑ دیجیے' تقریباً چھ مہینے کے بعد بچہ بن جاتا ہے۔ وہ رحم اتنا لچکدار ہوتا ہے کہ وہ اس کے اندر پاسے وانسے بھی پلٹتا رہتا ہے۔ اگر وہ کہیں سوکھی ہوئی کھال کا ہو تو بچہ چھل کے ہی مر جاتا ہے۔ ''اوپا سے پلٹدا رہندا اے اوہدے اندر''۔ [1] لوچ اور لچک اتنی کہ جس طرح جی چاہے وہ لیٹے' وہ اسی قسم کا بن جاتا ہے۔ ان الفاظ پہ غور کرتے چلے جائیے۔ بلا مزد ومعاوضہ اس انداز کی پرورش کہ جس جس چیز کی اسے ضرورت ہے وہ مہیا ہوتی چلی جاتی ہے' بغیر مانگے ہوئے ملتی ہے' بغیر کوشش کیے ملتی ہے۔ اس میں لوچ اور لچک اتنی ہے کہ جس قسم کی آسائش اس کو چاہیے وہ آسائش اسے مہیا کی جاتی ہے۔ یہ ہے ''رح م''۔ اور یہاں سے ہے خدائے رحیم اور رحمٰن۔ پھر یہ کہ یہ رحمٰن اور رحیم دو الفاظ کیوں ہیں: یہ ہے عربی زبان۔

---

[1] وہ اس کے اندر پہلو بدلتا رہتا ہے۔

## رحمٰن کا قرآنی مفہوم

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میں درس میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ عربی زبان بڑی سائنٹفک زبان ہے۔ مادہ (Root) تو اس میں عام طور پہ تین ہی حرفوں کا ہوتا ہے' لیکن بنیادی معنی اس کے اندر رہوتے ہیں جیسے یہ رحم تھا۔ اس کے بعد اس کے مختلف باب یا اوزان [1] ہوتے ہیں۔ اسی مادے کے معنی مختلف ابواب میں آتے ہیں تو ان کے اندر کچھ عجیب خصوصیت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ ''رح م'' [2] کے مادے سے رحمٰن فعلان کے وزن پہ ہے اور رح م ہی کے مادے سے رحیم فعیل کے وزن پہ ہے۔ عربی زبان میں ہر وہ لفظ جو فعلان کے وزن پہ آئے گا تو اس کے معنی ہوتا ہے کہ ''کوئی چیز جو Emergency (ہنگامی) کے طور پر ''یکا یک کرنی ہو'' وہ اس وزن کے اوپر آئے گی اور کوئی شے جو مسلسل کیے جانی ہو تو وہ فعیل کے وزن کے اوپر آئے گی۔ رحیم تو وہ پرورش ہے جو نارملی عام معمول کے مطابق ہوتی چلی جاتی ہے۔ اگر کہیں کوئی حادثہ ہو گیا ہے' بچے میں خاص طور پہ کسی چیز کی Deficiency (کمی) ہو گئی ہے تو اس چیز کو Emergentally اچانک دفعتاً پورا جو کرنا ہے تو اس کے لیے رحمٰن آئے گا۔ اور جو اس کی نارمل نشوونما ہو رہی ہے اس کے لیے رحیم آئے گا۔ یہ عربی زبان ہے' قرآن ہے' عزیزانِ من! اور پھر رحیم اور رحمٰن اور بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ رحمٰن اور رحیم ہے۔ جب ان لفظوں کے اوپر ال لگتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جس انداز کا یہ کرتا ہے کوئی دوسرا ایسا نہیں کر سکتا۔ یہ The Rehman, The Raheem بن جاتا ہے۔ اسم کے معنی صفت ہے۔ خدا کی صفتِ رحمانیت اور رحیمیت یہ ہوئی۔

یہ جو ''ب'' ہے عربی زبان میں اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس مقصد کے لیے' اس واسطے۔ تو اب بات یہ آئی کہ یہ جو پروگرام میرے ہاتھ میں ہے میں نے اسے اس لیے ہاتھ میں لیا ہے' میں اس پہ اس لیے گامزن ہو رہا ہوں کہ خدا کی صفتِ رحمانیت اور رحیمیت کا ظہور ہو جائے۔

میں نے آپ کو بتایا ہے کہ خدا کی صفات کا ظہور (Manifestation) انسانوں کی دنیا میں انسانوں کے ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ خدا براہ راست انسانوں کی پرورش نہیں کرتا۔ اس نے اپنے آپ کو رازق اور رزاق کہا ہے' خود کسی کو آ کر روٹی نہیں دیتا۔ اس کے نام پر جو یہاں نظام قائم کرتے ہیں' مملکت قائم کرتے ہیں تو ان کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ خدا کی صفتِ رزاقیت کو عملاً نمود میں لائیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو خدا کے نام پہ مملکت قائم کرنے کا انہیں کوئی حق نہیں ہوتا۔ انسانوں کی دنیا میں یہ صفاتِ رحیمیت اور رحمانیت

---

[1] پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ الانبیاء' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005 ص ص۔ 20 تا 21۔۔

[2] ان کی تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورہ الفاتحۃ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص ص۔ 107 تا 108۔

انسانوں کے ہاتھوں سے نمود میں آئیں گی۔ اب بات صاف ہوگئی ہے کہ آپ کوئی پراجیکٹ' کوئی پروگرام' کوئی لائحہ عمل' کوئی کام شروع کرنے لگیں تو اعلان کیجیے کہ اس سے میری اپنی کوئی غرض نہیں ہے' میرا اپنا کوئی مفاد نہیں ہے بلکہ میں اسے اس لیے ہاتھ میں لے رہا ہوں کہ خدا کی صفتِ رحمانیت اور رحیمیت کا ظہور ہو جائے۔ اب اس میں آپ دیکھیے' عزیزانِ من! کہ جو ہمارے لیے ہے کہ جو بھی کام شروع کرو تو اس سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہو' تو وہ ہمارے ہاں ''کہو'' ہی رہ گیا ہے۔ یہ الفاظ کہہ دو بس' نہ مفہوم ذہن میں' نہ یہ کہ یہ عملاً کچھ کرنے کی بات ہے۔

## صدیوں سے ہم نے قرآنِ حکیم کو بغیر سمجھے پڑھنے تک ہی محدود کر رکھا ہے

عزیزانِ من! اس دن ہماری قوم اور ملت کی گاڑی دوسری پٹڑی پہ پڑ گئی جس دن ہم نے ''کرنے'' کی جگہ ''پڑھنا'' کہنا اور بولنا Substitute کر دیا۔ یہ کرنے کی بات (Doing) ہے' قرآن نے عملِ صالح کہا ہے' صلاحیت بخش کام کہا ہے۔ اس میں ہر چیز کرنے کی ہے۔ پڑھنا اس لیے ہے کہ جیسے کوئی ایک فارمولا پڑھا جاتا ہے تاکہ لیبارٹری میں اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اور اگر وہاں آپ سب کچھ بیٹھے ہوئے پڑھتے چلے جا رہے ہیں اور سب چیزیں لیبارٹری میں اس طرح رکھی ہیں تو تین سو دفعہ' پانچ ہزار دفعہ پڑھتے چلے جاتے ہیں تو کیا ٹیسٹ ٹیوب میں نتیجہ سامنے آ جائے گا۔ یہ تھی بڑی سازش جو کی گئی کہ ''کرنا (Doing)'' نہیں بلکہ ''پڑھنا'' ہے۔ اب پڑھنے میں بھی یہ خطرہ تھا کہ اگر انہوں نے سمجھ کر پڑھ لیا تو پھر کہیں گے کہ یہ تو کرنے کا کہہ رہا ہے۔ کہا کہ نہیں' اسے سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ بغیر سمجھے ہوئے ہی اس کو پڑھتے چلے جانا چاہیے۔ ناظرہ قرآنِ کریم اور یہ حافظ قرآنِ کریم سناتے ہیں اور ایک ہی رات میں شپنے ہوتے ہیں۔ نہ اس حافظ کو پتہ ہوتا ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں' نہ سننے والوں کو معلوم ہوتا ہے کہ کیا سن رہا ہوں' کہیں گے کہ ثواب حاصل ہوتا ہے۔۔ یہ عقیدہ جو ذہن میں وضع کیا کہ قرآن کے الفاظ بلکہ حروف سے نیکیاں ملتی ہیں اس نے ''کرنے'' (Doing) کے عمل کو ختم کر کے رکھ دیا۔ عقیدہ یہ ہے ''الم'' ویسے پڑھیں گے تو وہ ایک لفظ بنے گا' کہا کہ نہیں' یہ الم تین حرف ہیں' ''الم'' کے ہر حرف کو پڑھنے سے دس دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ اور اس سے تو آپ سوچ لیجیے کہ ایک حرف کے اوپر جو دس دس نیکیاں ہیں تو یہ پورا قرآن شریف جو ہے اس کو جب ختم کیا جائے گا ''تے اینا ں نیکیاں نوں رکھن واسطے کِتے تھاں ای نئیں لبھنا ہیگا''۔ ❶

## قرآن حکیم کے ساتھ یہ ایک گہری سازش ہے

''کرنے (Doing)'' کی بجائے کہنا یا پڑھنا ہوا' اور یہ ''کہنا اور پڑھنا'' بغیر مطلب سمجھے ہوا۔ اس سے کوئی بڑی سازش بھی اس

---

❶ تو ان نیکیوں کو رکھنے کے لیے کہیں جگہ ہی نہیں ملے گی۔

کتابِ عظیم کے ساتھ ہوسکتی ہے؟ نہیں، قطعاً نہیں! اور وہ جو کہا کہ شیطان ان کے اعمال مزین کر کے دکھاتا ہے، تو اس چیز کو اتنا مزین کیا گیا ہے کہ آج لاکھوں کروڑوں گھروں کے اندر ہمارے ہاں قرآن شریف ناظرہ پڑھا جاتا ہے، بغیر سمجھے ہوئے اس کو اتنا دہرایا جاتا ہے۔ دنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس کو اتنا دہرایا جاتا ہو جتنا قرآنِ عظیم کو دہرایا جاتا ہے اور دنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں ہے کہ جسے بغیر سمجھے ہوئے کوئی پڑھ رہا ہو۔ کیا ہی کمال ہے اس قوم کا!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ بات یہاں سے آ رہی ہے کہ ہر کام سے پہلے یہ چیز پڑھی جائے اور سمجھا نہ جائے کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ سمجھا جائے ترجمے میں تو اتنا ہی کہ ''خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں''۔ بس اس کے نام سے شروع کر دیا۔ ''کرنے کی بات (Doing)'' تو پھر آگے آتی ہی نہیں ہے۔ یہ سوچیے کہ کوئی پراجیکٹ اور پروگرام ہاتھ میں لینے والا سب سے پہلے کھڑے ہو کر یہ کہتا ہے کہ میں اس لیے اس پہ گامزن ہو رہا ہوں کہ خدا کی صفتِ رحیمیت کا ظہور عام ہو جائے، نوعِ انسانی کی اس طرح پرورش ہو جائے جیسے رحمِ مادر میں بچے کی پرورش ہوتی ہے! **لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا** (76:9) میں اس کے لیے انسانوں سے کوئی صلہ اور بدلہ تو ایک طرف رہا، میں شکریہ کا بھی متمنی نہیں ہوں کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں، اس لیے کہ میں تو خدا کی صفتِ رحمانیت کے ظہور کے لیے یہ کچھ کر رہا ہوں تو دوسروں سے صلہ کیا مانگنا ہے۔ **لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا** (76:9) وہ انسان اعلان کرتا ہے کہ میں تم سے کوئی صلہ تو ایک طرف شکریہ کا بھی متمنی نہیں ہوں۔ یہ وہ اعلان ہے جو ماں بچے کی پرورش کے وقت کرتی ہے۔ وہ صلہ تو ایک طرف رہا وہ شکریئے کی بھی متمنی نہیں ہوتی۔

## ملکہ سبا کے نام حضرت سلیمانؑ کے خط یا چٹھی کی ابتدا نہایت حسن کارانہ انداز لیے ہوئے تھی

قرآن نے کہا ہے کہ **اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ** (27:30)۔ اب بات سمجھ میں آئی۔ اتنا بڑا ایک شہنشاہ بادشاہ لشکرِ عظیم لیے ہوئے آ رہا ہے، خط لکھ رہا ہے جس میں شرافت اور تکریم کے الفاظ ٹپک رہے ہیں۔ مقصد یہ بتا رہا ہے کہ ہوسِ ملک گیری نہیں، جوع الارض نہیں، استبداد نہیں، قہرمانیت نہیں، غلبہ نہیں، تسلط نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے ہاں انسانوں کی اس انداز پر پرورش نہیں ہو رہی۔ ان کی شرفِ انسانیت کے اوپر حرف آ رہا ہے جیسا کہ ہر بادشاہت میں ہوتا ہے۔ اور کچھ نہ ہو تو احسان تو وہ ضرور رکھتا ہے۔ اور جونہی آپ کسی پہ احسان رکھتے ہیں، اس کی خودی (I-am-ness) تلف ہو جاتی ہے۔

## احسان کا بدلہ احسان نہیں بلکہ حسن ہوتا ہے یعنی توازن برقرار رکھنا ہوتا ہے

عزیزانِ من! ساری عمر اس کی نگاہیں اس احسان سے جھکی رہتی ہیں۔ اس لیے قران نے جو کہا ہے اور جس کا غلط ترجمہ ہمارے ہاں

غلط مفہوم لایا ہے وہ اس آیت کا ہے کہ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (55:60)۔اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہونا چاہیے۔کسی مصیبت کے وقت کسی نے میری کچھ مدد کی تو یہ احسان کیا۔اب میں اس انتظار میں ہوں کہ اس کا بدلہ تو یہی ہے کہ میں اس پہ کوئی احسان کروں۔احسان تو اس وقت ہی کریں گے جب اس پہ کوئی مصیبت آئے' پھر آپ وہ احسان چکائیں گے۔ اب آپ اس انتظار میں بیٹھے ہیں کہ اس پہ کوئی مصیبت آئے یا یہ کہ اے اللہ! اس کے اوپر کوئی مصیبت بھیج' کیوں کہ میں نے احسان کا بدلہ احسان دینا ہے۔تُو نے کہا ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہے۔اور جو زیرِ بارِ احسان ہے اس کو دیکھیے کہ اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ وہ اس کا بے دام غلام ہوتا ہے۔اور اُدھر اُس کی بھی یہ کیفیت ہوتی ہے۔کہتا ہے کہ اندازہ لگایئے اس طوطا چشم کا' بھول گیا کہ کل روتا ہوا' گڑ گڑاتا ہوا' آیا تھا' وہ وقت یاد نہیں رہا کہ کس طرح سے ہاتھ جوڑ جوڑ کے مدد مانگ رہا تھا۔میں نے اس وقت تمہاری مدد کی اور آج تمہاری یہ کیفیت ہے کہ کہتے ہو کہ ووٹ تمہیں نہیں دوں گا بلکہ اس کو دوں گا جو قابل ہوگا' ٹھیک! کاش! ہم نے تمہارے جیسے اس قسم کے نمک حرام کی کسی وقت مدد کی تھی اور کسی وقت احسان کیا تھا! اب احسان کا بدلہ ساری عمر یہ چکاتا رہے۔جو کچھ یہ کہے وہ کرتا رہے تو پھر تو یہ ممنونِ احسان اور نہ کرے تو ناشکرا' طوطا چشم' حرام خور۔کیوں جی؟ کیونکہ خدا نے کہا ہے کہ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (55:60) احسان کا بدلہ احسان ہے۔اب وہ حکمِ خداوندی کی تعمیل نہیں ہو رہی کہ جب تک اس کے اوپر مصیبت نہ پڑے اور یہ اس کا احسان اتارنہ دے۔ کیا کہا ہے قرآن نے؟ یہ پوچھیے عربی زبان سے کہ ''الاحسان'' کیا ہوتا ہے۔دنیا کے ہر دیدہ ور کے نزدیک اور صاحبِ ذوق کے نزدیک بھی یہ کیا ہوتا ہے اور پھر عرب تو بہت کشادہ ذوق ہیں۔کس قدر عجیب قوم تھی' بدوی قوم نظر آتی ہے' ذوق اتنا اونچا ہے۔ان کے ہاں حسن کے معنی یہ تھے کہ ہر شے کا توازن Proportion (تناسب) برقرار رہے اور یہی حسن ہوتا ہے عزیزانِ من! Proportion (تناسب) ہر شے کا برقرار ہے۔حسین ترین چہرے میں آنکھ کی یہ سیاہی ملی میٹر کا سواں حصہ اِدھر سے اُدھر ہو تو آنکھ بھینگی ہو جاتی ہے' سارا حسن ستیاناس ہو جاتا ہے۔ برنارد شاہ نے جو لکھا ہے کہ یہ جو قلوپطرہ ❶ دنیا میں حسین تریں عورت ہے یہ صرف اس کے حسن کی ہی وجہ سے سلطنت غارت ہوگئی ہے۔اس نے لکھا یہ ہے۔تاریخ یہ کچھ کر کے دکھاتی ہے۔کہتا ہے کہ تاریخ کیا کر کے دکھاتی ہے؟ کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ذرا چپٹی ہوتی تو دنیا کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔بڑی عجیب قوم ہے عربوں کی! آپ بھی ذہن میں لے آیئے' اگر کوئی حسین نقشہ ہے اور وہ جو آپ کے ذہن میں ہے وہ صحیح صحیح Proportion (تناسب) کا ہے ''اوہدی نک پھنی کر دیو تھوڑی جی''۔ ❷ چپٹی کر دیجیے پھر دیکھیے اس کا حسن

---

❶ Cleopatra VII (69-30B.C.) Queen of Egypt (51-48B.C,47-30B.C) noted for her beauty and Charisma. She had Julius Caesar and Mark Antony as Lovers.

❷ اس کی ناک ذرا سی چپٹی کر دو۔

کیا رہتا ہے۔ حسن مکمل ترین Proportion (تناسب) کا نام ہے۔ حسنِ عمل اور عمل بھی وہی حسین ہے جس میں ہر چیز کا توازن اپنی جگہ صحیح ہو۔ حسین بھی وہی ہے جس میں ہر شے کا توازن برقرار ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ معاشرہ وہ حسین ہے جس میں اس کا Proportion (تناسب) اس کا توازن برقرار رہے۔ کہیں اگر کسی فرد کا توازن بگڑے تو اس میں کسی چیز کی کمی آئے گی۔ اس کی اس کمی کو پورا کر دو تا کہ اس کا توازن برقرار ہو جائے۔ کہا کہ تم نے وہ کمی پوری کی اس کا بگڑا ہوا جو حسن تھا برقرار ہو گیا اب تم کہتے ہو کہ اس کا بدلہ؟ وہ کہتا ہے کہ اس کا حسن برقرار ہو گیا یہی تو اس کا بدلا ہے۔

## ذوقِ نظر کامل جانا ہی تو احسان کا بدلہ ہے

عزیزانِ من! یہ چیزیں دینے والا خدا ہے اور اسے اس انداز سے کہنے والا یقین مانیے [1] وہ ہے:

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

اگر کہیں وہ خدا سامنے آ جائے تو پوچھو کیا کچھ کرے آدمی! کیا کہہ گیا ہے کہ بابا! یہ بات اس کی نہیں تھی بگڑا ہوا حسن تو باقی معاشرے میں بھی بگاڑ پیدا کرتا ہے۔ حسین ترین چیزوں میں ذرا ایک بگڑا ہوا بٹھا کے دیکھیے:

افسردہ دل افسردہ کنند انجمنے را

ساری محفل کا حسن اس سے بگڑ جاتا ہے۔ کہا کہ تمہارے بس میں ہے کہ اس کا توازن صحیح کر دو۔ اگر توازن صحیح ہو گیا حسن برقرار ہو گیا تو اس کا بدلہ تمہیں مل گیا تم خود بھی تو اس کے پاس آیا کرو گے۔ اس سے کیا مانگتے ہو؟ تم نے اس کا کچھ کیا ہے؟ تم نے تو حسن کا کچھ کیا ہے حسن کی بارگاہ سے بدلا مانگتے تھے۔ اور وہ یہ ہے کہ تمہیں ذوقِ نظر نصیب ہو گیا اور کیا مانگتے ہو! **هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ** (55:60) کسی کے بگڑے ہوئے حسن کو سنوار دینا اس سے زیادہ صلہ کیا ہے کہ حسن سنور گیا۔ قرآن انسان کو کہاں لے جاتا ہے۔ عزیزانِ من! ایک اتنا بڑے مخالف کو یہ چٹھی لکھ رہا ہے۔ چٹھی کیا لکھ رہا ہے؟ چٹھی لکھ رہا ہے کہ کوئی اور مقصد نہیں ہے ہم نے یہ دیکھا ہے کہ تمہارے ہاں معاشرے میں توازن بگڑ رہا ہے۔

## حضرت سلیمانؑ کے نزدیک ملکہ سبا کا معاشرتی جرم

پہلی چیز یہ ہے کہ تم نے معاشرے کی ذہنی سطح اتنی دبا رکھی ہے کہ وہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ وہ جو سورج ہے ایک کرّہ ہے اس کے سامنے

---

[1] یہ اشارہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

جھکنا شرفِ انسانیت کے خلاف ہے۔ان کی صحیح تربیت نہیں ہوئی۔رحمانیت اور رحیمیت میں فرق آیا ہوا ہے۔میرا مقصد اتنا ہے کہ یہاں انسانوں کے اوپر اس طرح سے ظلم ہو رہے ہیں' ان کو پنپنے نہیں دیا جا رہا' ان کی خودی کی تکمیل نہیں ہو رہی۔اسے چٹھی لکھی جا رہی ہے' وہ اسے کتاب کریم نہ کہتی تو اور کیا کہتی۔اور کہا کہ یہ یونہی چڑھ دوڑنا نہیں۔**اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ** (27:31)۔سرکشی مت اختیار کرو۔آؤ! میں بھی خدا کے قوانین کے سامنے جھکا ہوا ہوں' تم بھی جھک جاؤ۔**وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ** (27:31) یہ میری Submission (اطاعت گزاری) نہیں' بلکہ میں تو خود مسلم ہوں' میں بھی اس کے سامنے جھکا ہوا ہوں' سورج کے سامنے کیوں جھکوں۔آؤ! میرے ساتھ مل کے اس کے سامنے جھکو:

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بُتانِ آذری

آؤ! اس انداز سے آؤ۔ **قَالَتْ یٰٓاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْٓ اَمْرِیْ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰی تَشْهَدُوْنِ** (27:32)۔وہ جو تھا کہ اس کے ہاں نظم و نسق بڑا ہوتا ہے تو اس سے نظر آتا ہے کہ وہ واقعی ڈکٹیٹر قسم کی ملکہ نہیں تھی۔اس نے اپنے اربابِ اقتدار' امرا' وزرا سے کہا کہ یہ بات ہے' یہ چٹھی آئی ہے' یہ دیکھ لو' یہ اس کے اندر لکھا ہوا ہے' بتاؤ تمہارا کیا مشورہ ہے؟ اس لیے کہ میں کوئی آخری حکم' آخری فیصلہ نہیں کیا کرتی جب تک کہ اس پہ تمہاری شہادت' اس فیصلے کے اندر موجود نہ ہو۔تو نظر آتا ہے کہ ان کے ہاں کچھ تھوڑا سا اندازِ جمہوریت اس دور میں بھی تھا۔ **قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِیْدٍ** (27:33)۔کہا کہ دو باتیں ہیں۔ایک تو یہ بات ہے کہ اگر تم یہ فیصلہ کرو کہ مقابلہ کرنا ہے تو ہم نے چوڑیاں نہیں پہن رکھیں' ہم میں قوت ہے' ہم جنگجو ہیں اور ہم پورا پورا مقابلہ کریں گے۔یہ چیز بھی ہے ہمارے ہاں۔ہم ڈرپوک اور بزدل بھی نہیں ہیں۔ہم ہمت ہارنے والے بھی نہیں ہیں۔**وَّالْاَمْرُ اِلَیْكِ فَانْظُرِیْ مَاذَا تَاْمُرِیْنَ** (27:33) لیکن فیصلہ تمہی نے کرنا ہے' جو فیصلہ کرو۔جنگ کا فیصلہ کرو گے تو ہم تیار ہیں۔

## اربابِ عزت کے لیے ملوکیت ہمیشہ ذلت آمیز سلوک روا رکھتی ہے

قرآن بتاتا ہے کہ **قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً وَكَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ** (27:34)۔ملکہ سبا نے کہا کہ بات یہ ہے کہ تم میں قوت بھی بڑی ہے' میدانِ جنگ میں تم پیٹھ بھی نہیں دکھاؤ گے' مجھے تم پہ بھروسہ ہے۔اب وہ ملکہ سبا تو حضرت سلیمانؑ کو بادشاہ ہی سمجھ رہی تھی کہ چڑھائی کر کے آ رہا ہے۔کہا کہ اتنی بات یاد رکھو! بادشاہ جب کسی ملک پہ چڑھائی کرتے ہیں تو وہ وہاں تہس نہس کر دیا کرتے ہیں اور پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ وہاں کے اربابِ عزت کو وہ ذلیل کر دیتے ہیں'

وہاں کی بلندیوں کو پستیوں میں بدل دیتے ہیں‘ ہمواریاں دور کر دیتے ہیں۔ جس ملک میں بھی بادشاہ کی فوج آ جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کرتا ہے کہ ملک تہس نہس ہو جاتا ہے۔ اور یہ ہے کہ اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً (27:34)۔ وہ یہ دیکھ ہی نہیں سکتے کہ ’’کوئی سر چڑھا جوان اوتھے پھرا ہووے‘‘ ❶ یعنی کوئی سرفرازیاں لیے ہوئے ہو‘ جو اس طرح سے سر اٹھا کر چلنے والا ہو۔ بادشاہ جب کسی ملک کو حملہ کر کے مغلوب کرتا ہے تو پہلی چیز وہ یہ کیا کرتا ہے کہ جو صاحبانِ عزت ہیں‘ وہ انہیں ذلیل کر دیتا ہے۔ آگے یہ ہے کہ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ (27:34) یہ بات اسی بادشاہ کی نہیں ہے بلکہ بادشاہ اب جہاں بھی ہیں‘ وہاں ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔

## ملکہ سبا کی طرف سے حضرت سلیمانؑ کو تحائف کا لالچ

ملکہ سبا کہنے لگی کہ میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے کہ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ (27:35) دوستی کا ذرا ہاتھ بڑھا کر دیکھتے ہیں‘ میں کچھ تحائف بھیجتی ہوں اور بڑے بیش قیمت تحائف بھیجتی ہوں‘ دیکھتی ہوں کہ اس کا ردِعمل کیا ہوتا ہے۔ اگر وہ اس لالچ میں آ گیا تو پھر کچھ مشکل نہیں ہے۔ پھر سمجھ لیا جائے گا کہ اسے دولت کی ہوس ہے‘ حرص ہے‘ لالچ ہے‘ پھر ہم اس کے ساتھ سودا کر لیں گے۔ دیکھتے ہیں کیا باتیں ہو رہی ہیں رموزِ مملکت کی!! یہ جو چیز ہے کہ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ (27:35)۔ یہ تحائف کی بات نہیں ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس سے ان کا ردِعمل کیا ہوتا ہے تو اس کے بعد کچھ فیصلہ کریں گے۔

## تحائف کے معاملہ میں حضرت سلیمانؑ کی دورنگی اور ان کا جواب

ادھر بھی معاملہ خدا کے ایک رسول سے تھا‘ بلندیوں پہ پہنچے ہوئے دانش وبینش کے بادشاہ سے تھا! فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰنِ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰكُمْ (27:36)۔ حضرت سلیمانؑ نے کہا کہ اس سے کہو کہ کیا تم اپنے مال و دولت کا لالچ دے کر مجھے میرے مقصد سے باز رکھنا چاہتی ہو؟ اگر یہ صورت ہے تو اس سے کہو کہ خدا نے جو کچھ مجھے دیا ہے‘ وہ تمہارے مال و دولت سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ یہ نہیں کہا کہ مقدار (Quantity) میں زیادہ ہے‘ اکثر نہیں کہا بلکہ خیر کہا ہے۔ کثرت اور اکثر صرف مقدار (Quantity) کے اعتبار سے ہوتا ہے‘ خیر میں مقدار بھی ہوتی ہے اور اس کا حسن بھی ہوتا ہے‘ برکت بھی ہوتی ہے۔ تو وہ بہت بہتر ہے اس سے‘ جو تم مال و دولت لیے بیٹھی ہو۔ اس لیے اس مال و دولت کے لالچ میں ہم نہیں آ سکتے۔ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ (27:36) میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنے اس مال و دولت پر اترا رہی ہو اور اسی لیے تم نے میرے خط کا جواب‘ جو میں نے پوچھا تھا‘ نہیں

---

❶ وہاں کوئی ابھرتا ہوا (غیور) جوان بھی نظر آئے۔

دیا' بلکہ مال و دولت بھیجا ہے تو تم اس پہ اترا رہی ہو اور پھر ان خزانے والوں سے کہا کہ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (27:37)۔ یہ تحائف واپس لے جاؤ اور اس سے جا کر کہو کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے یا تو اسے تسلیم کر لو اور اگر اس سے تم سرکشی اختیار کرتی ہو تو پھر فیصلہ میدانِ جنگ میں ہی ہو سکتا ہے' اس کے لیے تم تیار رہو۔ اور جیسا تم نے اپنے اہلِ دربار سے کہا ہے' پھر ہوتا یہی ہے۔ ہم میں ہوسِ ملک گیری ہو یا نہ ہو' فوج واقعی جس ملک میں جایا کرتی ہے وہاں ایک تباہی مچ جایا کرتی ہے۔ ایسی صورت نہ پیدا ہونے دو۔ یہ کیفیت تھی۔

بار بار سمجھایا جا رہا ہے کہ ایسی صورت نہ پیدا ہونے دو' پھر یہ ہو جایا کرتا ہے' اس پہ کسی کا بھی بس نہیں رہا کرتا۔ اور پھر اس کے بعد جو تمہیں شکست خوردگی ہو گی تو جو تمہاری Submission (اطاعت گزاری) ہے' وہ بڑی ذلت آمیز ہو گی' بہ نسبت اس کے جو تم دوستانہ طور پہ کرو گی۔ Submission (اطاعت گزاری) تو اس وقت بھی تمہاری ہو گی لیکن بڑا فرق ہے۔ تو یوں کیوں نہیں کہ دوستانہ طور پر میں جو بات کہتا ہوں تم اس بات کو تسلیم کر لو' یہ بڑی حق وصداقت کی بات ہے۔ اس طرح سے آؤ' عزت والوں کی عزت باقی رہ جائے گی' تمہارا ملک باقی رہ جائے گا' اس میں کوئی کسی قسم کی تباہی نہیں آئے گی۔ لیکن اگر یہ نہیں ہو گا تو یاد رکھو! پھر وہ چیز تو Indispensable (لازمی) ہو جائے گی' پھر اس کے جو نتائج ہیں' وہ بڑے نقصان رساں ہوں گے۔ تو کیوں مجبور کرتی ہو کہ حالات وہاں تک پہنچ جائیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ کہہ کر ان کو واپس کر دیا۔ عزیزانِ من! پھر اس سے آگے کیا ہوا؟ اب درس کا وقت پورا ہوا۔ ہم سورۃ النمل کی آیت 37 تک آ گئے۔ آیت 38 سے اگلے درس میں ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

# چوتھا باب: سورۃ النمل (آیات 38 تا 44)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿۳۹﴾ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۖ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴿۴۰﴾ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۱﴾ فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾ قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ؕ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۴﴾

عزیزانِ من! آج ستمبر 1978ء کی 22 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النمل کی آیت 38 سے ہو رہا ہے: (27:38)۔

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات میں حضرتِ سلیمانؑ کا تذکرہ جلیلہ چلا آ رہا ہے اور اس داستان میں حصہ وہ ہے جس میں وہ ملکہ سبا کے ملک کی طرف جا رہے ہیں۔ راستے میں وادی نمل پڑی تھی، اس کے آگے بات ملکہ سبا کے متعلق بھی ہو چکی تھی کہ آپؑ نے اس کی طرف خط بھیجا ہے۔

## انبیائے کرام کے تاریخی واقعات بیان کرنے کا مقصد

میں یہ عرض کر دوں جیسا کہ آپ دیکھتے چلے آ رہے ہیں، انبیائے کرامؑ کی یہ داستانیں محض تاریخی واقعات کے طور پر قرآن نے بیان نہیں کیں۔ یہ واقعات تو ہیں، چاہے تاریخ کے ہی کہیے، لیکن ان سے آخر میں جا کے وہ جو داستان کے بیان کرنے کا مقصد بیان کرتا ہے، وہ ہے اصلِ مقصود کہ یہ داستان کیوں بیان کی گئی ہے۔ باقی انبیائے کرامؑ کے سلسلے میں بھی ہم دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ بہت سے انبیائے کرامؑ کے تذکرے اس سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان میں ہم نے دیکھا ہے کہ ان واقعات کے بیان کرنے کا مقصد کیا تھا۔ مقصد

دین کی کسی نہ کسی حقیقت کو نمایاں کرنا تھا اور اس کی شہادت میں یہ تاریخی شہادت یا Evidences پیش کرنی مقصود تھیں کہ یہ دیکھیے یہ جو دعویٰ ہم کرتے ہیں اس کی شہادت تاریخی واقعات میں دیکھ رہے ہیں۔ اور یہی چیز ہے جو قرآن نے اصولاً بیان کی ہے کہ غلط نظام، کسی دور میں، کسی قوم میں، کسی حکومت میں، کسی ملک میں ہو، اس کے نتائج انسانیت سوز نکلتے ہیں۔ اور اس کے مقابلے میں اگر صحیح معاشرہ قائم ہو جائے تو اس کے نتائج انسانیت ساز اور خوشگوار ہوتے ہیں۔ یہ ہے بنیادی چیز۔

## مختلف ادوار میں انبیائے کرام نے جن جن گوشوں کی نشاندہی کی وہ قرآنِ حکیم کے پیش کردہ دین کا ہی کوئی نہ کوئی جز تھا

اس بنیادی چیز کے لیے قرآن یہ دعوے کرتا ہے کہ اگر نظام میں مثلاً اس قسم کی خرابی ہو تو اس کے اس قسم کے خراب نتائج برآمد ہوں گے۔ وہ انبیائے کرامؑ کی جو داستان بیان کرتا ہے ان کے کسی ایک نبی کے زمانے میں اسی مخاطب قوم میں غلط نظام کا جو گوشہ سب سے ابتر حالت میں پہنچ چکا ہو، وہ اسے نمایاں طور پہ سامنے لاتا ہے اور اس کے مقابلے میں نبی نے جو معاشرے کا گوشہ قائم کیا تھا اس کے بعد اس کو بیان کرتا ہے۔ اور پھر یہ بتاتا ہے کہ اِس کا نتیجہ کیا نکلا اور اُس کا نتیجہ کیا نکلا۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ اگر ان تمام گوشوں کو، واقعات کو، جو الگ الگ انبیائے کرامؑ کے بیان ہوئے ہیں، یکجا کر لیا جائے تو وہ قرآن کا دین کا نظام بن جائے گا جو قرآنِ کریم نے بیان کیا، ایک گلدستہ بن جائے گا جو ہمارے سامنے آ جائے گا۔

اب حضرتِ سلیمانؑ ہیں، وہ نبی ہیں وہ ایک ملکِ عظیم، بہت بڑی وسیع و عریض مملکت کے، بھی حاکم ہیں۔ یہ سارے واقعات بیان ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ان میں کوئی بات ایسی نہیں آئی ہے بجز اس کے کہ ایک اشارہ اس میں آیا ہے کہ انہوں نے جو ملکہ سبا کو خط لکھا ہے تو اس ملکہ نے کہا ہے کہ یہ كِتٰبٌ كَرِيمٌ (27:29) ہے، بڑی شرافت میں بھرا ہوا خط لکھا ہے۔ اتنا بڑا جلالت مآب حکمران ہے۔ اس ملکۂ سبا کی مملکت کے اندر بے حد مظالم ہوتے ہوں گے اس لیے کہ ہم آگے چل کر یہ دیکھیں گے کہ لکھا ہے کہ غلط راستے کو چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کرو۔ اور آخر میں تو ہم بتائیں گے کہ اس کا مقصد کیا تھا، خود اس مخالف کو جو خط لکھا جا رہا ہے تو وہ اس خط کا اعتراف کر رہا ہے کہ یہ بڑے ہی شریفانہ انداز میں لکھا گیا ہے، وہ اسے کتابِ کریم کہہ کر بیان کر رہا ہے۔

## نبی کا طرزِ زندگی اور اس کے حسنِ اخلاق کی ایک مثال

اس بات کا تو وہیں پتہ چل گیا ہے کہ ایک نبی جب صاحبِ اقتدار ہوتا ہے تو اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے یعنی وہ مخالف کو خط لکھ رہا ہے، یوں کہیے کہ باہر یہ ہے اور آگے اس کا ملک آ جاتا ہے، وہاں سے اس کو خط لکھ رہا ہے اور خط میں وہ مخالف اعتراف کر رہا ہے کہ یہ کتاب کریم

ہے۔ یہاں کوئی شخص اگر پارٹی چھوڑ کر الگ ہوتا ہے تو پھر دوسرے دن دیکھیے کہ اس کے متعلق کیا کچھ نہیں کہا جاتا۔ یہ ہیں ان داستانوں کی وہ چیزیں' یہ ہیں وہ گوشے جن کو سامنے رکھنا چاہیے۔

خط کی ابتدا کس طرح سے ہوتی ہے؟ لکھا ہے کہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (27:30)۔ یہ ہمارے والی بسم اللہ نہیں ہے۔ وہ ہمارے والا بسم اللہ جو ہے اس کو ہم نے سمٹایا اور 786 میں لے آئے اور وہ صرف ہمارے ہاں 786 کی رسم ہے۔ خط کے اوپر 786 لکھا ہوا ہوتا ہے خواہ نیچے شراب کے ٹھیکے کی شرائط کیوں نہ بیان کی گئی ہوں۔ وہ جو ایک نبی لکھتا ہے وہ قرآن کے مقاصد اور مفہوم کے اعتبار سے کہتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا اور تفصیل سے بیان کیا تھا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے معنی کیا ہیں۔ انہوں نے یہ لکھا تھا کہ میں یہ جو قدم اٹھا رہا ہوں' یہ کوئی جوع الارض نہیں ہے' ہوسِ ملک گیری نہیں ہے' مالِ غنیمت لوٹنا نہیں ہے' میری کچھ ذاتی خواہش نہیں ہے بلکہ یہ تو میں خدا کی صفتِ رحمانیت اور رحیمیت کو عام کرنے کے لیے یہ اقدام کر رہا ہوں۔ یہ ہیں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے معنی۔ اس مقصد کے لیے یہ سارا کچھ ہو رہا ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ میں یروشلم سے چل کر یمن آ گیا ہوں' اتنا لمبا سفر طے کر کے' تمہاری مملکت مقصود ہے اور چاہتا ہوں کہ یہاں بھی میری حکومت قائم ہو جائے۔ یہ سوال ہی نہیں ہے۔ یہاں تو مقصود ہی رحمانیت اور رحیمیت کا عام کرنا ہے۔ خدا کے بندوں کی پرورش اور نمود اور نشوونما اور ان کی صلاحیتوں کا ارتقا اور وہ اس طریقے سے کہ اس کا کوئی معاوضہ نہیں جیسے کہ ماں رحم کے اندر اپنے بچے کی پرورش کرتی ہے۔ یہ ہے مقصد۔ تو نظر آیا کہ وہاں کا نظام ایسا تھا جس میں انسانوں پر مظالم ڈھائے جاتے تھے' ان کی انسانی صلاحیتوں کی برومندی نہیں ہونے دی جاتی تھی۔ ایک بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے جو آغاز ہوتا ہے مقصودِ گرامی کا' وہ یہ بات بتا رہا ہے کہ اس کا مقصود کیا تھا؟ صرف خدا کی رحمانیت اور رحیمیت کا قائم کرنا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ داستان بیان کرتے ہوئے راستے میں ہی قرآنِ کریم کس طرح سے اصلِ مقصود کی طرف توجہ مبذول کرائے چلا جاتا ہے۔ یہ ہیں یہ داستانیں۔

## حضرت سلیمانؑ کے خط کے جواب میں ملکہ سبا کا ردِعمل اور اس پر حضرت سلیمانؑ کا رویہ

انہوں نے اس کی طرف یہ لکھا کہ غلط راستہ چھوڑ دو۔ بات صرف یہ ہے جو کہی جا رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ تو بہرحال ایک ملکہ [1] ہے' وہاں تو بادشاہت ہے' ملوکیت ہے' وہاں تو نبوتِ رسالت ساتھ نہیں' اس میں وہی جو سیاست کی حیلہ جوئیاں ہوتی

---

[1] اس ملکہ اور اس کی قوم کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۂ المؤمنون' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص ص۔ 185 تا 186' کا فٹ نوٹ 4۔

ہیں‘ اسی سے کام لیا کہ ذرا بہت سا مال و دولت بھیج کر تو دیکھو۔ اگر وہ اس کے لالچ میں آ جاتا ہے تو ٹھیک ہے‘ خراج مانگنے کی ضرورت نہیں ہے‘ اس پہ مفاہمت ہو جائے گی۔ وہ جو کچھ بھیجا ہے‘ انہوں نے اسے ٹھکرا کر کہہ دیا کہ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کس قدر دے رکھا ہے اور میرا مقصد تو ہے ہی نہیں کہ میں مالِ غنیمت لوٹنے کے لیے یہاں چڑھائی کر کے آیا ہوں۔ میں نے سب کچھ اپنے خط میں لکھ دیا تھا کہ مقصد کیا ہے۔ تم اس طرف نہیں آنا چاہتیں اور تم ان حیلہ جوئیوں سے اپنے نظام کو قائم رکھ کر میرے ساتھ Compromise (مصالحت) اور مفاہمت کرنے کے لیے اتری ہو۔ حق و صداقت کا پیرو یا داعی باطل کے ساتھ مفاہمت نہیں کیا کرتا۔ بات سیدھی سی ہے۔ انہیں واپس بھیج دیا۔ اور اِدھر پھر اپنے ہاں ارکانِ مملکت سے مشورہ کیا۔ اب یہاں سے ایک بات شروع ہوتی ہے۔ ایک لفظ کے غلط یا عام مفہوم کو لے کر ہمارے ہاں پھر تفسیروں میں جو کچھ بیان ہوا ہے‘ وہ میں عرض کروں گا۔ قرآن تو بات ہی کچھ اور کرتا ہے۔

## ملکہ سبا کے تخت کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کے بیان کردہ تفاسیر کا غور طلب نکتہ

قرآن جب ان تفسیروں کے ہتھے چڑھتا ہے تو وہاں رندہ لگایا جاتا ہے۔ ان تفسیروں میں یہ سب چیزیں آتی ہیں۔ **قَالَ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَؤُا اَیُّكُمْ یَاْتِیْنِیْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ یَّاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ** (27:38)۔ اس کا عام ترجمہ اور عام تفسیر یہ ہے کہ آپؑ نے اپنے سرداروں سے کہا کہ تم میں ایسا کون ہے جو اس کے تخت کو یہاں اٹھا لائے؟ بات کیا ہو رہی ہے؟ اور قصہ کیا ہے؟ اور یہ کہتے ہیں کہ تخت کو اٹھا لاؤ۔ کہیں تو یہ ہے کہ اسے کہا تھا کہ وہ ملکہ سمیت ہی اٹھا لاؤ۔ عزیزانِ من! میں قرآن کی بات نہیں کہہ رہا۔ یہ جو ہمیں کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم ان تفاسیر سے سامنے آئے گا‘ میں وہ بات کر رہا ہوں۔ اور تفاسیر بھی یہ ہوں‘ خواہ وہ کسی طبری کی تفسیر ہے‘ کسی رازی کی تفسیر ہے۔ ٹھیک ہے‘ انسانوں کی لکھی ہوئی تفسیریں ہیں۔ آپ کا جی چاہے مانیے‘ جی چاہے نہ مانیے۔ قیامت ہم پہ یہ گزری ہوئی ہے کہ ہر تفسیر والا اپنے ہاں لکھتا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت ہے جو میں بیان کر رہا ہوں۔ تو انسان اس وقت کیا کرے۔ جو کچھ ہم پہ بیتی ہے‘ جو کچھ اسلام پہ بیتی ہے‘ یاد رکھیے‘ عزیزانِ من! وہ صرف ایک نکتہ ہے کہ ہر قسم کی خود تراشیدہ داستانوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ حضور صلی اللہ علی وسلم نے یہ فرمایا ہے تو کونسا بد بخت مسلمان ہے جو اس کے بعد کہے کہ میں اس کو نہیں مانتا‘ وہ تو مسلمان ہی نہیں رہ سکتا‘ اس کا ایمان ہی باقی نہیں رہ سکتا اور اگر اس کو مان لیا جائے کہ خدا نے یہ قرآن میں اتارا ہے اور اس کی تفسیر اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان کی ہے تو ٹھیک ہے‘ عزیزانِ من! اپنی مسجدوں محفلوں خلوت گاہوں تک تو آپ اس کو رکھ سکتے ہیں‘ جب آپ اس کو دنیا کے سامنے پیش کریں گے تو اس کے بعد کیا کریں گے۔ پھر آپ کے خدا‘ آپ کے قرآن اور آپ کے رسول کے متعلق دنیا کیا کہے گی۔ اور دنیا میں نہیں اب تو آپ کی جو اگلی جنریشن‘ اگلی نسل ہے‘ وہ اسی دنیا

میں شامل ہوتی چلی جارہی ہے۔کیا آپ اُس سے یہ بات منوالیں گے؟

## ملکہ سبا کو اس کے تخت سمیت اٹھالانے کا حکم کسی نبی کے شانِ شایان نہیں ہوسکتا

یہ بات ایک بادشاہ نہیں کرر ہا۔ بادشاہ کرر ہا ہوتا تو ٹھیک ہے یہ ڈاکو بھی کرتے ہیں کہ 'اوئے منجے سمیت چک کے لے آ وَاونوں'' ❶ بادشاہ نہیں کہہ رہا بلکہ خدا کا رسول کہہ رہا ہے جو رحمانیت اور رحیمیت کے امتزاج سے اپنا مقصد کہہ رہا ہے کہ کون ہے جو اس کا عرش لے آئے۔ میں نے کہا ہے کہ ''عرش'' ایک لفظ ہے اور اس کا مفہوم وہی لیا ہے جو تخت یوں بچھا ہوا ہوتا ہے' جس کو اٹھا کر لایا جاسکتا ہے۔کون ہے جو لے آئے؟ یہاں کہا ہے کہ قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ (27:38) قبل اس کے کہ وہ Surrender (ہتھیار ڈالدے) کردے اگر اس کے عام معنی یہ لیے جائیں' یا یہ لیے جائیں کہ اسلام لے آئے جیسے میں کہہ رہا ہوں۔اور یہی بات ہے کہ اسلام لے آئے تو اس کے کیا معنی ہیں؟ میں نے عرض کیا ہے کہ داستان کا آخری ایک فقرہ ہے جو سارا مفہوم واضح کردیتا ہے' عزیزانِ من! کہ یہ کیوں کہا جارہا ہے؟ مسلم کے معنی ہی' اگر یوں بھی لیا جائے کہ وہ Surrender (ہتھیار ڈال دے) کردے تو وہ کہہ رہے تھے کہ اپنی مملکت کا جو غلط روش یا غلط نظام ہے' اس کو چھوڑ دو اور صحیح نظام اختیار کرو۔ کہا کہ اگر وہ اس راستے پہ نہیں آرہی' تو بتاؤ کہ تم میں سے کون ہے' جو اس کا عرش لے آئے۔

## طبریؒ کی 30 جلدوں پر مبنی تفسیر اور 13 جلدوں پر تاریخ کی پیدا کردہ مشکلات اور اُن کا نتیجہ

میں پہلے آپ کے ہاں کا وہی ترجمہ اور تفسیر بیان کررہا ہوں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ مصیبت ہم پہ یہ آجاتی ہے جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے۔ ساری قیامت یہ ہے۔طبری ❷ کی جو پہلی تفسیر بیان ہوئی ہے وہ اس شخص نے تیس جلدوں میں لکھی ہے۔پھر یہ ہوسکتا تھا کہ اگر اس زمانے کی صحیح تاریخ آپ کے سامنے ہوتی تو آپ یہ کہہ لیتے کہ نہیں صاحب! یہ بات جو تم قرآن کی تفسیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہو' تاریخ اس کی شہادت نہیں دیتی۔اس شخص نے آپ کی پہلی ❸ تاریخ بھی مرتب کردی۔ یہ تیرہ جلدوں کے اندر ہے۔اس میں ہر واقعہ اور ہر بات کے متعلق کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت یوں آئی ہے۔صاحب! اس تفسیر اور اس تاریخ کے ساتھ امت قیامت تک دب گئی اور یہ جتنی قیامتیں آپ پہ برپا ہورہی ہیں' وہ ساری اس کی وجہ سے ہیں۔اس کے بعد جس نے بھی تفسیر لکھی ہے وہ اسی کی تفسیر کرتا چلا جارہا ہے جو پہلے لکھی گئی ہے' اس سے آدمی ہٹ نہیں سکتا۔آپ

---

❶ ابے! اسے چارپائی سمیت اٹھا کر یہاں لے آؤ۔

❷ علامہ ابی جعفر محمد بن جریر الطبری (المتوفی 310ھ)

❸ تاریخ طبری

نے غور فرمایا کہ ہمارے لیے مشکل یہ ہے۔ وہ کیوں ایسا ہوا؟ وہ پوچھتے ہیں کہ صاحب! یہ کیا بات ہوگئی کہ ہزار سال کے اندر یہ ایک غلط بات اسی طرح سے چلی آ رہی ہے کسی نے اس کے متعلق یہ نہ کہا؟ اور پھر جو ہمارے خلاف یہ سارا پروپیگنڈہ ہے کہ یہ منکرِ حدیث ہے تو کیا کسی کو بھی یہ بات نہیں سوجھی؟ ہوئی ہے یہ چیز کہ اس نے جو پہل کر دی اور ہر بات جو اپنی طرف سے کہی یا جو داستانیں مشہور تھیں وہ یہودیوں، عیسائیوں، مجوسیوں اور ایرانیوں نے جتنا بدلا اسلام سے لینا تھا تو اس کی ہر چیز اس میں لکھی اور اس نے لکھ دیا کہ فلاں صحابیؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا۔ اب اسے ان سے الگ کرنے کی کون جرأت کرے۔ ہاں تو بات یہ ہو رہی تھی کہ تم میں سے کون ہے جو ملکہ سبا کا تخت اٹھا کر لے آئے؟

## عفریت اور جن کا مفہوم

**قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ** (27:39)۔ اب پہلی بات تو یہ آئی کہ ''جن'' کا ترجمہ تو وہ ''جن'' ہو گیا جس کا ہمارے ہاں عام تصور ہے۔ ایسا دوسرا لفظ **عفریت** آیا ہے۔ عربی زبان میں ''**عفریت**'' اس کو کہتے ہیں جو ''قوی ہیکل بھی ہو، بہت تگڑا ہو اور ذہنی طور پہ بہت تیز ہو''۔ اس میں دونوں قوتیں ہوتی ہیں: جسمانی قوت بھی ہوتی ہے اور ذہنی تیزی بھی ہوتی ہے۔ ابھی ابھی ہم بتائیں گے کہ علم کی بنا پہ ذہانت زیادہ تیز نہیں ہوتی ہے۔ اور ''جن'' کا میں نے عرض کیا تھا کہ ''جو وہاں کے کوہستانی قبیلے تھے، وہ بڑے قوی تھے''۔ ہمارے ہاں بھی وہ جو قبائلی پٹھان آیا کرتے تھے یا اب بھی آپ کے ہاں آیا کرتے ہیں، انہیں آپ اپنے مقابلے میں دیکھیے۔ وہ آپ سے طاقت میں زیادہ ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انسان پر پہاڑی یا کوہستانی یا صحرائی علاقوں کی آب و ہوا کا بھی اثر ہوتا ہے۔ تو وہ جو کوہستانی یا پہاڑی یا صحرائی علاقوں کے قبائلی لوگ تھے، وہ ان کے لشکر میں تھے۔ عربی زبان میں یہ جتنے بھی صحرائی بدو، خانہ بدوش تھے، جو شہروں سے الگ الگ دور دور رہتے ہیں، انہیں عربی زبان کے اندر الناس کے مقابلے میں ''جن'' کہتے ہیں۔ یہ الناس Social Animal یا شہروں میں رہنے والے ہیں اور ''جن'' وہ ہیں جو باہر خانہ بدوش اور صحراؤں میں، پہاڑوں میں، رہنے والی بستیوں میں ہیں۔ عربوں کے ہاں انہیں ''جن'' کہتے تھے۔ ہمارے ہاں چونکہ وہ ایک جن ہی ہمارے ذہن میں آ گیا ہوا ہے، ہم وہی سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ جب حضرت سلیمانؑ نے کہا کہ تم میں سے کون ہے جو اس کا تخت اٹھا کر لے آئے تو اس نے کہا کہ **اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ** (27:39) قبل اس کے کہ آپ یہاں سے اٹھیں، میں لا کر دکھاتا ہوں۔

## تفاسیر کی بیان کردہ متضاد کہانی

اب ''جن'' ہو ذہن میں اور دعویٰ ہو یہ کہ ابھی لایا، اس نے تو ساتھ ہی کہا کہ **وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ** (27:39)۔ طاقت

تو مجھ میں ہے لیکن مجھ پہ اعتبار کرو۔ ایک تو یہ تھے۔ ایک دوسرے تھے۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ (27:40)۔ یہ وہ تھے جن کو کتاب کا علم تھا۔ تو اس کے بعد اس کی تفسیر آتی ہے کہ یہ حضرتِ سلیمانؑ کے وزیر تھے' آصف ان کا نام تھا' برخیاہ (Barchia) ان کے باپ کا نام تھا۔ پتہ نہی کہاں سے یہ باتیں آئیں۔ یہ آصف تو ہمارے ہاں نام رکھتے ہیں۔ یہ وہ لفظ ہے جس لفظ کے معنی ہی کسی کو پتہ نہیں ہوتا۔ جس کا نام ہوتا ہے اس سے پوچھو تو وہ کہے گا کہ ''میں کی دساں ہور کی معنی ہوئے ایہدے''۔ ❶ یہ جو ملکہ سبا ہے' میری بیٹیاں معاف کریں' اگر کسی کا ہمارے ہاں یہ جو بلقیس نام آتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ اس ملکہ سبا کا نام تھا۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح حضرتِ یوسفؑ کے قصے میں وہ جو عزیزِ مصر کی بیوی ہے' اس کا نام انہوں نے زلیخا رکھا ہوا ہے۔ وہ کہیں قرآن میں نہیں ہے۔ تو یہ تفسیری اعتبار سے آصف برخیاہ (Barchia) کا بیٹا تھا اور حضرتِ سلیمانؑ کا وزیر تھا۔ یہ جو ہے کہ اسے الکتٰب کا علم تھا تو وہ کہتے ہیں کہ اسے اسمِ اعظم کا علم تھا۔ یہ اس کے پاس ہے۔

## حضرت سلیمانؑ وِرد' وظیفے' گنڈے اور جادو وغیرہ کیا کرتے تھے (معاذ اللہ)

حضرت سلیمانؑ کے متعلق تو آپ کو معلوم ہے کہ ان سب ورد اور وظیفے اور جادو وغیرہ' کی نسبت حضرتِ سلیمانؑ کی طرف کی جاتی ہے کہ وہ سارے ورد وظیفے تعویذ گنڈے اور جادو وغیرہ کیا کرتے تھے۔ نقوشِ سلیمانیؑ تو کتابوں کا نام رکھا جاتا ہے۔ تو یہ جو قرآن کی آیتوں کے تعویذ لکھے جاتے ہیں ایک تو ان کا نام اعمالِ قرآنی ہوتا ہے۔ تو یہ جو تعویذ لکھنا ہے' جو وظیفہ کرنا ہے تو یہ اعمال ہو گیا۔ ''عامل'' ہمارے ہاں کہا ہی اس کو جاتا ہے۔ ''کسی عامل نوں سدو جی' تے عمل کراؤ جی''۔ ❷ قرآن نے جو عمل پہ زور دیا تھا تو اعمال ہی کو کہا تھا کہ یہ بنیاد ہے۔ آپ کے ہاں قرآن کی آیتوں پہ وہ عمل تعویذ لکھنا ہو گیا' پھر ڈگڈگی بجا کے' ڈھول بجا کے' وہ جن نکالتا ہے ''تے اونوں وی ایتھے عامل کیندے ہیگے نیں''۔ ❸ اور پھر جب آگے بڑھتا ہے ''تے تہانوں پتہ اے فیر عامل کینوں کیندے ہیگے؟ بھنگ پوست ڈوڈے پین والے نوں۔ ❹

---

❶ میں کیا بتاؤں کہ اس کے اور کیا معنی ہوئے۔
❷ کسی عامل کو بلاؤ جی' اور اس سے عمل کراؤ۔
❸ تو اسے بھی یہاں عامل کہتے ہیں۔
❹ کیا آپ کو یہ معلوم ہی ہے کہ پھر عامل کسے کہتے ہیں؟ بھنگ اور پوست پینے والے کو۔

## آج کے بچوں کی قابلِ رحم حالت

اب مجھے مشکل یہ ہے کہ ہمارے یہ اگلی نسل کے جونو جوان بچے ہیں، مجھے تو ان گونگوں پر رحم آتا ہے کہ ان کو کوئی زبان بھی نہیں آتی۔ ''ہورزباناں تے چھڈ، ایناں نوں پنجابی وی نئیں آوندی ہیگی''۔ ❶ آپ عزیزانِ من! لفظوں کے اوپر غور کر کے سوچیے کہ کہاں سے بات چلتی ہے اور کہاں پہنچ جاتی ہے۔ قرآن کی رو سے مدار ہی سارا عمل کے اوپر ہے بشرطیکہ اس کی بنیاد صحیح Ideology (نظریہ حیات) کے اوپر ہو جسے ایمان کہتے ہیں۔ ساری دنیا کا مدار ہی اعمال کے اوپر ہے۔ سارے قرآن میں یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ سے زندگی بنتی ہے:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری (بانگِ درا)

اس ❷ کا بات کرنے کا کیا حسین انداز ہے! یہ زندگی عمل سے زندگی بنتی ہے۔ عمل کے معنی آہستہ آہستہ تعویذ ہو گئے۔ اعمالِ قرآن، قرآن کی آیتوں کے تعویذ وظیفے ہوئے۔ چل بھئی معاملہ ختم ہوا۔ کتابیں اس کی چھپی ہوئی ہیں۔ یہ جہلا کی کتابیں نہیں ہیں۔ ''اے منشی رام دا لکھو نئیں ہوندا''۔ ❸ اب مجھ سے پوچھیں گے کہ وہ منشی رام کیا ہے اور کونسی چیز تھی۔

## ہمارے ہاں قرآن حکیم کی تعلیم تعویذوں اور وظائف کی نذر ہو گئی

عزیزانِ من! ہمارے ہاں کے جو بڑے بڑے علمائے کرام، قرآنِ کریم کے مفسر ہیں، یہ ان کی کتابیں ہیں کہ قرآن کی آیتوں کے تعویذ اور وظائف ہیں۔ یہ ان کی کتابیں ہیں۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ حضرت صاحب! میں بڑی کوشش کرتی ہوں، یہ مانگ سیدھی نہیں نکلتی، ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ یہ زمانہ آج کا تو تھا نہیں کہ اب تو ٹیڑھی ہی فیشن ہو گیا ہے، اس زمانے میں تو ٹیڑھی مانگ بڑی معیوب ہوتی تھی۔ کہا کہ میں بڑی کوشش کرتی ہوں مگر مانگ ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔ حضرت صاحب نے کہا کہ سات دفعہ **اهدنا الصراط المستقيم** پڑھ کر کنگھی پہ پھونک مار کر مانگ نکالو، سیدی نکل آئے گی۔ یہ ان کے ہاں قرآن کا عمل ہو گیا۔ ایک اور ''عمل'' دیکھیے۔ یہ قرآن میں بنی اسرائیل کے قصے میں ہے۔ اب یہ سیکریٹ (راز) ہے جو میں آپ کو بتا رہا ہوں لیکن Out of the Secret بتا رہا ہوں، اس لیے ابھی آپ استفادہ نہیں کریں گے۔ اس نے لکھا ہوا ہے کہ اگر خربوزہ پھیکا بھی ہو تو چاقو یا چھری پہ **فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ** (2:71) پڑھ کر سات دفعہ دم

---

❶ دیگر زبانوں کو تو چھوڑیئے انہیں تو پنجابی (اپنی مادری زبان) بھی نہیں آتی۔

❷ یہ اشارہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877) کی طرف ہے۔

❶ یہ منشی رام کا ''لکھو'' نہیں ہوتا۔

کیجیے' خربوزہ کاٹیے' میٹھا نکلے گا۔عزیزانِ من! ان کے ہاں یہ ہیں اعمالِ قرآنی۔کتابوں کے نام ہیں اعمالِ قرآنی۔ یہ ایسا کرنے والے 'عامل'' کہلاتے ہیں۔اب یہ تو پھر بھی قرآن کی آیتوں میں ہیں۔آگے جو آیات چلیں تو پھر تو آپ یہ کہتے ہیں کہ بھنگڑ پوستی بلکہ یہ چمار خانہ بدوش وغیرہ'' تے اے وی تہاڈے اتھے جن کڈن واسطے اوندے ہیگے نیں''۔ ❶ اب ان سے کہا کہ صاحب! آپ کے اس قرآن کی آیت سے بھی یہ ہوتا ہے اور وہ جو آ کر وہاں گیدڑ اور بندر کا تماشہ دکھانے والے ہیں' وہ بھی آ کر ڈھولک بجا کر کچھ کرتے ہیں تو یہ کیا ہوتا ہے؟ کہنے لگے کہ یہ نوری علم ہے اور وہ سیاہ (کالا) علم ہے۔چل بھئی! قصہ ختم ہوا۔بات تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ دونوں سے ہوتا وہی کچھ ہے۔

## میرے کے خلاف منکرِ حدیث ہونے کی ڈگڈی

میں عرض کر رہا ہوں' عزیزانِ من! کہ ان میں سے ہر عمل کی سند پھر پیچھے چلی آتی ہے۔جو یہ کہے کہ میرے رسول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب بہت بلند ہے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسی بات نہیں کہہ سکتے تھے' یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہو نہیں سکتی تو اس کا نام انکارِ حدیث ہے۔ یہ ہے جو تیس سال سے میرے پیچھے منکرِ حدیث کی ڈگڈگی بج رہی ہے۔اس قسم کی جو روایات ہیں ان کے متعلق میں عرض کرتا ہوں کہ یہ قرآن کے خلاف ہیں۔اس قسم کی باتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ان کا انکار کیا تو مجھے منکرِ حدیث کہا۔وہ جو' اب آصف ابنِ برخیاہ (Barchia) ہے' اس کے پاس کتاب کا علم ہے تو کہتے ہیں کہ اسے اسمِ اعظم آتا تھا۔اگر میں اس کی طرف حضرت سلیمانؑ کے قصوں میں چلا جاؤں تو ساری رات گزر جائے گی اور یہ قصے ختم نہیں ہوں گے۔

## حضرت سلیمانؑ کی انگوٹھی' اسم اعظم کا اور آپؑ کی بیویوں کا قصہ

عزیزانِ من! یہ قصے دن میں تو بیان کرنے کے نہیں ہیں کہ کس طرح سے وہ ان کی انگوٹھی تھی اور اس میں اسم اعظم تھا۔کہتے یہ ہیں کہ ایک دن وہ نہاتے ہوئے بھول گئے' یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اپنی بیویوں کے پاس آئے' وہ سات سو سے کم تو ان کی بیویاں گناتے ہی نہیں ہیں۔یہ سب کچھ آپ کے ہاں کی تفسیروں میں ہے۔اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ جو بیویاں تھیں وہ اکثر مشرک اور کافر قبائل سے تعلق رکھتی تھیں اور وہ اس وقت تک مشرک ہی تھیں۔انہوں نے بہکا بہکا کر حضرتِ سلیمانؑ کو بت پرستی پہ مائل کر لیا تھا۔اور پھر وہ حرم میں بھی تھیں اور باہر بھی اپنے ان لوگوں سے ملی ہوئی تھیں' ان کی مملکت کا' قوت کا' سارا راز' انگشتری (انگوٹھی) کے اندر تھا جس کے اوپر اسمِ اعظم لکھا ہوا تھا۔ایک دن وہ نہانے کے لیے گئے۔انہوں نے انگشتری اتار کر رکھ دی۔وہاں سے ہی وہ اسے بھول گئے۔بیوی نے اٹھایا اور کسی کو

---

❶ یہ بھی اب تمہارے ہاں ''جن'' نکالنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔

دے دیا۔ اور پھر بارہ برس بھٹی ❶ جھونکتے رہے ہیں، وہ اس لیے کہ وہ انگشتری گم ہوگئی تھی۔ بہر حال، یہ بات کیا کرنی ہے!!!

وہ جو اسمِ اعظم کا علم تھا وہ اسے پتہ تھا۔ اور آپ حیران ہوں گے کہ یہ جو کتابیں میں نے اعمالِ قرآنی کی گنائی ہیں ان میں اسمِ اعظم بھی ہوتا ہے۔ ''تے لین نہ اٹھ کے تر پیناں ہزاروں لبھن واسطے''۔ ❷ یہ سب تو ہم پرستی ہے۔ **اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ** (27:40)۔ اس نے کہا کہ قبل اس کے کہ آپ یہاں سے اٹھیں، میں لے آؤں گا۔ قبل اس کے کہ آپ آنکھ جھپکیں، میں یوں لاؤں گا! **فَلَمَّا رَاٰہُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَہٗ** (27:40) اس نے دیکھا، یوں کیا، اور سامنے تخت رکھا تھا۔ وہ یوں لے آیا ہے۔ یوں لانے سے اب آپ کے ذہن میں کچھ آیا ہے؟ وہ آپ کو Chief of Baghdad (رئیسِ بغداد) کی کہانی نظر آئی۔

## میرے بٹالہ کے دور کے مناظر کی کیفیت: پرویزؒ

میں بات بتا دوں کہ ان قصوں کے اوپر کہاں کہاں ہمیں مار پڑا کرتی تھی۔ اب یہ نہیں ہوتے، پہلے وہ بہت مناظرے ہوا کرتے تھے۔ میں بٹالہ کا رہنے والا تھا۔ وہ تو بڑا ہی مذہبی شہر تھا۔ مسلمانوں کے قریباً سارے ہی فرقے وہاں موجود تھے۔ آریہ سماجی ہندو، عیسائیوں کا تو وہ گڑھ تھا۔ اور اس زمانے میں مناظروں کی یہ روش بڑی عام تھی۔ اب تو یہ دنگل کشتیاں اور یہ ٹی وی، یہ کچھ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں یہ کچھ کم ہوتے تھے اور مناظرے بہت ہوتے تھے ''گل اکوای ہیگی سی''۔ ❸

---

❶ موجودہ زمانے کے تاریخی واثری تحقیقات کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ دنیا میں لوہے کے استعمال کا دور (Iron Age) 1200 اور 1000 ق م کے درمیان شروع ہوا۔ اول اول شام اور ایشیائے کوچک کی حتی قوم (Hittites) کو جس کے عروج کا زمانہ 2000 ق م سے 1200 ق م تک رہا، لوہے کے پگھلانے اور تیار کرنے کا ایک پیچیدہ طریقہ معلوم ہوا۔ انہوں نے اسے راز میں رکھا۔ بعد میں فلستیوں نے یہ طریقہ معلوم کرلیا۔ انہوں نے بھی اسے راز ہی میں رکھا۔ بائبل کے بیان کے مطابق حتی اور فلستی لوگ لوہے کی رتھیں استعمال کرتے تھے اور ان کے پاس دوسرے آہنی ہتھیار بھی تھے۔ حضرت داؤدؑ (1004-965 ق م) نے نہ صرف فلسطین و شرقِ اُردن بلکہ شام کے بھی بڑے حصے پر اسرائیلی سلطنت قائم کردی۔ اس زمانے میں آہن سازی کا راز جو حتیوں اور فلستیوں کے ہاں تھا، بے نقاب ہوگیا۔ فلسطین کے جنوب میں ادوم کا علاقہ خام لوہے (Iron ore) کی دولت سے مالا مال ہے اور بیسویں صدی کی پانچویں، چھٹی دہائی میں آثار قدیمہ کی کھدائیاں اس علاقے میں ہوئی ہیں۔ ان میں کثرت سے ایسی جگہوں کے آثار ملے ہیں جہاں لوہا پگھلانے کی بھٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ عقبہ اور ایلہ سے متصل حضرت سلیمانؑ کے زمانے کی بندرگاہ عصیون جابر کے آثارِ قدیمہ میں جو بھٹی ملی ہے اس کے معائنہ سے اندازہ کیا گیا ہے کہ اس میں بعض وہ اصول بیان کیے جاتے تھے جو آج جدید ترین زمانے کی بلاسٹ فرنیس (Blast Furnace) میں استعمال ہوئے ہیں۔

**Ref. Reader's Digest (1990). Universal Dictionary. London: The Reader's Digest Association Limited.**

❷ اس کی تلاش میں اسے لینے کے لیے کہیں بازار نہ نکل کھڑے ہونا۔

❸ بات ایک ہی ہوتی تھی۔

معاف رکھیے گا اگر میں اپنا ایک مناظرے کا قصہ بتاؤں۔ میں ان جھوٹی روایات یا تفسیری روایات کے متعلق گفتگو کر رہا ہوں' قرآنِ مجید کے متعلق (معاذ اللہ) نہیں' عزیزانِ من! یہ کتاب تو حکمت پہ مبنی ہے۔ کتاب بھیجنے والے کا دعویٰ ہے کہ یہ حکمت پہ مبنی ہے۔ وہ ادھر والے نے اعتراض کیا۔ وہ رامائن میں ایک قصہ آتا ہے۔ رامائن ہندوؤں کی بڑی مقدس کتاب ہے۔ اس میں ان کے جو اوتار رام ہیں' ان کی داستان ہے۔ لمبی داستان چھوڑ دیجیے۔ بقول رامائن ہوا یہ کہ ان کی بیوی کو لنکا کا بادشاہ راول لے گیا تھا۔ یہ اسے چھڑانے کے لیے وہاں گئے اور وہاں ان کے ساتھ ان کی جنگ ہوئی۔ ان کا بھائی لکشمن تھا۔ لکشمن کے زہر میں بجھا ہوا ایک تیر لگا۔ یہ رامائن کا قصہ ہے۔ اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ وہاں جوان کا طبیب تھا' اس نے کہا کہ ہمالیہ کی فلاں چوٹی پہ فلاں قسم کی ایک بوٹی ہے اگر وہ صبح ہونے سے پہلے آ جائے تو یہ بچ سکتا ہے ورنہ نہیں بچ سکتا۔ لنکا میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ہمالیہ کی چوٹی پہ وہ بوٹی ہے اور صبح سے پہلے پہلے آنی چاہیے تو رام سوچ میں پڑ گئے کہ بھائی گیا۔ ہنومان جی وہاں تھے۔ ہنومان جی بندروں کے دیوتا ہیں۔ اب یہاں وہ تصویریں بھی نہیں آتیں ورنہ ہندوؤں کے ہاں ہنومان جی کی تصویر ہوتی تھی۔ اس نے کہا کہ جی! میں لے کر آتا ہوں۔ یہ چلا گیا اور لنکا سے وہاں ہمالیہ چوٹی پہ آ گیا۔ وہاں آ کر دیکھا تو اس میں مختلف قسم کی بوٹیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اب سوچ میں پڑ گیا کہ پتہ نہیں وہ خاص بوٹی جو کہا تھا وہ ان میں سے کون سی بوٹی ہے۔ اس نے کہا کہ کوئی بات نہیں' اتنا سا جو ایک دائرہ تھا' جس میں بوٹیاں تھیں' وہ پورے کا پورا پہاڑ کا ہی ٹکڑا اس نے اٹھا لیا اور ہتھیلی پہ رکھ کر وہ وہاں سے چلا۔ خیر اس داستان کو کیا کرنا ہے۔ راستے میں آیا تو ان کے بھائی نے تیر مار دیا اور وہ بیچارہ نیچے گرا۔ وہ چیختا ہوا آیا اور اس نے کہا کہ بابا! میں تو اس کام کے لیے کہہ رہا ہوں۔ وہ تمہارا بھائی تو گیا' میں صبح سے پہلے نہیں پہنچ سکتا۔ اس نے کہا کہ کوئی بات نہیں' میں پہنچا دوں گا۔ ذرا کھڑے ہو جاؤ۔ وہ کھڑے ہوئے' اس کے پاؤں کے تلے کے نیچے اس نے اپنا تیر رکھا' تیر جو چلایا ہے تو ہنومان جی بمعہ پہاڑ جا کر لگا۔ ہنسیے نہیں۔ تو یہ جو چیز تھی یہ مناظر نے اس کے سامنے بیان کی۔

## ہماری تفاسیر اور ہمارے تراجم نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا

عزیزانِ من! یہ تیر اتنا گہرا تھا کہ اگرچہ اس زمانے میں' میں خود ''گونگا'' ہوتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ کرم تھا کہ یہ اس قسم کے تیر چبھ جایا کرتے تھے۔ تو یہ اس دن کا تیر اتنا چبھا ہوا تھا کہ آج تک یاد ہے۔ ہوا یہ تھا کہ اس نے کہا کہ جی' آپ نے ہنومان جی کا بہت مذاق اڑایا کہ وہ لنکا سے ہمالیہ' اور ہمالیہ سے پھر وہاں لنکا' وہ کچھ پہاڑ ہی اٹھا کر لایا۔ کہنے لگے کہ جی' وہ حضرتِ سلیمانؑ کے جو ''ہُدہُد'' تھے' ''وہ'' آنکھ جھپکنے کے عرصے میں اتنا بڑا تخت اٹھا کر لے آئے تھے تو اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا کہیں گے آپ!! آپ اسے صحیح مانتے ہیں؟ اگر اسے صحیح مانتے ہیں تو اس کے اوپر مذاق کرنے کی کون سی بات ہے۔ یہ ہوتا ہے ہمارے ساتھ' یہ تھا وہ تیر جو لگا تھا' جو

آج تک یاد ہے۔ وہ وہاں جتنے مناظرے ہوا کرتے تھے' وہ لوگ آپ کے ہاں کے جو مناظر تھے' ان سے زیادہ ان لوگوں کو آپ کی روایات کا علم تھا۔ میں نے پنڈت رام کو دیکھا۔ اس کو آپ کے ہاں کی یہ صحاح ستہ روایات کی کتابیں حفظ تھیں۔ کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا کہ ہم انہیں نہیں مانتے۔ تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ مانتے ہیں۔ یہ بات میں نے ایک وہاں کی نہیں سنائی بلکہ ساری دنیا میں جو آپ کا قرآن گیا ہے تو وہ ان تفاسیر کی رو سے پیش ہوا ہے' ان ترجموں سے پیش ہوا ہے۔

## قرآنِ حکیم کی تعلیم کے سامنے بڑے سے بڑا پادری بھی جواب نہیں دے سکتا

عزیزانِ من! میں اپنی بات نہیں کہہ رہا بلکہ قرآن کی بات کہہ رہا ہوں۔ وہاں کے بڑے بڑے متعصب پادری تک بھی میرے پاس آتے ہیں۔ یہ بڑے پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں' فلاسفر بھی آتے ہیں۔ یہ آ کر آپ کی اسی قسم کی جو تفسیریں اور روایات ہیں ان کی بنا پہ بات کرتے ہیں۔ میں پہلی بات ان سے یہ کہتا ہوں کہ اسلام میں سند خدا کی کتاب ہے۔ میرے پاس آئے ہو تو میرے نزدیک پہلا معیار یہ قرآن ہے' چلو بات آگے کرو اور بتاؤ کہ آپ کو کون سی بات قابلِ اعتراض نظر آتی ہے۔ قرآن سے ہی کہنا ہوگا اور قرآن سے ہی میں جواب دوں گا۔ عزیزانِ من! اللہ تعالیٰ کا یہ فضل و کرم ہے کہ جتنے بھی یہ بڑے بڑے فلاسفر اور یہ متعصب پادری آئے ہیں اُنہیں قائل کرنے کے لیے گھنٹہ بھر سے زیادہ وقت نہیں لگتا۔ یہ تو اس قرآنِ کریم کا' خدا کی عظیم کتاب' کا اعجاز ہے۔ کتاب حکمت کے اوپر مبنی ہو اور حکمت کی بات سننے کے لیے وہ خالی الذہن ہو کر آ گئے' تو پھر کیا بات ہے کہ وہ قائل ہو کر نہ اٹھیں۔ کوئی انسان ان سے بات نہیں کر رہا ہے۔ وہ تو خدا کی کتاب ہے اور اس کتاب کے ذریعے وہ خدا سے ہم کلام ہیں۔

## خدا کسی کی آزمائش نہیں کرتا بلکہ انسان اپنی صلاحیتوں کو آزماتا ہے

بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ صاحب! اس نے کہا کہ جی! میں ابھی سبا کا تخت اٹھا کر لایا۔ اور اس کے بعد آیت میں ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے سامنے دیکھا کہ وہ تخت آ گیا ہے تو کہا کہ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ (27:40) یہ فضلِ ربی ہے۔ لِیَبْلُوَنِیْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ (27:40)۔ اس کا ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ خدا میری آزمائشیں کرتا رہتا ہے کہ میں شکر گزار رہوں یا ناشکرا ہوں۔ یہ اس کا کتنا غلط ترجمہ ہے۔ سوچیے' ہم ایسے دوست کی آزمائش کرتے ہیں جس کے متعلق ابھی پورا یقین نہ ہو کہ یہ واقعی ہماری بات پہ مخلص ہے کہ بھئی! یہ ایک ضرورت آ پڑی ہے اس کے لیے تمہیں یہ سب کرنا ہوگا۔ تو یہ ہاں یا نہیں کہے گا۔ تو وہ کہے گا کہ ''او میں تے ایویں ای ازمونداساں تینوں گل نئیں ہیگی''[1] تو آزمانا یہ ہوتا ہے۔ جو دل میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہے' کائنات کے ذرے

---

[1] ابے! میں تو تمہیں یونہی آزما رہا تھا ورنہ کوئی بات نہیں تھی۔

ذرے کا اس کو علم ہے تو کیا وہ کسی کو آزمائے گا!!۔ وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ o قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ (27:40-41)۔ تخت آ گیا تو انہوں نے کہا کہ ذرا اس تخت کا حُلیہ بگاڑ دو۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ راہِ راست پہ آتی ہے یا نہیں؟ یعنی وہ وہاں سے تخت آ گیا تو وہ دوسرا تخت بنوانے میں مشکل کیا تھی۔ اور یہاں اس سے کہا یہ ہے کہ ذرا اس تخت کی شکل بگاڑ دو۔ کیا ہوگا اس شکل بگاڑنے سے؟

## ہمارے ہاں عرش کے تفسیری بیان کے برعکس عرش کا قرآنی مفہوم

اس کی شکل بگاڑ دو' پھر دیکھتے ہیں کہ راستے پہ آتی ہے یا نہیں ''آ تخت پوش جیہڑا اے اوہدیاں میخاں ٹھوک کے تے وچ پیچ لا دیو' فیر دیکھو تے سہی کہ صحیح راستے تے اوندی اے یا نئیں''[1] یہ ہے' عزیزانِ من! آپ کے ہاں تمام تفسیریں جوان چیزوں کو یوں بیان کرتی ہیں۔ ایک لفظِ عرش ہے اور یہ وہی جب اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے کہ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (10:3) کارگہ کائنات کو اس نے پیدا کیا' اس میں قوانین نافذ کیے' اس کی رو سے پھر وہ ہے ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (10:3) پھر وہ اپنے عرش پہ بیٹھ گیا۔ یعنی یہ سارا کچھ تو یہاں بھاگتے دوڑتے ہو رہا تھا اور ''کر کران دے بعد جس طراں منجی تے بیہہ جاندا اے بندا''۔[2] وہ عرش پھر آسمانوں کے اوپر رکھا۔ میں نے پچھلی دفعہ کہا تھا کہ وہ سات آسمانوں کے درمیان سات سو برس کا فاصلہ ہے' پھر آگے ایک سمندر ہے اور سمندر گہرا ہے سات سو میل کا فاصلہ ہے اور اس میں پہاڑی بکرے ہیں اور پہاڑی بکروں کے ٹخنوں تک اس کا پانی آتا تھا' پہاڑی بکروں کے سینگوں کے اوپر خدا کا عرش ہے اور اس عرش کے اوپر اللہ تعالیٰ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک لفظِ عرش ہے۔ عربی کے اتنے بڑے فاضل بہرحال اور عربی لٹریچر بھی سامنے ہے۔ اب بھی جب آپ تخت و تاج کہتے ہیں تو اس سے مملکت کی شان و شوکت اور قوت مراد ہوتی ہے' تخت نشین ہونے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ وہ سچ مچ اٹھ کر تخت پہ بیٹھ گیا ہے۔ کسی زمانے میں تو یہ تاج اور تخت بھی ہوتا تھا لیکن آج تو تاج بھی نہیں ہوتا' تخت بھی نہیں ہوتا۔ تخت کے معنی کنٹرول ہوتا ہے۔ عربوں کے ہاں یہ چیز بولی جاتی تھی: وہ جو مرکز کا کنٹرول ہوتا ہے وہ اسے تخت کہتے ہیں۔

## ملکہ سبا کے تخت و تاج کا معاملہ

انہوں نے یہ کہا تھا کہ وہ اپنے زعمِ باطل کے اندر مبتلا ہے کہ میرا کنٹرول' میری طاقت' میری قوت' بہت بڑی ہے۔ بتاؤ تم میں سے

---

[1] یہ جو تخت پوش ہے' اس کی کیلیں ٹھونک کر درمیان میں ایک پیچ (Screw) ٹکا دو۔ پھر دیکھو کہ صحیح راستے پر آئی ہے یا نہیں؟

[2] اور کام کرانے کے بعد جس طرح آدمی چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے۔

کون ہے جو اس کے زعمِ باطل کو اس کے اقتدار کو ذرا تھوڑا سا دھچکا دے۔ یعنی ہلکا سا حملہ کرے اتنے سے اسے معلوم ہو جائے گا کہ وہ کتنے پانی میں ہے اور یہ اس کا عرش کتنا مضبوط ہے۔ یہ اسے ایک حملے سے پتہ چل جائے گا۔ بتاؤ تم میں سے یہ مہم کون سر کرے گا؟ کتنے عرصے میں کرے گا؟ وہ ایک کہ جو صرف فوجی تھا اسنے کہا کہ میں سر کروں گا اور وہ بھی اتنے میں جتنے میں آپ ابھی یہاں سے کوچ کریں گے۔ وہ یہ نہیں ہے کہ اپنی جگہ سے اٹھیں گے نہیں بلکہ قبل اس کے کہ آپ یہاں سے کوچ کریں میں یہ مہم سر کر کے لاتا ہوں۔ دوسرے نے کہا: یہ عرصہ بھی ذرا زیادہ ہے۔ کوئی بات نہیں ہے میرے پاس اتنی قوت ہے یعنی علم الکتب ہے۔ اس کے پاس الکتٰب کا علم تھا۔ خواہ آپ یہ کہیے کہ وہ جو فوج کی Strategy (حکمتِ عملی) ہے وہ اس کا ماہر تھا یا وہ جو الکتٰب یعنی خط و کتابت ہو رہی تھی اسے اس کا علم تھا۔ قرآن نے تو ایک فرد کا ذکر کیا ہے تو وہ تو خط و کتابت ہو گئی اس میں پتہ نہیں کیا کیا چیزیں آئی ہوں گی۔ نظر آتا ہے کہ یہ زیادہ معتمد تھا پرائیویٹ سیکریٹری تھا اس کو اس کا بھی علم تھا یا یہ رموزِ مملکت کا علم رکھتا تھا۔ کچھ بھی ہے۔ قوانین کا علم کہہ لیجیے اس خط و کتابت کا علم کہہ لیجیے۔ اس نے کہا کہ یہ بات صرف قوت کی نہیں ہے۔ قوت تو ابلیس کے پاس بھی ہے۔

## قرانِ حکیم کو سمجھنے کے لیے تشبیہات' محاورات' ضرب الامثال اور ایمائیت کے موثر انداز کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے

قوت سے زیادہ علم کی ضرورت ہے اور میں کہتا ہوں کہ یہ ہے جو قرآن نے بات کہی کہ صرف قوت یا دماغ کی تیزی کافی نہیں ہوتی بلکہ مہمیں سر کرنے کے لیے علم کی بھی ضرورت ہوتی ہے خواہ وہ عسکری رموز کا علم ہی کیوں نہ ہو۔ اب یہ جو بات ہے یہ ہم روزمرہ محاورے میں بھی بولتے ہیں کہ ''آنکھ جھپکنے میں لاتا ہوں''۔ یہ ہمارے ہاں بھی کہتے ہیں اور لکھتے ہیں روزمرہ ہم بولتے ہیں۔ ''ذرا اکھ جھپکن دی دیر ہوئی تے سارا معاملہ ای وگڑ گیا اے۔''[1] وہ یہ نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ محاورہ ہے۔ او بابا! قرآن لسانِ عربی مبین میں نازل ہوا ہے عربوں کی اس دور کی ایک زبان ہے جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں اس زبان میں نازل ہوا ہوں۔ اب ہمارے ہاں کتاب لکھی ہو یا نظام ہو اس میں کہے کہ جو اردو کا لکھنوی انداز ہے وہ اُس اسلوب میں لکھی ہوئی ہے تو ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اس میں زبان کے محاورے کیا ہیں ضرب الامثال کیا ہیں استعارات کیا ہیں تشبیہات کیا ہیں۔ تو ان کی رو سے بات سمجھنی ہوگی۔ اگر آپ صرف Literal Meaning (لفظی معنی) لیتے چلے جائیں گے لفظوں کے معنی لیتے چلے جائیں گے تو بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ آنکھ جھپکنے کی دیر ہے میں آیا۔ کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ میں نے تو اتنے میں دس دفعہ جھپک لی ہے تو تُو پھر بھی نہیں آیا۔ وہ اس لیے کہ یہ دونوں سمجھتے ہیں لیکن

---

[1] ذرا آنکھ جھپکنے کی دیر ہوئی تو سارا معاملہ ہی بگڑ کر رہ گیا۔

اس کے معنی اس کے بعد اگر کوئی یہ کرے کہ یوں کرنا اس سے مراد ہے تو آپ سمجھ لیجیے کہ کیا سمجھے گا وہ۔ کہ جی! میں تو آنکھ جھپکنے کی دیر میں مہم سر کر کے آؤں گا۔ قوت بھی ہے' ذہانت بھی ہے اور میں عسکری علوم میں بھی دسترس رکھتا ہوں۔ اب پھر یہ قرآنِ کریم جو داستان بیان کرتا ہے تو اس کی جزئیات اور ٹکڑے سارے مسلسل بیان کرتا جاتا' وہ کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔ وہ درمیان میں سے جتنی ایسی جزئیات ہوتی ہیں کہ جن کی ضرورت نہیں وہ بیان نہیں کرتا۔ یہ بڑا خوبصورت انداز ہوتا ہے۔ لٹریچر کے جاننے والے اس کی داد دیں گے کہ لٹریچر کے اندر بھی' شاعری کے اندر خاص طور پہ' یہ جو Suggestiveness ہوتی ہے' جسے ایمائیت کہتے ہیں وہ یہی ہے کہ ساری بات یوں کھول کے بیان نہ کر جانا' ایک اشارہ دینا اور یہ سننے والے کے ذہن کے اوپر چھوڑ دینا کہ باقی جو اس میں ٹکڑا ہے وہ خود اس میں بھر لے مثلاً

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا' مری جو شامت آئی
اٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

## عربی لٹریچر میں قرآنِ حکیم کا ادبی اسلوب بدرجہ اتم ہے

اس شعر میں غالب [1] نے کچھ نہیں کہا کہ پھر میرے ساتھ ہوا کیا۔ ''جیہڑ یاں جوتیاں پیاں اوہدا کوئی ذکر نئیں۔'' [2] لیکن آپ پڑھیے' شعر پڑھنے کے ساتھ ہی ذہن میں آ جاتا ہے کہ جو ہوا ہے ہمیں پتہ ہے۔ اسے Suggestiveness (ایمائیت) کہتے ہیں۔ یہ بڑا ہی حسین انداز ہوتا ہے۔ یعنی اگر اس کو وہ کھل کر بیان کر دیتا کہ وہ مجھے سمجھتا تھا کہ فقیر مانگنے والا آیا ہے' کوئی بات نہیں ہے اور میں جو اٹھا تو وہ سمجھ گیا کہ نہیں صاحب! مانگنے والا نہیں ہے' یہ تو اندر جانا چاہتا ہے اور کچھ بدمعاشی والی بات ہے تو پھر اس نے وہ جوتیاں پھیریں۔ [3] آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر واقعہ ایسا آ گیا ہے' جیسا ہم تھانے میں رپورٹ دیتے ہیں۔ اگر وہ اسے کھل کر بیان کر دیتا تو اس میں جو شعریت کی لطافت ہے وہ اس کے اندر نہیں آتی۔

میں نے عرض یہ کیا ہے کہ یہ ادب کا انداز ہوتا ہے کہ اس میں Suggestiveness یعنی ایمائیت ہوتی ہے لیکن وہ ایسی ہونی چاہیے کہ خود آپ اس Gap (خلا) کو Fill in (پر) کر لیں' ایسا بھی نہ ہو کہ اس میں پتہ ہی نہ چلے۔ خوبصورتی سے اس کو چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کا اسلوب اعجاز یہ ہے۔ ادب کے میدان میں بھی' ادب کے معیار پر بھی' یہ عربی لٹریچر کی بلند ترین کتاب ہے۔ اس میں

---

[1] مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869ء)۔
[2] جو جوتے پڑے' اس کا کچھ ذکر نہیں ہے۔
[3] ''چھتر ول کیا''، یعنی جوتوں سے خاطر تواضع کی۔

بڑی Suggestiveness (ایمائیت) ہے۔ اور انداز یہ ہے کہ دوسرے مقام پہ جب بیان کرتا ہے تو جو کڑی یہاں بیان نہیں کی وہ وہاں بیان کرتا ہے' جو یہاں بیان کرتا' یہ وہاں چھوڑ دیتا ہے۔ اور ہم تصریفِ آیات والے کرتے یہ ہیں کہ ان ساری کڑیوں کو اکٹھا کر لیتے ہیں اور یہاں سے وہاں تک مسلسل داستان سامنے آ جاتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں اس کا تخت آنکھ جھپکنے میں لے آتا ہوں اور اس کے بعد جب دیکھا کہ وہ تخت سامنے تھا تو انہوں نے کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے۔

## خدا کا رسول یا نبی مادی لالچ اور ذاتی مفادات سے کہیں بلند ہوتا ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ ساری بات یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا ہے کہ ملکہ سبا کو اپنی قوت کے اوپر بڑا مان ہو گیا ہے' وہ Compromise (مفاہمت) چاہتی ہے' حق پہ نہیں آنا چاہتی' دولت کا لالچ دے کر مفاہمت چاہتی ہے' اسے معلوم نہیں ہے کہ ہمارے پاس کتنی دولت ہے اور اسے یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ کتنی قوت ہے۔ انہوں نے اپنے جو درباری سردار تھے ان سے مشورہ کیا اور ان سے کہا کہ بھئی! تھوڑا سا جھٹکا دے کے اس کو ذرا احساس دلا دو کہ کتنی قوت ہے۔ تحائف واپس کیے۔ یہ بتایا کہ ہمارے پاس کتنی دولت ہے اور ہم اس حرص اور لالچ میں نہیں آئے' مال لوٹنے کے لیے نہیں آئے۔ اس لیے اس کی قوت کو ہلانے کے لیے تھوڑا سا دھچکا دیا کہ معلوم ہو جائے۔ کہا کہ جب یہ چیز ہو گئی' تو اسے یہ معلوم ہو گیا کہ ہاں ہم قوت والے بھی ہیں۔ ابھی میں عرض کروں گا' یہ اگلی آیتوں میں ہے کہ پھر وہ چلی آ رہی ہے۔ اس نے اتنے ہی میں Surrender (ہتھیار ڈال دیئے) کر دیا ہے۔

## قرآنِ حکیم کا طریق اور اس کی تعلیم عجوبہ پرستی کی رہین منت نہیں

اب یہاں سمجھ آیا کہ **قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّی** (27:40) کہا کہ کتنا اللہ تعالیٰ کا مجھ پر فضل ہے۔ یروشلم سے ملکِ غیر میں' یمن میں چل کر آیا ہوں اور یہاں آنے کے بعد دیارِ غیر میں بیٹھا ہوں۔ ذرا سا دھچکا دیا ہے اور وہ اتنے میں ہی راہِ راست پر آ گئی۔ یہ ہے **هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّی** (27:40) ورنہ اگر وہی جو ''جن'' تھے' وہ اٹھا کر لاتے تو اس میں پھر فضلِ ربی کا سوال ہی نہیں ہے۔ وہ تو ان کا عجوبہ ہوتی مجھ میں تکبر اور غرور نہ آتا تو میں اس کے سامنے اور جھک جاتا ہوں۔ پھلدار درخت کی شاخ میں اس لیے پھل لگتا ہے' کہ وہ اور جھک جائے۔ یہ تو بے ثمر ٹہنی ہوتی ہے جو اوپر کو کھڑی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ جو ثمر بار ٹہنی کا یوں جھک جانا ہے اسے شکر کہتے ہیں۔ اس قسم کے مواقع آنا اور ان کو Meet (پورا) کرنا اور کامیابی کے بعد دل میں اپنا جو Ego یا انا ہے' اس کی طرف نہ جانا کہ ہاں دیکھا صاحب! کہ مار مار کے کیا بنا دیا' بلکہ یہ کہ یہ اس کا دیا ہوا فضل ہے' یہ اس کی عطا کردہ قوتیں ہیں جن سے یہ ہوا ہے۔

## زندگی کی کامیابی اور ناکامی کا راز شکر اور کفر کے دو الفاظ میں ضم ہے

شکر کے معنی ہوتا ہے ''کسی قوت یا صلاحیت کو اس طریق میں یا اس مقصد کے لیے استعمال کرنا جو خدا نے مقرر کیا ہے''۔ اس کے خلاف اسے کچھ اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا کفر کہلاتا ہے۔ کہا کہ اس قسم کے مواقع اس لیے آتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو دیکھیں کہ ہماری کیفیت کیا ہے۔ اپنی قوت کا اندازہ لگائیں اور پھر یہ دیکھیں کہ اس کے بعد جو حاصل ہوتا ہے' اسے ہم استعمال کس طرح سے کرتے ہیں۔

اگلی بات قرآن یہ کہتا ہے کہ **وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ**(27:40)۔ یہ جو اس وقت اس کا شکر ہوتا ہے' کہتا ہے کہ یہ ساری چیزیں خدا کی عطا کردہ ہیں۔ وہ انہیں ان کے صحیح مقام پہ صرف کرتا ہے۔ کہا کہ یہ جو کہا ہے کہ میں خدا کا شکر کرتا ہوں تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ **فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ** (27:40) ارے' وہ تو بے نیاز ہے' اس کو کیا ضرورت ہے کہ تم اس کا شکر ادا کرو' تو اس کا کچھ بن جائے اور نہ ادا کرو تو اس کا کچھ بگڑ جائے' وہ بے گھر ہو جائے۔ وہ تمہارے شکر اور کفر سے بے نیاز ہے۔ **وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ** (27:40) جو یہ Attitude (رویہ) اختیار کرتا ہے کہ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی اس کے اندر تکبر اور تفاخر نہیں آتا' وہ انسانوں کو کچلتا نہیں ہے بلکہ اور جھکتا ہے۔ کہا کہ یہ اپنی ذات ہی کے لیے ایسا کرتا ہے۔ خدا کا شکر ادا کرنے کے لفظ تم بولتے ہو تو خدا کا اس میں کچھ نہیں بنتا کیونکہ **وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ** [1] (27:40)۔ ساری دنیا صبح اٹھ کر آنکھ بند کر لے تو سورج کی روشنی میں تو کوئی کمی نہیں آتی۔ اگر کوئی اپنی آنکھ کھولتا ہے تو اپنے ہی لیے اس کو فائدہ ہوتا ہے کہ راستہ دکھائی دیتا ہے۔ بند کر لے تو وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے' راستہ تاریک ہو جاتا ہے۔ سورج کا کچھ نہیں بگڑتا۔

عزیزانِ من! داستان History (تاریخ) کی بیان ہو رہی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ساتھ ہی ساتھ قرآن کیا کرتا چلا جاتا ہے۔ خالص تاریخ کی کتاب میں درمیان میں یہ بات نہیں آئے گی۔

## انسانی زندگی کا راز اس میں ہے کہ انسان Opportunities (مواقع) سے استفادہ کرتا ہے یا نہیں

قرآن کریم کہتا ہے کہ **لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ** (27:40)۔ اس میں ''لیبلونی'' کا لفظ آیا ہے۔ اس کا مادہ ''ب ل و'' ہے۔ اسی سے لفظ ''ابتلا'' آتا ہے۔ عربی میں ''ابتلا'' کے معنی ہیں ''کسی کام کے لیے مواقع بہم پہنچانا''۔ یہ زندگی ہے' اس میں بڑی چیز یہ ہے کہ کوئی Opportunity (موقع) آپ کے سامنے آئے۔ زندگی کا راز یہ ہے' عزیزانِ من! کہ کیا آپ Opportunity

---

[1] خدا اس سے بے نیاز ہے کہ وہ انسانوں کی محنت کے ماحصل سے کچھ لے۔ اس کے پاس بہت کچھ ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔869)۔

(موقع) کے سینگوں کو ہاتھ ڈالتے ہیں یا نہیں؟ ناکام وہ ہے جس کے سامنے Opportunity (موقع) آتی ہے اور وہ اسے Miss (ضائع) کر جاتا ہے۔ کامیاب وہ ہے جو صحیح Opportunity (موقع) آتی ہے تو اس کو Avail (فائدہ حاصل) کر لیتا ہے۔ ابتلا کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ کہا ہے کہ ہم انسانی زندگی میں اس کو مواقع بہم پہنچاتے چلے جاتے ہیں پھر یہ اس کے اوپر ہے کہ وہ کس طرح سے ان مواقع سے فائدہ اٹھاتا ہے اور کیسے اس چیلنج کو Meet (پورا) کرتا ہے۔

## Opportunity (موقع) تو انسانی صلاحیتوں کا اپنا ایک ٹیسٹ ہوتا ہے

''ابتلا'' کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خدا انسان کو آزماتا ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ انسان اپنے آپ کو آزماتا ہے کہ مجھ میں کتنی قوت اور صلاحیت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ جو دنگل وغیرہ ہوتے ہیں، تو ان میں کوئی دوسرا نہیں آزماتا، وہ اپنے آپ کو آزمانے ہیں کہ مجھ میں کتنی قوت پیدا ہوگئی ہے۔ Opportunity (موقع) آتی ہے اور انسان خود اپنا ٹیسٹ کرتا ہے، ورنہ انسان زعمِ باطل میں مبتلا رہتا ہے کہ کوئی بات نہیں صاحب! ہمارے سامنے تو آئیں ہم بھرکس نکال دیں گے۔ جب تک کوئی سامنے نہ آئے تو Actually (درحقیقت) پتہ نہیں لگ سکتا کہ بھرکس نکال دیں گے یا نکلوالیں گے۔ یہ جسے ٹیسٹ کہتے ہیں کہ اپنا ٹیسٹ کرنا ہے، یہ امتحانِ خویش ہے۔ اسے عربی زبان میں ابتلا کہتے ہیں۔ ''بلا'' جو اس سے لفظ نکلتا ہے تو اس کے معنی ''پہلو بدلنا'' ہوتے ہیں۔ انسان اپنی ذات کا ایک پہلو بدلتا ہے۔ عام زندگی میں ایک انداز ہوتا ہے، سامنے مشکل آتی ہے تو اس کو Meet (مقابلہ) کرنے کے لیے ایک اور انداز ہوتا ہے۔ اس پہ پورا اترتا ہے تو یہ خود اپنی ذات کا امتحان ہوتا ہے۔

## کامیابی کے ثمرات پر تکبر میں مبتلا ہونے کی بجائے ذاتِ خداوندی کا ''شکر'' ادا کرنا ہوگا

یہاں کہا ہے کہ اس قسم کے مواقع خدا بہم پہنچاتا ہے تاکہ ہم دیکھیں کہ ہمارے اندر کتنی صلاحیت اور قوت آ گئی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اس قسم کے حوادث کے اوپر اس طرح سے قابو پا لیتے ہیں۔ اب وہاں آیا کہ **اَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ** (27:40) ایسے موقع پر خیال آئے گا کہ کامیابی ہوگئی، فتح حاصل ہوگئی۔ اب ملکہ سبا آ گئی۔ آگے بات یہ چل پڑی اور یوں ہوا۔ یہ ہے قرآن کہ جس مقام پہ یہ چیز آئی کہ صاحب! اتنی بڑی فتح، اتنی بڑی کامیابی کہ وہ Surrender (ہتھیار ڈال) کر کے چلی آئی ہے۔ اس کے بعد تو آگے بڑھ جانا چاہیے تھا، نہیں بلکہ وہیں وہ بات ہوگئی کہ ایسے مواقع کے اوپر انسان جو عام بادشاہ ہے وہ زیادہ تکبر میں، تفاخر میں آ جاتے ہیں، اکڑ جاتے ہیں۔ خدا کے اقدار پر عمل کرنے والا اس قسم کی کامیابیوں کو دیکھتا ہے تو اور جھک جاتا ہے۔ جو حاصل ہوتا ہے اس کو خدا کے بتائے ہوئے مواقع پہ صرف کرتا ہے۔ اس کو شکر کہتے ہیں۔ کہا کہ **وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ** (27:40) جو ایسا Attitude (رویہ)

اختیار کرتا ہے‘ اس کو اپنی ہی ذات کا فائدہ ہوتا ہے۔

## وحی کے بغیر انسانی عقل کے خدشات اور اس کا عمل

اس آیت وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ (27:40) میں ’’نفس‘‘ کے معنی دیکھیے۔ کہا ہے کہ اس کی جو Personality (شخصیت) ہے‘ اس کا فائدہ ہوتا ہے۔ اپنی ذات کے فائدے کے لیے وہ کرتا ہے۔ Personality (شخصیت) Developement (نشوونما) اس طرح سے کرتا ہے کہ جب قوت اور اقتدار ہاتھ میں آئے تو وہ اور انسانیت ساز بنتا چلا جائے۔ اس سے اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ آگے قران بتاتا ہے کہ قَالَ نَكِّرُوا لَهَا عَرْشَهَا (27:41) حضرت سلیمانؑ نے کہا کہ تم مملکت میں زیادہ فساد نہ مچانا‘ مملکت کے اندر تباہی نہ لانا۔ اس ملکہ نے اپنے اہلِ دربار سے کہا تھا کہ جب بادشاہ یورش کیا کرتے ہیں تو وہ الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا کرتے ہیں۔ یہ قرآن کے الفاظ ہیں لیکن یہاں یہ صورت ہے کہ ایک ہی جھٹکے سے کامیابی حاصل ہوئی ہے تو کہا ہے کہ زیادہ بگاڑ نہ پیدا کرنا۔ یہاں لفظ ’’نَكِّرُوْا‘‘ آیا ہے۔ کچھ ایسی شکل پیدا کرنا جس سے معلوم ہو جائے کہ یہاں کچھ ہوا‘ کچھ بہت سی ناخوش آئند بات ہوتی ہے۔ اگر اس کو اسی حالت میں رکھا جائے جس سے وہ پہچانی جاتی ہے تو عرب اس کو عربی زبان میں نَكِّرُوْا [1] کہتے ہیں‘ اس کو تعریف کہتے ہیں اور اس کو تھوڑا سا بدل دیا جائے تو اسے تنکیر کہتے ہیں۔ تو کہا کہ بس اتنا سا کرنا‘ اس سے زیادہ نہیں۔ نَنْظُرْ أَتَهْتَدِيٓ أَمْ تَكُونُ مِنَ الَّذِينَ لَا يَهْتَدُونَ (47:41)۔ پھر دیکھنا کہ اتنے سے ہی وہ صحیح راستے پہ آ جاتی ہے یا نہیں آ جاتی۔ یعنی قدم قدم کے اوپر اس کو موقع دیتے چلے جا رہے ہیں۔ تحفے واپس کیے تو پہلی چیز یہ ہے کہ ہم مال و دولت کے لالچ میں نہیں آئے‘ تم اس زعم میں نہ رہنا۔ یہ بھی ایک چیز تھی۔ پھر اس کے بعد باز نہیں آئی‘ اس نے ان Terms (شرائط) کو نہیں مانا تو پھر کہا کہ تھوڑا سا جھٹکا دو۔ پھر کہا کہ دیکھو‘ آیا وہ اس سے بھی راہِ راست پہ آتی ہے یا نہیں۔ اور وہ بات سمجھ گئی۔ یہ تدبیر کارگر ہو گئی اور ملکہ سبا نے شکست مان لی۔

## مروجہ تراجم کے برعکس ان آیات کا مفہوم اور ملکہ سبا کا باوقار اعتراف

قرآن بتاتا ہے کہ فَلَمَّا جَآءَتْ قِيلَ أَهَٰكَذَا عَرْشُكِ (27:42)۔ ہمارے ہاں یہ کہتے ہیں کہ جب ملکہ سبا آئی تو

---

[1] ابن فارس نے کہا ہے کہ نُکْرٌ ایسی بات کو کہتے ہیں جو خوش آئند نہ ہو جسے دل قبول نہ کرے۔ اور تاج العروس کے مطابق نَکَرَ الْاَمْرُ کہتے ہیں کہ معاملہ دشوار ہو گیا۔ اَلنُّکْرٌ اء مصیبت اور سختی کو کہتے ہیں۔ نَکَرَ اء الدَّھْرِ زمانے کی سختی اور مصیبت کو کہتے ہیں۔ ان نکات کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد چہارم‘ ادارہ طلوع اسلام‘ لاہور‘ 1961‘ ص ص۔ 1660 تا 1662۔

اسے کہا کہ دیکھو! یہ ہے تمہارا تخت؟ کیوں کہ اس کو بگاڑ دیا ہوا تھا۔ **قَالَتْ كَأَنَّهُ** (27:42) وہ کہنے لگی کہ یہ وہ تو نہیں ہے۔ ''آٹھوس زنانیاں والی گل اے'' [1] یہ بات محاورے کے طور پہ نکل جاتی ہے ورنہ بہنوں بیٹیوں کا احترام تو میرے ذہن میں ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرتِ سلیمانؑ نے کہا کہ یہی تھی تمہاری قوت؟ یہاں عرش کے معنی نظر آ گئے۔ اس قوت کے گھمنڈ کے اوپر تم اترا رہی تھیں۔ میں نے تمہیں اتنے مواقع دیئے کہ یہ کچھ نہ ہونے پائے اور صحیح بات تمہاری سمجھ میں آ جائے۔ اب سمجھ میں آئی' جھٹکا دینے سے تم باز آئیں؟ اس نے کہا کہ ہاں' وہ قوت وثروت کچھ ایسی ہی تھی۔ قرآن نے دو الفاظ میں ساری بات ملکہ سبا کے منہ سے کہلوا دی ہے کہ **كَأَنَّهُ هُوَ** (27:42) سچ مچ وہ قوت وثروت کچھ ایسی ہی تھی۔ اس کانہ کے اندر' اس ''ک'' کی کیا بات ہے کہ ''بس ایسی ہی تھی''۔ اور بات بھی کوئی عوامی نہیں کر رہے' وہ بھی مقابل کی بہر حال ایک بادشاہ ہے۔ انداز تو گفتگو کا وہی ہے۔ اس میں آپ دیکھتے ہیں کہ سُبکی بھی نہیں ہے' اعترافِ ذلت بھی نہیں ہے' اس کا بھی اعتراف ہے کہ وہ قوت تمہارے مقابل میں نہیں تھی۔ کیا بات ہے ان کے کہنے کی کہ کیا یہی تھی وہ قوت؟ کہتی ہے کہ ہاں کچھ ایسی ہی تھی۔

کہا کہ بات یہ ہے کہ **وَأُوتِينَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا** (27:42) یہ اتنے سے جھٹکے سے نہیں بلکہ ہم نے اس دوران بہت سی معلومات حاصل کر لی تھیں' اس لیے ہمیں اس کا علم ہو گیا تھا کہ ہماری قوت تمہارے مقابلے میں کچھ ایسی ویسی ہی ہے۔ اس لیے یہ وجہ ہے جو **وَكُنَّا مُسْلِمِينَ** (27:42) جو میں Surrender (اطاعت پذیری) کر کے آ گئی ہوں۔ پوچھا کہ پہلے ہی کیوں نہ بات مان لی؟ تمہیں معلومات بھی حاصل ہو گئی تھیں' تمہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہم Compromise (مفاہمت ومصالحت) نہیں کریں گے' مالِ غنیمت والی بھی کوئی بات نہیں ہے کہ ہمیں لالچ آ جائے۔ تو پہلے کیوں نہ آ گئی؟

اب یہاں پھر قرآن کی بات آئی۔ قرآن کی بات کا کہانی کے بیچ میں سے وہ ٹکڑا آیا ہے۔ اب یہاں مذہب آ گیا اور یہی ہے وہ چیز جو انسان کے اندر کسی چیز کے ماننے یا کسی سے انکار کرنے کی سب سے زیادہ قوت ہوتی ہے۔ وہ مذہبی عقیدہ ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُونِ اللّٰهِ إِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِينَ** (27:43)۔ اس سراغ رساں نے آ کر وہ کہا تھا جسے وہ مذہب والے ٹیڑا یعنی ہدہد کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا ہے کہ وہ سورج کی پرستش کرنے والی قوم ہے اور اس کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی۔

## حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے پیش کردہ تعلیم

کیا بات ہے حضرتِ ابراہیم کی کہ **لَآ أُحِبُّ الْآفِلِينَ** (6:77)۔ انہوں نے بھی تو اپنی ستارہ پرست' آفتاب پرست قوم کو کہا تھا

---

[1] یہ تو پکی عورتوں والی بات ہے۔

کہ لمبی چوڑی دلیل نہیں ہے' دلیل اتنی ہی ہے کہ جو آج ہے اور شام کو نہیں ہے' ایسے کو خدا ماننا کیا ترغیب دیتا ہے' جو تغیر پذیر ہو' وہ خدا کیا ہوا؟ لَآ اُحِبُّ (6:77) میں چڑھنے کے بعد جو ڈوب جانے والے ہیں' انہیں پسند نہیں کرتا۔ میں تو اس خدا پہ ایمان لایا ہوں جو اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (2:255) زندہ ہے' تو زندہ ہی رہے گا۔ وہ طلوع ہونے کے بعد غروب نہیں ہوتا۔ ہر انسانی قوت' مملکت' بادشاہت' طلوع ہونے کے بعد غروب ہوتی ہے' عزیزانِ من! ایک ٹکڑے نے سیاست کا سارا مسئلہ حل کر کے رکھ دیا ہے۔ کہا کہ ان کا خدا چڑھتا ہے تو سورج کی طرح چڑھتا ہے' بلندیوں کی طرف جاتا ہے پوچھو نہیں نصف النہار پہ پہنچ کر جلا کے رکھ دیتا ہے اور اس کے بعد زوال شروع ہو جاتا ہے' شام ہوتی ہے تو بالکل اپنے خون کی رنگینیوں میں ڈوب جاتا ہے' کہا کہ جو چڑھنے کے بعد ڈوب جاتا ہے کیا میں اس کو خدا مان لوں؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ ہم سے کہا ہے کہ زندگی کا انداز سیکھنا ہے تو ابراہیمؑ سے سیکھو۔ طلوع کے بعد جو غروب ہو جاتا ہے' اس کو خدا کیوں مانتے ہو؟ اسے مانو جس کے طلوع کو کبھی غروب نہیں آتا۔

## دل و دماغ میں راسخ ہو جانے والا عقیدہ دلیل کے حق میں رکاوٹ بنا رہتا ہے

یہاں بھی اس نے کہا کہ بات یہ تھی کہ میں سمجھ بھی گئی تھی' معلومات بھی آ گئی تھیں۔ اس کے باوجود ایک چیز میرے راستے میں حائل ہو رہی تھی اور وہ تھی معبودوں کی' جن کی میں پرستش کرتی تھی۔ وہ جو عقیدہ تھا اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا اور مجھ سے کہا یہ جا رہا تھا کہ یہ ہمارے دیوتا مدد کریں گے۔ یہ سورج دیوتا مدد کریں گے۔ وہ آپ لوگوں کو کافر کہتے تھے اور مجھے یہ بتاتے تھے کہ یہ دیوتا مدد کریں گے۔ بہرحال قرآن نے ایک ہی بات کہہ دی کہ ایسے معاملات میں عقل و فکر اور سمجھ بوجھ کام نہیں دیا کرتا۔ وہ جو عقیدہ ہوتا ہے' وہ اس کے راستے میں حائل تھا ورنہ بات تو وہ سمجھ چکی تھی۔ یہ ہے قرآن' عزیزانِ من! دنیا میں کتنے معاملات ہیں جو اس لیے نہیں سلجھ سکتے کہ راستے میں غلط عقیدہ حائل ہوتا ہے۔ عقیدہ خواہ مذہب کا ہو' خواہ سیاست کا ہو' خواہ معیشت کا ہو' خواہ معاشرت کا ہو' کوئی شے بھی جو عقیدے کی حیثیت سے دل میں جاگزیں ہے' وہ عقل و فکر اور Reason (استدلال) کو کامیاب نہیں ہونے دیتی' وہ راستے میں حائل ہوتی ہے۔ اگر اس کا ترجمہ کرنا ہے تو اس کو جذبہ کہیے۔ انسان کے جذبات اس کی عقل کے اوپر حائل ہوتے ہیں۔

## ایک شرابی کی طرح آج تک کسی فلاسفر نے بھی کوئی تعمیری اور عملی کام نہیں کیا

کیا آپ کو معلوم ہے قرآن نے ان جذبات کے متعلق کیا کہا ہے؟ کہا یہ ہے کہ اگر عقل و فکر کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو انسان ہی نہیں رہتا اور اگر خالص عقلی اور فکری بات ہو تو وہ فلاسفر ہوتا ہے' وہ دنیا میں کسی کام کا نہیں ہوتا۔

عزیزانِ من! کسی فلاسفر نے عملی اور تعمیری طور پر کچھ کر کے نہیں دکھایا۔ وہ خالص جذباتی ہوتا ہے۔ پوچھو ہی نہیں وہ صرف تباہیاں

لاتا ہے' فکر ساتھ ہوتی ہی نہیں ہے' صرف جذبہ ہی ہوتا ہے۔ وہ شرابی ہوتا ہے۔ نہ شرابی کچھ کر سکتا ہے نہ فلاسفر کر سکتا ہے۔ نہ آپ کے ہاں کے مفکر اور فلسفہ دانوں نے کبھی دنیا میں کوئی انقلاب برپا کیا اور نہ آپ کے ہاں کی ان خانقاہیت کے خلوت کدوں میں رہنے والوں نے کچھ کر کے دکھایا ہے۔ اب تو سوال یہ ہے کہ تعمیری اور عملی کام کون کرے گا؟

## دل و دماغ کو صرف وحی کا چراغ ہی روشن کرتا ہے

قرآن کہتا ہے کہ حقائق کو سر کے راستے سے دل میں اترنا چاہے' ان کا مقام قلب ہی ہے لیکن اتریں گے وہ فکر کے راستے۔ کیا عرض کروں' عزیزانِ من! معلوم نہیں زندگی کتنی ہے۔ اے کاش! اس طرح سے مجھے زندگی میں کبھی طالبعلموں کی کلاس مل جاتی:

تو اقبالؒ ان کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے ❶

میں ان طالبعلموں کو سمجھاتا کہ قرآن کیا ہے؟ یہ کہ دماغ کے راستے دل میں اترنے والی بات ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جو خالص جذباتی مذہب کی چیز ہے تو یہ کمبخت راستے میں حائل ہو جاتی ہے۔ مذہب کی دنیا میں عقیدہ کہہ لیجیے' باقی جتنے دوائر ہیں زندگی میں' حقیقت میں لڑائی اسی کی ہوتی ہے۔ Reason (استدلال) اور جذبہ آپس میں لڑتا ہے۔ جب کیفیت یہ ہو کہ یہ اس کے راستے سے نیچے اترتا ہے تو اس کی کشمکش نہیں ہوتی۔

## ملکہ سبا کے لیے حق بات کو تسلیم کرنے کے راستے میں مذہب سب سے بڑی رکاوٹ تھا

ملکہ سبا نے کہا کہ میں سب کچھ جانتی تو تھی لیکن کیا کہوں' مذہب کی عقیدت مندی راستے میں حائل ہو رہی تھی۔ قرآن نے بتایا کہ زندگی میں مذہب کا مقام کیا ہے' وہ حقائق تک نہیں آنے دیتا۔ جواس نے کہا ہے کہ یاد رکھو! **اَلْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** (9:34)۔ یہ علما ہوں یا مشائخ ہوں' یہ صوفیا ہوں یا پیر ہوں' ان کی کیفیت یہ ہے کہ ایک تو بغیر کچھ کام کیے لوگوں کا مال کھا جاتے ہیں اور خدا کے راستے کی طرف جو دنیا جاتی ہے تو اس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ تو سچ مچ کے یوں نہیں کھڑے ہو جاتے' بلکہ یہ جو غلط عقیدہ پیدا کر دیتے ہیں اور پھر

---

❶ ڈاکٹر محمد اقبال (1877-1938) کا پورا شعر یوں ہے۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

جرمنی کا یہ مشہور مجذوب فلسفی نطشہ (1844-1900) ہے جو اپنے قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کر سکا اور اس لیے اس کے فلسفیانہ افکار نے اسے غلط راستے پہ ڈال دیا۔

روز وعظوں میں، نصیحتوں میں، ذکروں میں، اس کو Hammer (ذہن نشین) کرتے رہتے ہیں، وہ ہے اصل چیز جو حق بات کو تسلیم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ قرآن حکیم نے اسے وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (9:34) کہا ہے۔ دعویٰ ان کا یہ ہے کہ ہم خدا کی طرف جانے والے راستے کی طرف تمہاری راہنمائی کرتے ہیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہی تو حقیقت میں اس راستے میں روک بن کر کھڑے ہیں۔ کہا کہ یہ تھی بات! ملکہ سبا کے الفاظ میں بات اتنی سی تھی۔

بہر حال، ملکہ سبا مہمان بن کر آئی۔ عزت و تکریم ہو رہی ہے، شوکتِ سلیمانیؑ سامنے آ رہی ہے حالانکہ اس دور کے اندر جنود و عساکر کے ساتھ گئے ہیں اور دیارِ غیر میں ہیں۔ بتایا یہ ہے کہ دنیا میں فوجی نقل و حرکت میں بھی شوکتِ سلیمانی ضرب المثل ہے۔ کہا کہ وہاں بھی، خواہ وہ خیمہ ہی ہوگا لیکن وہ اس قسم کا تھا کہ وہ جڑاؤ تھا، آئینہ دار تھا۔ اس کو یہ دکھانے کے لیے اس کے اندر ٹھہرایا کہ تم نے جو تحفے بھیجے تھے اور مال و دولت کا لالچ دینا چاہتی تھی ذرا دیکھو تو سہی کہ ٹینٹ (خیمے) میں ہماری رہائش کی کیفیت کیا تھی۔ یہ چیزیں حرام نہیں ہیں۔ مومن کے لیے تو یہ چیزیں عینِ زندگی ہیں، عینِ حیات ہیں۔

## پرویزؒ پر کفر کے فتویٰ کی ایک شق ان کے ہنسنے کے متعلق بھی تھی

قرآن کہتا ہے کہ کون ہے وہ جو ان چیزوں کو حرام قرار دے جنہیں ہم نے انسانوں کے لیے وجہ زینت بتایا ہے مگر یہ ہیں کہ کہتے ہیں کہ سونا حرام ہے، ریشم حرام ہے، ہنسنا حرام ہے۔ جب مجھ پر پہلا فتویٰ لگا تھا تو اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ جب یہ ہنستا ہے تو اس کے دانت نظر آتے ہیں، ''میں دندای کڈ وادِتے۔ ہن میں جدوں ہنساں تے ایناں نوں کڈ لیناں کہ فتویٰ نہ لگے کفر دا''[1] مفتی کفایت اللہ[2] جیسے لوگوں نے کفر کا فتویٰ لگایا۔ اندازہ لگاؤ کہ کتنا بڑا ان کا نام نظر آتا ہے اور اس میں تکفیر کا آئٹم کیا ہے۔ اس قسم کے کیمپ کے اندر تو ان کی رہائش ہے۔ میں کیا کہوں؟

## ہمارے ہاں کی اخلاق سوز تفسیروں کی تفصیل

پہلے یہ سن لیجیے کہ تفسیر کیا کہتی ہے۔ کہا کہ انہوں نے اس کے لیے ایک ایسا مکان بنوایا، اس کے نیچے سارا فرش شیشے کا لگا ہوا تھا اور اس کے نیچے پانی چلا دیا۔ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا (27:43) وہ جب وہاں آئی تو اس نے دیکھا کہ پانی موج در موج چھلیں مار رہا ہے۔ کہنے لگی کہ بس! اس نے تو میرے مارنے کے لیے تدبیریں کی ہیں، بددل ہوگئی، کھڑی ہوگئی، کرے

---

[1] میں نے دانت ہی نکلوا دیئے۔ اب جب میں ہنسوں تو انہیں نکال باہر کرتا ہوں تا کہ فتویٰ کفر تو نہ لگے۔

[2] مفتی کفایت اللہ (1988-1924ء)

کیا' آگے پانی ہے!!''اونے اے پونچے چک لیے۔ ❶ یہ چھلیں مارنے والا پانی تھا اور یہ سمجھا کہ میں نے ذرا پائنچہ اوپر کرلیا تو بچ گئی۔ پائنچہ اوپر کرلیا تو اس سے ذرا سی پنڈلی ننگی ہوگئی۔ وہ اتنے میں ہی باہر آ گئی۔ سلیمانؑ کی یہ ساری تدبیریں اس کی پنڈلی دیکھنے کے لیے تھیں۔ یہ ہے تفسیر۔ بیٹیوں سے معافی چاہتا ہوں۔ میری بچیو! مجھے معاف رکھنا' باپ ہی نہیں' بابا بھی ہوں تمہارا۔ عزیزانِ من! بڑے زخمی دلوں سے مجھے یہ باتیں کرنا پڑتی ہیں۔ میں کچھ مزے لے کر یہ بات نہیں کرتا۔ ان حضرات کے سامنے جب کبھی عورت آتی ہے تو سوائے Sex (جنسیّت) کے انہیں کوئی دوسرا خیال ہی نہیں آتا ''یوسف'' آتا ہے تو جھٹ سے ''زلیخا'' کے ساتھ بات کرنے کی فکر کرتا ہے۔ آپ سوچیے کہ کتنا عظیم مقصد ہے جس کے لیے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

## ہماری تفسیروں میں حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ کی بیویوں کی تعداد کے علاوہ لونڈیوں کا ذکر

عزیزانِ من! تفسیر میں دیکھیے۔ ان کے اپنے من میں چور ہوتا ہے۔ ان کے ذہن میں اور کوئی بات آتی ہی نہیں ہے جب عورت ان کے سامنے آتی ہے۔ بس اتنا سا ہی کرتے ہیں کہ چونکہ یہ پاکباز ہیں اس لیے ان سے نکاح کر لیتے ہیں۔ یہ حضرت سلیمانؑ کی چار سو بیویاں بتا رہے ہیں' سو بیویاں حضرت داؤدؑ کی بتائی جا رہی ہیں اور لونڈیاں الگ ہیں۔

## ملکہ سبا سے حضرت سلیمانؑ کی شادی کا دل خراش ماجرا

کہنے لگے کہ حضرت سلیمانؑ ملکہ سبا سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ کسی نے ان سے کہہ دیا کہ ویسے تو بڑی حسین نظر آتی ہے۔ بچیو بہنو! معاف کردو گی مجھے؟ ان کی یہ بات میں کہہ رہا ہوں' بات سامنے کرنی چاہیے کہ بچیوں کو پتہ لگے کہ یہ جو قرآن کی تفسیریں ہیں ان میں کیا لکھا ہے۔ کہا کہ کسی نے کان میں کہہ دیا کہ ویسے تو بڑی حسین نظر آتی ہے لیکن اس کی پنڈلیوں پہ بال ہیں۔ بچیو! مجھے چیخنے دیجیے' مجھے رونے دیجیے۔ اب کہنا یہ میری بدتمیزی تھی۔ اُسے کہا جاتا ہے کہ میں پنڈلیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔ بہت سوچ بچار کی ہوگی' کیبنٹ بٹھائی ہو گی کہ کیا کریں۔ کہا کہ یہ تدبیر کی کہ یہاں پہنچیں گی' خود ہی اپنی شلوار اونچی کرے گی تو پتہ چل جائے گا کہ پنڈلیوں پہ بال ہیں یا نہیں۔ آپ سوچیے کہ خدا کا ایک رسول ہے اور ایک عورت گھر میں مہمان کی حیثیت سے آئی ہے' اس کی پنڈلیاں ننگی کر کے دیکھنا چاہتا ہے۔ تدبیر ملاحظہ فرماؤ کہ کیا کی گئی ہے۔ اگر وہ کہتی کہ یہ شلوار بھیگی ہے تو بھیگنے دیجیے' وہ یونہی چلی آتی۔ نہیں' اس نے شلوار اٹھالی۔ اب یہاں پہنچ گئے اگر اتنے میں بات ختم ہو جاتی' تو داستان کچھ زیادہ رنگین نہیں بنتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ دیکھا بال تو تھے۔ اس نے جب نکاح کا کہا تو

---

❶ اس نے اپنی شلوار اونچی کرلی۔

انہوں نے کہا کہ نہیں' تمہاری تو پنڈلیوں پہ بال ہیں۔ حضرتِ سلیمانؑ نے مشورہ کر کے بات پوچھی تو انہوں نے کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ ایک نے کہا کہ اس طرح سے بال مونڈ لیے جائیں' ملکہ نے کہا کہ قسم ہے' یہ نہیں ہوسکتا کیونکہ اس سے تو مجھے بڑی اذیت ہوگی۔ پھر مشورہ کیا۔ وہ ان کے ہاں کا جو بہت بڑا طبیب تھا' اس نے یہ بال صفا پاؤڈر ایجاد کر کے دے دیا۔ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ حضرتِ سلیمانؑ کی جو دو معرکۃ الآراء چیزیں ہیں' اُن میں یہ ایک ایجاد بھی ہے۔ پنڈلیوں کے بال صاف کر کے پھر نکاح کر لیا۔

آپؐ قیامت میں جو اس امت سے پوچھیں گے کہ تم نے کیا کیا۔ آج ان سے پوچھو کہ کیا کیا ہے تمہارے ساتھ اس نے؟ یہ قرآن کی تفسیر بیان ہو رہی ہے۔

قرآن نے کہا ہے کہ **كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا** (27:44)۔ اس کا یہ ترجمہ کر دیا ہے کہ اس نے اپنی پنڈلیاں ننگی کیں۔ عزیزانِ من! ''کشف ساق'' کا ان عربوں سے پوچھیے' ان کے لغت دیکھیے' ان کے ادب کی کتابیں دیکھیے۔ ان میں دیکھیے کہ یہ جو کشف ساق ہے' اس کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ ساق صرف پنڈلی کو ہی نہیں کہتے بلکہ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس پہ کوئی چیز کھڑی ہو۔ یہ عرب ساق درخت کے تنے کو بھی کہتے ہیں' ستون کو بھی کہتے ہیں۔ کشفِ ساق محاورہ اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کوئی مصیبت یا بلا یا کوئی تکلیف کچھ سامنے آئے تو اس کے متعلق سوچا جائے کہ مجھے اس کا مقابلہ کیسے کرنا ہے اس کی طرف سے گھبراہٹ ہو اور پھر یہ چیز ہو کہ یہ کیسے کیا جائے۔ ہر مصیبت' تکلیف' حادثے کے وقت اس طرح سے تھوڑا سا اضطراب پیدا ہونا اور پھر سوچنا کہ کیسے اس کو حل کیا جائے۔ عربی زبان کے محاورے میں اسے کشفِ ساق کہتے ہیں۔ اور وہ اس سے ہے کہ جس طرح اب بھی اگر آپ نے تیز بھاگنا ہو یا مقابلہ کرنا ہو ''تے تسی اے نیفہ ٹنگ کے کر دے ہو۔ اے جے تہمد لمبے لمبے بندے ہیگے سن''۔ [1] تو ابتدا جہاں محاورے کی ہوئی ہوگی تو وہ واقعی کپڑا اٹھا کے ذرا جلدی چلتے تھے۔ اب بھی ہمارے ہاں یہ میانوالی سرگودھا وغیرہ کے اضلاع کے لوگ تہمد باندھنے والے ہیں۔ ان کا آپ نے تہمد دیکھا ہوگا۔ وہ جتنا بڑا زمیندار ہوتا ہے اتنا ہی چھلے دار تہمد فرش کو جھاڑو دیتا جاتا ہے لیکن جب انہیں تیز چلنا ہوتا ہے یا کہیں مقابلہ ہوتا ہے تو فوراً وہ اسے اٹھا لیتے ہیں۔ یہاں سے اس بات کی ابتدا ہوئی تھی۔ یہ محاورہ ہے۔ اور یہ جو اتنے بڑے بڑے عالم ہیں ان سے پوچھو کہ عربی ادب میں یہ چیز ہے یا نہیں؟ میں نے ادب (Literature) اس لیے کہا کہ ادب پہ تو ان کی نگاہ ہوگی۔ قرآن کو تو انہوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہوتا۔ قرآنِ کریم میں یہ خود دوسرے مقام پہ آیا ہے۔ ذکر آ رہا ہے ایک ہولناک دن کا جسے ہم قیامت کا دن کہتے ہیں۔ قرآن

---

[1] آپ یہ کام نیفہ ٹانگ کر' اوپر کر کے کرتے ہیں۔ یہ ایسے لمبے لمبے تہمد باندھا کرتے تھے۔

میں آیا ہے کہ جب وہ اعمال سامنے آتے ہیں' تباہیاں آ جاتی ہیں۔ قیامت کا دن ہے جسے آپ میدانِ حشر کہتے ہیں۔ ہولناک تباہی سامنے ہے' جہنم کی جیسے تباہی ہے۔ کہا کہ یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ (68:42)۔ وہی لفظ ہیں' عزیزانِ من! یہ لفظ قرآن میں ہیں کہ جس دن یہ تباہیاں' یہ ہولناکیاں ان کے سامنے نمودار ہو جائیں گی' ان کی کیفیت یہ ہوگی جیسا کہ مقابلہ کرنے کے وقت' اضطراب کے وقت' یوں پائنچے ٹنگتے ہیں تو اس وقت اس ہولناکی کو دیکھ کر ان کی کیفیت یہ ہوگئی۔ وَیُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ (68:42) اس وقت کیفیت یہ ہوگی کہ وہ اس وقت جھکنا چاہیں گے کہ ہم Submit (سرِتسلیم خم) کرتے ہیں۔ ان سے کہو کہ اس کا یہ ترجمہ کیجیے جو وہاں تم نے کیا ہے کہ قیامت کے دن' حشر کے دیہاڑے' میدان میں' جب جہنم سامنے آئے گا تو کیا کہیں گے؟ کہا کہ انہوں نے اپنی پنڈلیوں میں سے پائنچے اٹھا لیے ہوئے تھے۔ یہاں یہی لوگ یہ ترجمہ کرتے ہیں کہ ان ہولناکیوں سے گھبرا جائیں گے۔ یہی معنی وہاں لیں جہاں حضرتِ سلیمانؑ کا قصہ آتا ہے۔ وہاں یہ محاورہ بھی بھول جاتے ہیں' قرآن کی آیت بھی یاد نہیں رہتی' محض اس لیے کہ وہاں ایک عورت ان کے سامنے ہے' پنڈلیاں ضرور ننگی کرنی ہیں۔ چھوڑیئے قصہ' عزیزانِ من! منہ میں بھی مزا تلخ ہو جاتا ہے۔

## آخر کار ملکہ سبا نے دینِ خداوندی قبول کر لیا

ملکہ سبا وہاں آئی اور اس نے آ کر یہ سب شان و شوکت بھی دیکھی اور یہ سب کچھ بھی دیکھا۔ اور دیکھا کہ تھوڑا سا ہی ذرا جھٹکا آیا تھا پھر یہ ہوا کہ معلوم نہیں اس کے بعد کیا شرائط پیش ہوں گی' کس طرح سے صلح ہوگی' اس شخص کی تو بڑی شان و شوکت ہے۔ کیمپ لائف کے اندر' یعنی فوجی زندگی کے اندر بھی جس کی یہ شاہانہ انداز کی کیفیت ہو' یعنی یہاں ابھی تک تو یہ بات طے نہیں ہوئی کہ تمہارے ساتھ کچھ معاہدہ ہو رہا ہے' تمہارے ساتھ آگے بات کیا ہوگی۔ کئی اضطراب دل میں اٹھے کہ معلوم نہیں یہ کیا چیز ہوگی۔ اور قرآن نے یہ کہا ہے کہ وہ اکیلی نہیں آئی تھی۔ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے کہ کوئی بادشاہ یا ملکہ اکیلی آئے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وہ سب اس کے ساتھ تھے۔ وہ سب مہمان تھے۔ لیکن اس نے یہ سوچا کہ معلوم نہیں اب اس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ حضرت سلیمانؑ نے کہا کہ ڈرو نہیں قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ (27:44) یہ تو کوئی بات نہیں' یہ تو یونہی زیب و زینت کی چیزیں ہیں۔ کچھ نگ جڑے ہوئے ہیں' کچھ تھوڑا سا شیشہ بھی تمہیں نظر آتا ہے' یہ سب زینت کی چیزیں ہیں۔ اس نے شان و شوکت بھی دیکھی۔ اس کے بعد نظر آتا ہے کہ حضرتِ سلیمانؑ نے پھر بیٹھ کر بات کی ہوگی' سمجھایا ہوگا کہ کاہے کے لیے یہ سب کچھ کیا ہے۔ یہ سب کچھ قران چھوڑتا ہے کیونکہ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگلی بات جو تھی وہ کر دی۔ قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ (27:44)۔ اب اس نے رب کہہ دیا۔ تو نظر آ گیا کہ اس دوران میں یہ اس کو ہدایت کی تلقین کرتے تھے' صحیح اسلام سمجھاتے تھے' سورج کے مقابلے میں خدا کا تصور ذہن میں قائم کرتے

تھے اور وہ قائم ہو گیا تھا۔ اس نے یہ کہا کہ اے میرے رب! واقعی میں نے اس سے پہلے اپنے آپ پہ کچھ زیادتی کی ہوئی تھی جو میں ایک ڈوب جانے والے سورج کی پرستش کرتی تھی اور اپنی اتنی سی مملکت کا زعمِ باطل اتنا تھا کہ میں اس کے ساتھ ٹکر لینے کے لیے بیٹھ گئی تھی تو واقعی یہ میری زیادتی تھی۔

اور اس کے بعد' عزیزانِ من! داستان ختم ہوتی ہے۔ جسے مقطع کا بند کہتے ہیں جو میں نے چار لفظوں میں' فقرے میں کہا تھا بلکہ فقرہ بھی پورا نہیں ہے۔ آدھا فقرہ تو یہ ہے اِنِّیۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ (27:44)۔ یہ تو ہے Negative (منفی) پہلو کہ میں نے اپنے آپ پہ زیادتی کی۔ اور آگے ہے کہ وَاَسۡلَمۡتُ (27:44)۔ یہاں تک اگر ہوتا تو اس کے معنی ہو جاتے کہ میں Surrender (سرِ تسلیم خم) کرتی ہوں۔ اَسۡلَمۡتُ مَعَ سُلَیۡمٰنَ (27:44)۔ سلیمانؑ کی محکومیت نہیں اختیار کی بلکہ اَسۡلَمۡتُ مَعَ سُلَیۡمٰنَ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (27:44) جس طرح سلیمانؑ خدا کے سامنے جھکا ہوا ہے' میں بھی اس طرح سے اس کے سامنے جھکتی ہوں۔ یہ ہے بات۔ اس کے لیے یہ ساری داستان بیان ہو رہی تھی۔ ملکہ سبا مفتوح اور مغلوب حیثیت سے آئی ہے' Surrender (سرِ تسلیم خم) ہو گیا ہے۔ اور اس وقت کیا کیا اَسۡلَمۡتُ (27:44) اسلام لائی ہوں میں' جھکی ہوں' محکوم ہو رہی ہوں' Surrender (اطاعت پذیری اختیار) کر رہی ہوں۔ مَعَ سُلَیۡمٰنَ (27:44)۔ سلیمانؑ کے سامنے نہیں بلکہ سلیمانؑ کے ساتھ۔ جس طرح یہ رب العٰلمین کے سامنے جھکا ہوا ہے' اسی طرح سے میں' اور یہ ہم دونوں' اس کے سامنے جھکتے ہیں۔

حضرتِ سلیمانؑ اور ملکہ سبا کی یہ داستان' عزیزانِ من! ختم ہوئی اور آگے پھر دوسری داستان شروع ہو گی۔ اتفاق سے عین وقت پہ یہ بات ختم ہو گئی۔ اللہ کرے کہ میں قرآن کا صحیح مفہوم پیش کر سکوں۔ میرا مقصد یہی ہے۔

سورۃ النمل کی آیت 44 تک آ ہم آ گئے۔ 45 ویں آیت آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀❀.....❀❀.....❀❀

# پانچواں باب: سورۃ النمل (آیات 45 تا 59)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَكَانَ فِى الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۴﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۵۸﴾ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾

عزیزانِ من! آج ستمبر 1978ء کی 29 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النمل کی آیت 45 سے ہو رہا ہے: (27:45)۔

## گزشتہ سے پیوستہ

آپ کو یاد ہے کہ حضراتِ انبیائے کرام ؑ کی داستانوں کا سلسلہ چلا آ رہا ہے اور جیسا کہ میں نے اس سلسلہ کے آغاز میں بھی بتایا اور درمیان میں بھی اس کو بار بار پیش کرتا رہا کہ یہ کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے کہ تاریخی وقائع بیان کیے گئے ہوں۔ قران نے تو یہ کہا ہے کہ ہم نے شروع سے آخر تک ایک ہی دین تھا جو ہر نبی کی وساطت سے ہم بھیجتے رہے اور اس کا دعویٰ یہ تھا کہ ہماری طرف سے زندگی

کے کچھ اصول ملتے رہے۔ جس قوم نے ان اصولوں کے مطابق اپنا نظام قائم کر لیا' اس کے نتائج انسانیت ساز اور خوشگوار برآمد ہوئے۔ جنہوں نے اس کے خلاف خود ساختہ نظاموں کو اپنے ہاں رائج کیا' ان کے نتائج انسانیت سوز اور تباہ و برباد کرنے والے ہوئے۔ وہ اپنے اس دعوے کی صداقت کے ثبوت میں تاریخی شواہد کو پیش کرتا ہے کہ تاریخ میں دیکھ لیجیے کہ فلاں قوم نے کس قسم کا نظام قائم کیا تھا اور اس کے نتائج کیا نکلے۔ تو گویا یہ Abstract Truths (بسیط صداقتیں) ہیں' جنہیں غیر محسوس حقائق کہا جاتا ہے۔ قرآن ان کی شہادت مرئی اور محسوس واقعات میں دیتا ہے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے نہایت آسانی سے ہر ایک کی سمجھ میں بات آ سکتی ہے۔ پھر دوسری چیز یہ ہے کہ وہ ہر نبی کے ضمن میں دین کے سارے گوشے سامنے نہیں لاتا بلکہ اس کے دور میں' اس کے معاشرے میں' جو خرابی سب سے زیادہ نمایاں ہوتی تھی' وہ اس خرابی کو سامنے لاتا ہے اور اس کے ازالے کے لیے انہوں نے جو خداوندی قوانین یا اصول دیئے وہ اتنے حصے کو ایک جگہ پیش کرتا ہے۔ اگر انبیائے کرامؑ کی ان داستانوں کی تمام کڑیوں کو جمع کر لیا جائے تو اس کے مجموعے میں آپ دیکھیں گے کہ دین کے سارے گوشے بھی آ جائیں گے اور نظامِ حیات بھی مکمل شکل میں ہمارے سامنے آ جائے گا۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا انداز تاریخی کتاب جیسا نہیں۔ تاریخ میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ مثلاً بابر [1] کے واقعات آئے ہیں تو بابر کے پورے واقعات شروع سے آخر تک ایک باب میں آ جائیں گے۔ پھر ورق الٹیں گے تو ہمایوں [2] آ جائے گا تو اس کی پوری زندگی کے واقعات ایک جگہ آ جائیں گے۔ پھر اسی طرح اکبر [3] کے آ جائیں گے۔ لیکن قرآن نے اس طرح سے بیان نہیں کیا۔ اس کی وجہ ہے جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ وہ تاریخی وقائع بیان نہیں کرتا بلکہ اس نے تاریخی پسِ منظر میں کچھ حقائق پیش کرنے ہیں۔ اس کا انداز یہ ہے کہ جہاں کہیں اس نے حقیقت کو بیان کرنا ہوتا ہے تو وہ تاریخی پس منظر میں بیان کرتا ہے۔ وہ کسی نبی کا واقعہ ہو یا' وہ کسی قوم کا قصہ ہو' وہ وہاں اتنا حصہ ہی لے کر آتا ہے جس کا تعلق اس بیان کیے جانے والی حقیقت سے ہوتا ہے۔ مقصود بالذات تاریخ کی وقائع نگاری نہیں ہے بلکہ دین کے حقائق کو تاریخی پس منظر میں پیش کرنا ہے۔ تاریخ کی حیثیت صرف پس منظر کی رہ جاتی ہے۔ مقصود بالذات ان حقائق اور اصولوں کو سامنے لانا ہوتا ہے۔

حضرت سلیمانؑ تک پچھلے درس میں ہم آ گئے تھے۔ اس سے پہلے حضرتِ نوحؑ' قومِ ثمود' قومِ عاد' قومِ شعیبؑ' حضرتِ موسیٰؑ تک یہ ساری داستانیں ہمارے سامنے جستہ جستہ آ گئی تھیں۔

---

[1] بابر (1483-1530AD)۔ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا بانی' پہلا شہنشاہ (1526-1530)' اس کا اصل نام ظہیر الدین محمد تھا۔

[2] ہمایوں (1508-1556)۔ ہندوستان کا دوسرا مغل شہنشاہ (1530-1540;1555-1556)۔

[3] اکبر (1542-1605AD)۔ ہندوستان کا تیسرا مغل شہنشاہ (1556-1605AD)۔

اب اسی اصول یا قاعدے کے مطابق، جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مختلف مقامات پر وہ ان حقائق کو لاتا ہے اور اس پس منظر کا اتنا حصہ بھی پیش کرتا ہے، اب حضرتِ سلیمانؑ کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ قومِ ثمود کی بات آ گئی ہے حالانکہ تاریخی تدریج کے اعتبار سے، زمانی اعتبار سے، یہ بہت پہلے کی قوم ہے اور اس کا واقعہ پہلے آ چکا ہے لیکن اس میں دو بڑی اہم باتیں بیان کی ہیں۔ یہ ان کی خاطر ہے کہ وہ دوبارہ اس چیز کو لاتا ہے۔ یہ وہاں نہیں آئی تھیں جہاں یہ داستان پہلے بیان کی گئی ہے۔ پیچھے تو قرآن نے حضرتِ سلیمانؑ اور ملکہ سبا اور اس کی قوم کا حال دیا ہے۔ وہ آخری لفظ تھے: وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (27:44)۔ اس کی اہمیت تو پچھلے ہی درس میں آپ سن چکے تھے کہ اس کے بعد اس ملکہ نے کہا تھا کہ میں بھی سلیمانؑ کی طرح سلیمانؑ کے ساتھ جیسا کہ سلیمانؑ نے کیا ہے، خدا کے قوانین کی محکومیت اختیار کرتی ہوں۔ یہ وہ قوم ہوگئی جس نے بالآخر خدا کے قوانین کی محکومیت اختیار کر لی تو وہ تباہی سے بچ گئی۔ اب اس کے فوری بعد وہ ایک ایسی قوم کو لاتا ہے جس نے وعدہ کرنے کے باوجود، خدا کے قوانین سے قانون شکنی کی، خلاف ورزی کی، سرکشی برتی تو وہ تباہ ہوگئی۔ اب مختصر سے ٹکڑے میں یہ چیز بیان کی جا رہی ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس میں دو نکات ایسے اہم ہیں جو پہلے نہیں آئے تھے۔ اب ان پہ زیادہ زور دیا ہے۔

## قوم اور اُمت کا تصور

اب 45ویں آیت سے بات شروع ہوتی ہے کہ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ (27:45) قومِ ثمود کی طرف ان کے بھائی بندوں میں سے حضرتِ صالحؑ کو رسول بنا کر بھیجا۔ یہ بات تو میں ذرا آگے چل کر کروں گا لیکن یہاں یہ بتاتا ہوں کہ ہمارے ہاں کیا کیا بتایا، کس کس قسم کے شوشے چھوڑے گئے ہیں؟ ان میں یہ ایک چیز بھی آج کل بڑی نمایاں طور پہ آ رہی ہے کہ صاحب! قرآن نے دین کی بنیادوں پر ایمان کے اشتراک سے امت تو بنائی ہے، قوم نہیں بنائی۔ ان سے کون کہے کہ تم عربی کے دو الفاظ کو بھی نہیں جانتے۔ جس مقام میں کوئی نبی پیدا ہوتا تھا وہ انہی لوگوں میں سے ہوتا تھا۔ جن معنوں میں ہم کہتے ہیں کہ یہ ہمارے لوگ ہیں یا میں انہی لوگوں میں سے ہوں یا، اے میرے لوگو! تو اس کے لیے عربی زبان میں قوم کا لفظ آتا تھا۔ وہ انہی میں سے ہوتا تھا، انہی کے بھائی بندوں میں سے ہوتا تھا، قریبی رشتہ داریاں تھیں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت ترین دشمن حقیقی [1] چچا تھا اور باقی رشتہ دار تھے۔ حضرت عباس بھی جو دوسرے چچا تھے، وہ بھی اسلام نہیں لائے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا داماد [2] بھی

---

[1] یہ ہے ابولہب، اس کا نام عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب تھا، بدر کی لڑائی کے کچھ دنوں بعد ایک وبائی مرض میں مر گیا (پرویزؒ: لغات القرآن (جلد چہارم)، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، 1961، ص۔1505)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطّلب کے 10 یا 12 بیٹوں میں سے پانچ شخصوں نے اسلام یا کفر کی خصوصیت کی وجہ سے شہرتِ عام حاصل کی، یعنی ابولہب، ابوطالب، عبداللہ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عباسؓ (شبلی نعمانی: سیرۃ النبیؐ، ناشرانِ قرآن، 1364ھ، ص169)۔

[2] یہ ہیں ابوالعاص، حضرت زینبؓ کے شوہر۔

غیر مسلم تھا۔ ان تمام مسلمانوں کے جتنے عزیز تھے وہ قریش ہی تھے اور وہیں رہتے تھے۔ اب وہاں رہنے کی وجہ سے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مخاطب کرتے تو جیسا ہمارے ہاں ہے' کہتے کہ اے لوگو! عربی زبان میں وہ اے لوگو! یونہی نہیں کہتے بلکہ وہ یہ ہوتا ہے کہ اے میری قوم! اے قوم کے لوگو! اے وہ قوم! اس معنی میں ہوتا۔ اب اس قوم میں سے جو لوگ ایمان لاتے تھے' وہ اس جماعت میں شریک ہوتے تھے' وہ اس نبی کی امت کہلاتے تھے۔ اب اس کے لیے ایک الگ لفظ اختیار کرنا پڑا۔ قوم تو وہ باقی رہ گئی مگر جس نے یہ دین اختیار کیا تھا' یعنی جو اس نبی کا وہ دین اختیار کرتی چلی گئی' وہ ان سے الگ ایک قوم بنتی گئی۔ اس کے لیے امت کا لفظ استعمال کیا۔ یہ دوسری بات ہے۔

میں بتاتا ہوں کہ یہ الگ لفظ کیوں استعمال کیا لیکن بہرحال یہ استعمال کیا۔ قران نے بعض مقامات پر یہ جو امت کے اعتبار سے' جو الگ قوم بنے ہیں' ان کو ان کے مقابلے میں قوم بھی کہا ہے۔ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ صاحب! قرآن میں تو مسلمانوں کے لیے یہ لفظ نہیں آیا۔ قرآن سے اتنی بیگانگی!!!' کہاں آدمی ان کو الف ب پڑھاتا پھرے!! تو یہ سوال ہی نہیں ہے۔

## انسانوں کی تقسیم کا قرآنی اصول

سوال تو یہ ہے کہ قرآن نے بتایا یہ ہے کہ ہم نے انسانوں کو پیدا کیا اور **فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ** (64:2)۔ ان کی جو تقسیم ہے وہ اصول کے اعتبار سے دو گروہوں میں ہوگئی۔ ایک وہ ہیں جو ایمان کی بنا پر ایک قوم یا ایک امت بن گئے۔ ایک وہ ہیں جنہوں نے انکار کیا اور دوسرا گروہ ہوگیا۔ ایک کو اس نے **حِزْبُ اللّٰهِ** (58:22) کہا ہے' دوسرے کو **حِزْبَ الشَّيْطٰنِ** (58:19) کہا ہے۔ قرآن وہ دو ہی گروہ تسلیم کرتا ہے۔ ہیں ہی دو گروہ: **فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ** (64:2)۔ جو اسلام قبول کر کے اس گروہ میں شامل ہو گئے وہ ایک گروہ بن گئے۔ باقی ساری دنیا' جتنی بھی ہے' وہ مذہب پرست ہوں' مذہبوں میں وہ یہودی ہوں' عیسائی ہوں' ہندو ہوں' بدھ ہوں' جینی ہوں' لادین ہوں' دہریئے ہوں' جو اس گروہ میں شامل نہیں ہیں' وہ بھی ہوں۔ وہ پورے کا پورا گروہ ان کے مقابلے میں **حِزْبَ الشَّيْطٰنِ** (58:19) یا کفار کا گروہ کہلاتا ہے۔ قرآن کی رو سے یہ دو ہی گروہ ہیں۔ انہیں کچھ کہہ کے پکار لیجیے۔ دو گروہ آپ کو تسلیم کرنے پڑیں گے اور اسی کا نام ہمارے ہاں دو قومی نظریہ تھا اور ہے۔

## قرآن کریم کا رشتہ

اب یہاں یہ تھا کہ قومِ ثمود کے بھائی بندوں میں سے حضرت صالحؑ آئے تھے۔ اب یہاں یہ بھی نہیں ہے کہ یہ اس قوم کو Belong کرتے تھے یعنی اس قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ یہاں اخاھم کہا ہے۔ اخاھم اس معنی میں کہا ہے کہ اس قوم کے اندر سے تھے' ان کے بھائی بندوں میں سے تھے۔ اب جب اس کے بعد حقیقی اخوت آئی ہے تو قرآن نے کہا کہ **انما المومنون اخوة** (58:10)

اب ان کا وہ پہلا بھائی بند ہونے کا جو رشتہ تھا وہ ختم ہو گیا۔ اب ان کا رشتہ ایمان کی بنا پہ ہوا۔ قرآن نے ان کو آپس میں بھائی کہا ہے۔ اور یہ بھائی تو ہیں ہی۔ وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (3:103) ہم نے اپنی نعمت سے ان کو پھر بھائی بھائی بنا دیا۔ یعنی جو پہلا بھائی ہونا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن کی رو سے رشتے کا بھائی ہونا' نسبی بھائی ہونا' خون کا تعلق ہونا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ یہ تو محض ایک Chance (اتفاق) ہے' ہنگامی بات ہے جس میں کسی کا اختیار نہیں ہے۔ ایک ماں باپ کے گھر میں ایک شخص پیدا ہوا اور اس کے بعد دوسرا پیدا ہوا۔ اب یہ پہلے آدمی کو اس پہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اس کا بھائی نہ بنے۔ یہ By Choice (مرضی و اختیار سے) نہیں ہے' یہ مجبوری کی بات ہے۔ اور قرآن تمدنی ضرورتوں کے لیے' یہ جو رشتے ہیں' ان کو قائم رکھتا ہے لیکن جونہی ایمان کے اشتراک پہ یہ دوسرا رشتہ قائم ہوتا ہے' یہاں وہ پہلا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں اَخَاهُمْ صٰلِحًا (27:45) کہا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ تو قوم سے بھی آگے کا لفظ ہے کہ ان کے بھائی بندوں میں سے تھے۔ جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قومِ قریش میں سے تھے' ان کے بھائی بندوں میں سے تھے۔

## دین کی غایت: محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی ہے

اس قومِ ثمود کے بھائی بندوں میں سے حضرت صالحؑ کو ان کی طرف بھیجا۔ اس نے وہی بات کہی جو ہر نبی آ کر کہتا تھا کہ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ (27:45)۔ محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی ہے۔ کسی اور کی محکومیت نہیں ہے۔ یہ ہے نکتۂ شرعِ مبین ایں است و بس''۔ [1] کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ دوسرے انسان کو اپنے کسی فیصلے یا قانون کا محکوم بنائے۔ کسی انسان کے شرفِ انسانیت کے منافی ہے کہ وہ کسی انسان کے سامنے جھکے۔ محکومیت اور جھکنا صرف قوانینِ خداوندی کے سامنے ہے۔ یہ ہے دین کی علت و غایت جسے لبِ لباب کہتے ہیں' جسے تت [2] کہتے ہیں کہ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ (13:136) محکومیت اللہ کی اختیار کرو۔ وہ تو اپنی محکومیت بھی اختیار نہیں کراتا۔ وہ تو اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (6:163) کہتا ہے۔ سب سے پہلے تو میں نے یہ محکومیت اختیار کی ہے اور تم بھی میرے ساتھ اختیار کرو۔ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ (13:136) اور یہاں وہ بات آ گئی۔ کہا کہ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ (27:45)۔ اب وہ قوم دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ پہلے تو وہ ایک قوم تھی تو ان کو بھائی بھی کہا ہے۔ اب یہاں يَخْتَصِمُوْنَ (27:45) ہے کہ یہ وہ قوم ہے جس کے افراد میں خصومت پیدا ہو گئی' عداوت پیدا ہو گئی' ایک دوسرے کے ساتھ مزاحمت پیدا ہو گئی۔

---

[1] کس نہ باشد در جہاں محتاج کس نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس (حوالہ: پرویزؒ: اسلام کیا ہے؟ طلوع اسلام (ٹرسٹ)' لاہور' 1992' ص 169)۔

[2] ملخص و جوہر

اب اخوت کا رشتہ ختم ہوا ہے۔ اخوت اور مخاصمت تو دو متضاد چیزیں ہیں۔ وہ قومیں دو فریق بن گئے: یختصمون. ان کی آپس میں منازعت اور مخاصمت پیدا ہو گئی۔

## اللہ کی زمین' اللہ کی مخلوق کے لیے ہے' پھر دعوائے وراثت کیسا؟

تجدیدِ یادداشت کے لیے میں پھر گزارش کر دوں کہ قومِ ثمود کا یہ واقعہ کیا تھا۔ اس زمانے کی معیشت کا دارومدار گلہ بانی پہ تھا' ریوڑ پالنے پہ تھا۔ اس کے لیے چراہ گاہوں کی ضرورت تھی' پانی کے چشموں کی ضرورت تھی۔ قرآن بتاتا یہ ہے کہ ان کے ہاں کے جو بڑے بڑے اکابر' صاحبِ قوت' بلکہ ''الملاء'' یعنی وہ جن کے گھروں کی کوٹھیاں دانوں سے بھری ہوئی ہوتی تھیں' اس زمانے میں تو امارت کی یہی نشانی ہوتی تھی' وہ اپنی قوت اور جتھے کی کثرت کے زور پر چراگاہوں پر قبضہ کر لیتے تھے' پانی کے چشموں کو اپنی تحویل میں لے لیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کے جو ریوڑ تھے' جو مویشی تھے' وہ تو جب جی چاہے' جہاں سے جی چاہے' جتنا جی چاہے' کھائیں پئیں' چریں چگیں اور یہ جو انہی میں سے کمزور رہ جاتے تھے' ان کے حصے میں کچھ باقی بچ جائے تو وہ ان کے مویشیوں کے حصے میں آتا تھا' نہ بچے تو ان کو صبر شکر کرنا پڑتا تھا۔ یہ تھی اس زمانے کی معیشت کی حالت جب اس قوم میں حضرتِ صالحؑ پیدا ہوئے۔ انہوں نے آ کر دین کا ایک اصول دیا اور وہ معیشت کے نظام میں بنیادی اصول ہے۔

حضرت صالحؑ نے اصول یہ دیا کہ دیکھو بھائی! یہ زمین تمہاری پیدا کردہ نہیں ہے' یہ تمہاری خریدی ہوئی ہے یا وراثت میں آئی ہے۔ جس سے تم نے خریدی ہے اس کی بھی پیدا کردہ نہیں تو اس کی ملکیت کیسے ہوئی۔ وراثت میں کہتے ہو تو چلو تمہیں تو باپ کے ورثہ سے ملی لیکن تمہارے باپ کو کیسے مل گئی۔ یہ سلسلہ پیچھے تک لے جاؤ جب Original یعنی پہلی کڑی یہ پہنچو گے تو وہاں نظر آئے گا کہ یہ نہ کسی نے کسی سے خریدی ہے اور نہ کسی کو باپ سے ملی ہے۔ یہ دھاندلی سے یونہی خوامخواہ نقشے کے اوپر لکیریں مار کر تم نے لے لی۔ وہ جو پٹواری کا اتنا بڑا عکس شجرہ ہوتا ہے' تو یہ وہی ہے ملکیت کا جو حق ہے' وہ تو پٹواری کے عکس شجرہ کے اوپر لکیریں کھینچی ہوئی ہیں۔ یہ خدا نے تو نہیں کھینچی ہوئیں۔ تو ایک چیز اس نے کہی کہ اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ (4:97) یہ ساری زمین خدا کی ملکیت ہے۔ یہ کسی دوسرے کی ملکیت نہیں ہے۔ [1] اور الخلق تو خلق الله ہے یعنی مخلوق تو خدا کی ہے۔ خدا کی زمین' خدا کی مخلوق کے لیے آزاد رہنی چاہیے۔ یہ ہے دین کی معیشت کا یا نظامِ معاشی کا نقطہ ماسکہ (Focal Point):

---

[1] ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے' وہ کس کی ملکیت ہے؟ انہیں کس نے بنایا ہے؟ یہ اعتراف کریں گے کہ یہ اللہ کی ہے۔ اس کے حوالہ جات یہ ہیں: (6:12; 10:31; 29:61,63; 31:25; 34:24; 39:10; 39:38; 43:9) زمین کا وارث خدا ہی ہے (19:40)۔

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس
نقطۂ شرعِ مبیں ایں است و بس ❶

(اقبالؒ)

یہ محتاجی کی بات نہیں ہے۔ یہ تو خدا کی زمین ہے اور خدا کی مخلوق کے لیے ہے۔ یہ تھا وہ بنیادی نکتہ جو انہوں نے پیش کیا کہ تمہیں حق حاصل نہیں ہے کہ خدا کی زمین کے اوپر ملکیت کی لکیریں کھینچ کر دوسروں کو اس سے محروم کر دو۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ خدا نے اس ساری زمین کو جو معاش کا سرچشمہ ہے اس لیے بنایا ہے کہ اس سے اجناس یا کھانے پینے کی چیزیں پیدا ہوں یا یہ زمین ذریعہ ہے معدنیات کا جن پہ آپ کے ہاں کی ساری انڈسٹری کا دارومدار ہے۔ یہ وسائلِ رزق دو ہی چیزیں ہیں' یا تو براہِ راست زمین کی پیداوار ہیں یعنی اس سے بنی ہوئی چیزیں ہیں یا زمین کے ذخائر ہیں جن پہ آپ کی انڈسٹری چلتی ہے۔ جب زمین کا کہہ دیا کہ یہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی بلکہ یہ ساری خدا کی ملکیت ہے تو جو دونوں ذرائعِ رزق یا پیداوار کے وسائل ہیں' وہ سارے کے سارے انسانوں کی ملکیت سے چھن کر خدا کی ملکیت میں آ گئے۔ اب آگے جو کچھ ہے وہ ان کا انتظام ہے' وہ ان کی ملکیت نہیں ہے۔

## صرف وسائل رزق کا انتظام وانصرام انسان کو کرنا ہے

انتظام کے سلسلے میں اس نے یہ کہہ دیا کہ اس کے انتظام کے معنی یہ ہیں کہ کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم یا محتاج نہ رہنے پائے۔ یہ خالصتاً اس کا انتظام ہے جو کرنا ہے۔ یہ ہے نظام جو انہوں نے پیش کیا۔ اب یہ لوگ کس طرح سے اس پہ راضی ہوتے؟ انہوں نے مخالفت کی اور مقابلہ کیا۔ آپ نے دیکھا کہ یہ وعظ ونصیحت نہیں ہے۔ اس مقابلے کے بعد دیکھا کہ ایک تو یہ وہی چیز بتائی گئی تھی کہ حضرتِ صالح ؑ کے متعلق اس قوم نے کہا تھا کہ اے صالحؑ! ہمیں تو تم سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ اس سے نظر آتا ہے کہ حضرت صالحؑ قوم کی ممتاز شخصیتوں میں سے تھے۔ صلاحیتیں اور اہلیت بہت بڑی تھی۔ جبھی تو وہ کہہ رہے تھے کہ تمہارے ساتھ تو ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں' ہم تو سمجھتے تھے کہ تم کوئی ایسا قانون پاس کر دو گے کہ یہ جو مزارع ہیں' ان کو کبھی نکالا ہی نہ جا سکے۔ یہ ہمیشہ مزارع ہی رہیں تم الٹا یہ کہہ رہے ہو کہ نہیں صاحب! یہ تو سوال نہیں ہے' زمین تو تمہاری ملکیت ہی نہیں ہے' ہماری امیدوں پہ تم نے پانی پھیر دیا۔ یہ ہے انداز جو وہ کہتے ہیں کہ تم سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ بالآخر وہ جھکے اور ان کو معاہدہ کرنا پڑا۔

---

❶ پرویزؒ: مجلس اقبال حصّہ دوم (شرح مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق)' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1997' ص۔ 104۔
(دین کا نقطۂ ماسکہ اور شریعت کا مقصود ومنتہیٰ کیا ہے؟ یہ کہ ''دنیا میں کوئی شخص کسی دوسرے کا محتاج نہ رہے۔'' بس یہ ہے شریعت کا منتہیٰ اور یہ چیز اسی صورت میں ممکن ہے کہ دنیا میں اسلامی نظام متشکل ہو جائے۔)

## معاہدہ اور ابلیسی سیاست کی مہرہ بازیاں

اب یہاں قرآن ان کی سیاست لاتا ہے۔ یہ ہے ابلیسی سیاست کہ معاہدہ بھی کیا۔ آگے وہ بات لاتا ہے کہ معاہدے سے پھر جانے کے لیے انہوں نے کیا تدبیریں سوچیں۔ یہ ان کی سیاست ہے۔ خدا کا رسول ہی نہیں خدا کے قوانین کو ماننے والا نظام بھی کسی سے وعدہ کر کے کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ وعدہ تو وہ چیز ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ تم انسان تو ایک طرف رہے خدا نے جو وعدہ کیا ہے اگر بفرضِ محال وہ بھی پورا نہ ہو تو تم خدا سے پوچھ سکتے ہو کہ کیوں وعدہ پورا نہیں ہوا۔ وعدہ وہ چیز ہے اور وہ ہے جسے آپ معاہدہ کہتے ہیں۔ کیا عمدہ اصول دیتا ہے قرآن! لیکن میکیاوَلی سیاست کا حربہ یہ ہے کہ جب یہاں کڑکی [1] میں پھنسو تو ایک وعدہ کر لو ایک معاہدہ کر لو کہ جی ٹھیک ہے یہ سب کچھ ہوگا۔ جب ان سے کہو کہ صاحب! اس میں یہ کچھ کیوں کرتے ہو تو بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ جی وہ سیاست تو ہے ہی اس قسم کی گندگی۔ یہ کچھ بڑے فخر سے کہہ رہے ہیں اور شرم نہیں آتی۔ قرآن یہ جو یہاں اتنا سا ٹکڑا لاتا ہے تو اس ٹکڑے کے اندر یہ سیاست کی دو تین اہم چیزیں ساتھ لے آیا ہے۔ بہر حال ان کے ساتھ معاہدہ ہو گیا۔

عزیزانِ من! اب آگے قرآن بتاتا یہ ہے کہ انہوں نے وہ معاہدہ توڑ دیا۔ اس معاہدے کے لیے ایک علامت (Symbol) رکھی تھی۔ بطور علامت حضرتِ صالحؑ نے یہ کہا تھا کہ یہ دیکھنے کے لیے کہ آیا تم معاہدے پر قائم رہتے ہو یا نہیں یہ بات زبانی کلامی نہیں ہوگی بلکہ یہ اونٹنی ایک محسوس شہادت ہونی چاہیے۔ محسوس شہادت یہ ہے کہ یہ لیجیے ایک اونٹنی نہ یہ تمہاری ہے نہ میری ہے نہ کسی غریب کی ہے نہ کسی امیر کی۔ کہا کہ یہ جو مویشی ہوتے ہیں کیا کہیں ان کے اوپر آپ نے فطرت کی طرف سے یہ لکھا ہوا دیکھا ہے کہ جب وہ پیدا ہوں تو یہ ہو کہ یہ خانزادہ امیر الدین خان کی ہے "تے اے نتھو جولا ہے دی"؟ [2] اس پہ تو کچھ نہیں لکھا ہوتا۔ تم اپنی نسبت سے بنا لیتے ہو کہ یہ امیروں کی ہے اور یہ غریبوں کی ہے۔ اس لیے حضرت صالحؑ نے کہا کہ وہ اونٹنی نہ امیر کی ہوتی ہے اور نہ غریب کی ہوتی ہے تو جس طرح اَلۡاَرۡضُ لِلّٰهِ (4:97) یہ زمین اللہ کی ہے اسی طرح یہ نَاقَةَ اللّٰهِ (11:64) اللہ کی اونٹنی ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! جس چیز کو خدا کسی کی ذاتی ملکیت تسلیم نہیں کرتا اس کو وہ اللہ کی کہہ دیتا ہے۔ جیسے یہ بیت اللہ ہے خدا کا گھر ہے۔ کہا کبھی کسی نے دیکھا ہے کہ وہاں اللہ میاں نے منجھی ڈاھی ہوئی ہے [3] (معاذ اللہ)۔ خدا کے گھر کے معنی کیا ہیں؟ وہ تو کائنات کے ایک ایک ذرّے کے اندر ہے۔ خدا کا گھر کہنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اور وہ گھر تو نظام کا Symbol (علامت) ہے۔ نظام خداوندی بھی انسانوں کا نظام ہو سکتا ہے لیکن

---

1. مصیبت
2. نتھو جولاہے کی ہے۔
3. چارپائی بچھائی ہوئی ہے۔

ہوتا وہ نظامِ خداوندی ہی ہے۔ یہ بات دوسری طرف چلی گئی۔ بہرحال کہا کہ یہ نَاقَةَ اللّٰهِ (11:64) ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ یہ کسی کی اونٹنی نہیں ہے اسی طرح یہ اَلْاَرْضُ لِلّٰهِ (4:97) ہے۔ یہ اللہ کی ہے' یہ کسی اور کی زمین نہیں ہے۔ کہا کہ یہ ناقة الله اس ارض اللہ میں چرے گی۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے جی۔ معاہدہ ہوگیا۔ وہ اس معاہدے پر کیسے قائم رہتے کیونکہ اس سے تو سب کی اونٹنیاں برابر ہوگئیں۔ سب ایک جیسے وہاں جا کر چریں گی۔

انسان کی Ego یعنی اس کی ''انا'' برداشت نہیں کرتی۔ خود ہی پہلے کسی کو کمین اور پست قرار دیتے ہیں' پھر ان کی Ego (انا) برداشت نہیں کرتی کہ وہ ہمارے برابر آ جائے۔ اپنی Ego (انا) کی تسکین کے سوا ان دونوں میں اور وجہ امتیاز کیا ہوتی؟ معاہدہ کرنے کو تو کر لیا لیکن وہ برداشت نہیں کر سکے۔ جب یہ دیکھا کہ ان کی اونٹنیاں بھی ادھر ہی چر رہی ہیں' تو وہاں یہ ہوا کہ انہوں نے ناقۃ اللہ کو ہی مار دیا۔ حضرتِ صالحؑ نے کہا کہ میں نے اسی لیے ایک محسوس شکل میں اس ایک چیز کو لیا تھا۔ معلوم ہوگیا کہ تم وعدہ خلافی کر رہے ہو' سرکشی برت رہے ہو۔ اس لیے اب تم بچ نہیں سکتے' تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ ہے وہ چیز۔ یہاں قرآنِ کریم نے ان چیزوں کا ذکر نہیں کیا کیونکہ یہ کچھ پہلے آ چکا ہوا ہے۔

## ابلیسیت میں عجلت کیوں؟ حضرت صالحؑ کا پیغام

اب قرآن کہتا ہے کہ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ (27:46) حضرت صالحؑ نے کہا کہ اے میرے لوگو! تم ایسی حرکتیں کیوں کر رہے ہو؟ بجائے اس کے کہ تمہیں خدا کی خوشگواریاں نصیب ہوں' تم کیوں تیزی کر رہے ہو' جلدی مچا رہے ہو کہ جلدی سے تمہاری تباہی آ جائے۔ کیا تباہی اور بربادی بھی کوئی ایسی چیز ہے جس کے لیے انسان جلدی مچائے؟ ارے تمہیں تو چاہیے کہ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (27:46) خدا سے اپنے غلط نظام کے تباہ کن نتائج سے بچنے کی حفاظت مانگو۔ تمہیں تو یہ کرنا چاہیے۔ تم الٹے ایسی حرکتیں کر رہے ہو کہ اگر اس نے کہیں وقفے کے بعد آنا ہے تو تم یہ چاہتے ہو کہ کل کیا' آج ہی آ جائے۔ کہا کہ یہ بات کونسی ایسی خوشی کی ہے کہ جیسے تم کوٹھے پہ چڑھ کے رمضان کا چاند دیکھ رہے ہو۔ میں تمہاری تباہی کہہ رہا ہوں اور تم کہتے ہو کہ دیر کیوں لگاتے ہو' جلدی لاؤ۔ تم بڑے ہی احمق ہو۔ جو غلط نظام پہلے پیدا کر چکے ہو' اس سے محفوظ رہنے کی کوشش کرو تا کہ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (27:46) تمہاری نشوونما کا سامان ہو جائے۔

اب یہاں یہ لفظِ رحمت آیا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ جو Physical (جسمانی) نشوونما تھی' اس کا سامان تو انہوں نے خود کر لیا ہوا تھا۔ اس سے محروم تو وہ تھے جن کے مویشی وہ چرنے نہیں دیتے تھے۔ یہ نشوونما کیا ہے جس کا ترحمون کہہ کر ذکر کیا ہے؟ یہ انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ یہ جسمانی نشوونما سے الگ شے ہے۔ اسی لیے کہا کہ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (27:26)۔ جواب کیا ملتا ہے؟ یہ

جواب اس شخص کو ملتا ہے جو دوسروں پہ بھلائی کرتا ہے۔ قرآن نے بڑی عجیب چیز کہی ہے۔ **قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ** (27:47) انہوں نے کہا کہ کیا مصیبت ہے کہ جب سے تم اور یہ تمہاری قوم والے یہاں پیدا ہو گئے ہیں' تم یہی کہتے ہو کہ تباہ و برباد ہو جاؤ گے' مر جاؤ گے۔ اوستیاناس تمہارا' تم تو بڑے منحوس واقع ہوئے ہو۔ یعنی تباہ ہونے والوں کو یہ آگاہ کرنا کہ بابا! آگے نہ جانا' کنواں ہے گر جاؤ گے' وہ کہتے ہیں کہ جس وقت بھی تم سے سنو' تم کنویں میں گرنے کی خبر ہی سناتے ہو۔ یہ نحوست لفظ ہے۔ تو تم بڑے ہی منحوس ہو۔ جب سے آئے ہو' اسی قسم کی خبریں سناتے رہتے ہو۔ آپ کسی کو بھی برائی سے روک کر دیکھیے' وہ یہی چیز کہتا ہے۔ یہ بات آگے قومِ لوطؑ کے زمرے میں بھی ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ تم بڑے منحوس ہو۔ **قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ** (27:47)۔ کہا کہ جسے تم یہ نحوست کہتے ہو' سنو! یہ سعد و نحس کوئی شے نہیں ہوتی۔ یہ جسے تم مصیبت کہتے ہو' جس سے ہم تمہیں آگاہ (Warn) کرتے ہیں' یہ تو خدا کے قوانین کی خلاف ورزی ہے جو تم پر آ رہی ہے۔ یہ نہ میری وجہ سے آ رہی ہے' نہ تمہاری وجہ سے ٹل سکتی ہے۔ کوئی شے بجائے خویش نہ نحس ہوتی ہے' نہ سعد ہوتی ہے۔ یہ تو جس قسم کے کام کوئی آدمی کرتا ہے' اس پہ بات ہے۔ کوئی خرابیاں کرتا ہے تو نحس ہوتی ہے' اچھے طریقے سے استعمال کرتا ہے' وہ سعد ہو جاتی ہے' ورنہ کوئی شے منحوس نہیں ہوتی۔ یہ جسے تم نحوست کہتے ہو' یہ کسی کی وجہ سے نہیں آتی۔ یہ بشارتیں اور نحوستیں تو خدا کے قوانین کی رو سے طے پاتی ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ تم سمجھتے نہیں ہو' تمہیں اس وقت بھی خدا کٹھالیوں میں سے نکال رہا ہے۔

یہ لفظِ فتنہ عجیب لفظ ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ تم کیا کرتے ہو اور ہم کیا کرتے ہیں۔ آپؑ یعنی حضرت صالحؑ کہنے لگے کہ یہ جو بھی مصیبت آتی ہے' جس تکلیف میں سے بھی کوئی قوم گزرتی ہے' اگر وہ اپنے سامنے کعبہ والی بات رکھ لے کہ میں نے انسان کے اس مروجہ خودساختہ نظام سے باز آنا ہے اور اس کی جگہ نظامِ خداوندی متشکل کرنا ہے تو یہ ساری چیزیں اس کے لیے سنار کی بھٹی بن جاتی ہے جس سے گزر کر وہ کندن بن کر نکلتے ہیں۔ یہ ہے جسے ہم عذاب کہتے ہیں۔ عذاب کا فلسفہ یہ ہے اور پھر اس کی تشبیہ آگ سے دی گئی ہے۔ یہ ساری چیزیں تشبیہات ہی ہوتی ہیں۔ کہا کہ یہ چیزیں تو سنار کی کٹھالی ہیں۔ اگر تمہارے اندر وہ سونے کا جوہر باقی ہے تو جتنی بار تم اس صحیح راستے میں سے گزرو گے' کندن بن کے نکلو گے۔

## برائیاں اوپر کے طبقے سے عوام میں جڑ پکڑتی ہیں

اب آئی وہ سیاست۔ کہنے لگے کہ یہ تو عام بات ہو رہی تھی۔ **وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ** (27:48)۔ حضرتِ صالحؑ نے یہ بات کہی کیونکہ ان کا گروہ تو بڑا مختصر تھا۔ صحیح راستے کی طرف بلانے والوں کا گروہ مختصر ہی ہوتا ہے۔ دوسری طرف وہ پوری کی پوری قوم تھی۔ اب یہ چیز سامنے آئی کہ بارِ الٰہا! یہ اتنا جمِ غفیر ہے اس قدر غلط

راہوں پہ چلنے والی یہ آبادی کی کثرت ہے۔ یہ جو اتنے لوگ ہیں‘ ان کی اصلاح کس طرح سے ہوگی؟ یہاں وہ سیاست آئی جو میں نے کہا ہے۔ کہا کہ اے صالحؑ ! اس سے نہ گھبراؤ‘ یہ جو عوام کی کثرت ہے‘ یہ جو محکوم ہیں‘ یہ بجائے خویش ایسے نہیں ہوتے ہیں۔ ان کو چھوڑ دو۔ یہ جو المدینۃ ہے یعنی یہ جو (Capital City) دارالخلافہ ہے اس میں نو بدمعاش ہیں۔ وہ بیٹھے ہوئے یہ ساری تدبیریں کرتے رہتے ہیں اور ان کی وجہ سے یہ سارا نظام بگڑا ہوا ہے۔ ان کی اصلاح ہو جائے گی تو سارا معاشرہ صحیح ہو جائے گا۔ قرآن بڑی عجیب چیز بتاتا ہے۔ یہ بات اصلاح کی غرض سے قرآن نے کہی ہے کہ اصلاح کا یہ طریقہ ہے۔ میں جو مثال دیا کرتا ہوں کہ جب چیچک نکلتی ہے‘ ''ماتا جنوں کیندے نیں''[1] تو اس سے یہ جو سارا جسم ہے اس میں پھپھولے پڑ جاتے ہیں۔

چیچک کی بیماری کا علاج یہ نہیں ہوتا کہ آپ ایک ایک پھپھولے پہ مرہم کا پھاہا رکھتے جائیں۔ یہ اس کا علاج ہوتا ہی نہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ خون کے اندر جو کچھ اس قسم کے جراثیم ہوتے ہیں جن کی نمود ان پھپھولوں کے ذریعے ہوتی ہے‘ اگر اندر سے ان کی اصلاح کر دی جائے تو یہ سارے پھپھولے خود بخود ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ یہ مفاسد کی خرابیاں تو چیچک کے پھپھولے ہوتے ہیں۔ بگاڑ تو خون میں ہوتا ہے۔ قرآن کی کیا بات ہے! ہزاروں سال پہلے کی سیاست آج بھی زندہ اور پائندہ ہے۔ جہاں غلط نظام یا غلط تدبیروں کی چیز آپ دیکھیں گے تو وہاں آپ کو اوپر کچھ لوگ نظر آئیں گے جن کی وجہ سے یہ مفاسد اور بگاڑ ہوگا۔

## کردار کی بلندی اور نخوت کی پستی

اب یہ دیکھو کہ المدینۃ میں پوری سیاست اور حکومت ہے۔ یہ المدینہ‘ جو بڑا شہر (Capital City) ہے‘ اس کے اندر نو (9) لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ویسے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات اتفاقیہ ہو یا واقعی کوئی چیز ہو‘ نبی اکرم ؐ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا کہ قریش کے یہ جتنے بڑے بڑے سردار مخالفت میں تھے‘ وہ بھی جو تاریخ میں گنے گئے‘ نو (9) ہی تھے۔ ان میں آٹھ[2] تو بدر کے میدان[3] میں ہی مارے گئے تھے۔ ابولہب پیچھے رہ گیا وہ خود جنگ بدر میں شریک نہیں ہوا تھا۔ وہ انتہائی کمینہ تھا۔ قرآن نے ایک ہی شخص ہے جس کا نام لے کر بات کی ہے‘ حالانکہ اس جنگ بدر کے اندر کھلے ہوئے دشمن ابوطلحا اور عتبہ[4] جیسے بھی تھے۔ ان کا نام قرآن نے نہیں لیا۔ ٹھیک ہے کھلے ہوئے دشمن

---

[1] جسے چیچک کہتے ہیں۔

[2] یہ آٹھوں ہی قریش کے سرتاج تھے‘ ان کے نام یہ ہیں:
(1) شیبہ بن ربیعہ‘ (2) عتبہ بن ربیعہ‘ (3) ابوجہل‘ (4) ابوالبختری (5) زمعہ بن الاسود‘ (6) عاص بن ہشام (7) اُمیّہ بن خلف‘ (8) منبّہ بن الحجاج (شبلی نعمانی: سیرۃ النبیؐ‘ ناشرانِ قرآن‘ 1364ھ‘ ص۔ 335)۔

[3] سترہ رمضان 2ھ (مطابق 13 مارچ 624ء) کی صبح بدر کے میدان میں دو صفیں ایک دوسرے کے سامنے نبرد آزما تھیں۔

[4] یہ حضرت حذیفہؓ کا باپ تھا۔ یہ سردارِ لشکر تھا۔ جنگ بدر میں تھوڑے ہی عرصہ میں اس سردارِ لشکر عتبہ بن ربیعہ‘ اس کے بیٹے ولید اور بھائی شیبہ کی لاشیں میدان میں تھیں۔

ہیں اور میدانِ جنگ میں آ گئے ہیں۔ ابولہب کی کمینگی کی کیفیت یہ تھی اور یہ قریش جیسی قوم کے اندر انتہائی کمینگی تھی کہ وہ خود میدان میں نہیں آیا۔ ایک شخص نے اس کا قرضہ دینا تھا۔ قرآن نے بتایا ہے کہ ابولہب بہت بڑا سرمایہ دار تھا۔ سرمایہ داری میں جو کھویا ہوا کیریکٹر ہوتا ہے اس میں دبنگ پن نہیں رہتا۔ ایک شخص کے ذمے اس کا قرضہ تھا۔ وہ روز اس کو تنگ کرتا تھا۔ اس کے پاس دینے کو نہیں تھا تو کہنے لگا کہ اچھا' یہ کرو کہ میرے Behalf پہ یعنی میری طرف سے بدر کے میدان میں چلے جاؤ۔ اب میں اس کا ذمہ نہیں لیتا کہ تم وہاں مارے جاؤ گے یا واپس آ جاؤ گے' بہرحال میں تمہارا قرضہ معاف کر دوں گا۔ اپنی طرف سے اس نے اس شخص کو جنگ میں بھیج دیا تھا۔ کیریکٹر میں آپ دیکھیے کہ کتنا فرق ہے۔ ابوجہل [1] بھی دشمن تھا۔ اسی بدر کے میدان میں جب وہ زخمی ہو کر گرا ہے اور مرنے لگا ہے تو ان کے ہاں قاعدہ تھا کہ سر کاٹتے تھے۔ اس کا سر کاٹنے کے لیے اس کے سینے پہ ایک ساتھی بیٹھا' وہ ایک بچہ [2] ہی تھا تو ابوجہل نے کہا کہ ذرا میری گردن تھوڑا نیچے سے کاٹو۔ وہ کہنے لگے کہ اوئے! نیچے تو ہڈیاں آ جاتی ہیں' اس میں تو بڑی تکلیف ہو گی۔ کہنے لگا کہ نہیں اور نیچے سے کاٹو۔ وہ اس لیے کہہ رہا تھا کہ ان کے ہاں جنگ کے بعد یہ قاعدہ ہے کہ جو بڑے بڑے دشمن ہیں' ان کے سر نیزے پہ ٹانگ کر جلوس نکلتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس میں ابوجہل کا سر باقیوں سے اتنا اونچا نظر آئے۔ یہ ہے اس قوم کی ذہنیت۔ اور یہی چیزیں تھیں' عزیزانِ من! جو اس روایت میں ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ روایت بڑی صحیح ہے کہ حضورؐ نے اس زمانے میں جب چاروں طرف کے مصائب نے گھیر لیا تھا' دعا کی تھی۔ روایت میں آتا ہے کہ آپؐ نے کہا تھا کہ یا اللہ! مجھے یہ جو دو عمر ہیں [3] ' ان میں سے کوئی ایک دے دو۔ یہ ہیں خوبیاں کیریکٹر کی۔ یہ قوت ہے۔ سوال اس قوت کے استعمال کا آتا ہے کہ اسے استعمال کس طرح کر رہے ہیں۔ حضورؐ کی اس معاشرے میں نگاہِ انتخاب جو پڑی ہے تو یہ دو افراد تھے جن کی صلاحیتیں' جن کی قوتیں' باقیوں کے مقابلے میں بڑی نمایاں تھیں۔ سوال اتنا ہی تھا کہ اُس وقت وہ غلط چینل میں پڑے ہوئے تھے' اپنی صلاحیتوں کو غلط طریق پر استعمال کر رہے ہیں' اس کا نتیجہ تخریب آ رہا ہے' ادھر آ جائیں گے تو وہی قوتیں اور صلاحیتیں وہ صحیح راستے میں استعمال کریں گے۔ نتیجہ تعمیر ہو گا۔ تو بات تو اس کی ہے کہ کس کے پاس قوت اور صلاحیت ہے' وہی مسلمان ہو کر کچھ کام دے سکتا ہے۔ جس میں یہ چیز نہیں ہے پھر وہ ہمارے جیسا جمِ غفیر مسلمان ہو جائے۔

آج دنیا میں یہ ساٹھ کروڑ ہیں جی' ستر ہو گئے جی' اسّی ہو گئے ہیں' جی' ساٹھ ارب بھی کیوں نہ ہو جائیں' کیا فرق پڑے گا!! آپ کیا کہتے ہیں کہ Figures (ہندسوں) میں بڑھانا شروع کر دیا جائے؟ صفریں تو کوئی تعداد نہیں بڑھاتی ہیں۔ ''یعنی اک صفر دی صفر' دو صفر

---

[1] ابوجہل کا اصل نام عمر بن ہشام بن مغیرہ تھا۔

[2] تاریخ بتاتی ہے کہ انصار کے دو نوجوان بھائیوں (معوذ اور معاذ) کی تلوار سے' ابوجہل پیوستِ زمین ہو گیا تھا۔

[3] یہ دونوں عمر ہی تھے: (1) حضرت عمرؓ بن خطاب اور (2) عمر بن ہشام بن مغیرہ (ابوجہل)

دی صفر۔ او تے اک آ جاوے ناں Digit دا' تے اونوں دیونال' تے فیر لاؤ اگے صفر' تاں گل چلدی ہیگی اے۔ او اک جیہڑا ہوندا ہیگا' اے تو او تے صفراں وچ وی طاقت پیدا کر دیندا ہیگا اے۔ تے جے اک نہ رہے تے فیر سارے صفر ہی ہوندے ہیگے''۔ ❶ یہ دعا جو مانگی گئی تھی تو اس لیے مانگی گئی تھی۔ میں نے یہ کہا ہے کہ اس قوم میں بڑی خوبیاں تھیں اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بھی اس قوم کا اسلام کے لیے انتخاب کیا تھا۔ وہی قوم اس کے شایانِ شان ہو سکتی تھی لیکن ہر قوم کے اندر اس قسم کے فرد ہوتے ہیں' قرآن نے جو گنایا ہے کہ یہ کمینہ کیوں تھا؟ کہا ہے کہ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ❷ (104:2) اور پھر تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ o مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ❸ (111:1-2)۔ کہا ہے کہ جو دولت کے لالچ میں پڑ جاتا ہے خواہ وہ قریش جیسی جوانمرد قوم کا فرد بھی کیوں نہ ہو' وہ کمینہ ہو جاتا ہے۔ قرآن عجیب چیزیں کہہ جاتا ہے کہ اس کو ہر وقت اپنے ہی پیسے کی فکر ہوتی ہے' اور اسی لیے وہ ہر وقت ڈرتا رہتا ہے۔ آپ کو یاد ہے کہ یہ جو جنگل میں جا رہے تھے' گرو بھی اور ساتھ اس کا چیلہ بھی تھا۔ پاس کچھ بھی نہیں تھا اور لنگوٹی باندھے ہوئے تھے۔ اندھیرا ہو گیا۔ گرو کا چیلہ قدم قدم پہ کہے کہ گرو جی! مجھے ڈر لگتا ہے۔ گرو کہنے لگا: اوئے تجھے! یہاں ڈر کس چیز کا لگتا ہے' یہاں کوئی آدمی نہیں' کوئی بات نہیں ہے' یہاں کسی جانور کی آواز نہیں آ رہی۔ چیلہ کہنے لگا کہ جی! مجھے ڈر لگتا ہے۔ گرو کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ ''اوئے ڈروالی چیز باہر کڈ کے سٹ دے۔ او ہدی لنگوٹی اچ اک دھیلہ بدھا ہویا سی''۔ ❹

---

❶ یعنی ایک صفر (Zero) تو ایک صفر (Zero) ہی رہتا ہے۔ دو صفر بھی لگائیں یا ضرب دیں تو حاصل صفر (Zero) ہی ہوتا ہے۔ وہ تو اس وقت ہے جب 1 ہندسے کے ساتھ ایک صفر (Zero) لگا دو تو پھر اگلے صفر ہندسے کی قیمت (Place Value) بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہ 1 کا ہندسہ صفروں (Zero) کی قیمت پیدا کر دیتا ہے۔ اگر یہ 1 کا ہندسہ نہ ہو تو پھر یہ تمام صفر تو صرف صفر (Zero) ہی رہے ہیں۔

❷ دولت اکٹھی کرتا رہے اور پھر گنتا رہے کہ اب کتنا روپیہ جمع ہو گیا اور اب کتنا۔ یعنی وہ ننانوے کے پھیر میں پڑ جائے (70:180)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1482)۔

❸ وہ دیکھو! جماعت مخالفین کا سب سے بڑا نمائندہ قریش کی معاشرتی اور اقتصادی خرابیوں کا سب سے بڑا ذمہ دار' کعبہ کا متولی' ان کے غلط نظام کا سب سے بڑا حامی' ابولہب' اس نظام خداوندی کے مقابلہ میں عاجز آ گیا اور بُری طرح تباہ ہو گیا۔ (یہ تباہی کسی فرد کی تباہی نہیں' یہ درحقیقت اس نظامِ معاشرت و تمدن کی شکست ہے جس کا یہ نمائندہ ہے (111:1)۔ اور اس کا وہ مال و دولت' اور ساز و یراق جس کے بل بوتے پر وہ اتنی سخت مخالفت کرتا تھا' اس کے کسی کام نہ آیا۔ وہ اسے اس تباہی سے نہ بچا سکا' غلط نظام' دولت کے سہارے کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کی بنیاد میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے (69:27.28:92:11,96:7)۔ پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1494)۔

❹ ڈروالی چیز نکال باہر کر اور پھینک دے۔ اس کے لنگوٹ میں ایک دھیلہ (آدھا پیسہ) بندھا ہوا تھا (وہ تھا اس ڈر کی وجہ جواز)۔

کیوں‘ عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ ابولہب کا کیریکٹر قرآن نے کیوں پیش کیا ہے؟ یہ ہے کیریکٹر۔ قریش جیسی قوم کے اندر بھی اگر کوئی شخص سرمایہ دار ہوتا ہے تو ابوجہل کے بجائے ابولہب بن جاتا ہے۔ وہ ابولہب جو میدانِ جنگ میں خود نہیں گیا‘ اپنے ایک مقروض کو بھیج دیا۔ اس کے بعد جب یہ خبر آئی ہے کہ انہیں شکست ہوگئی ہے اور وہ جیت گئے ہیں‘ اس دھڑ کے ❶ سے ہی مر گیا۔

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نَبرد تھا
عشقِ نَبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

(غالب)

## صاحبِ اقتدار اور قوم کے عوام دونوں ہی نظامِ معاشرت کی خوبیوں یا خرابیوں کے ذمہ دار قرار پاتے ہیں: کیوں؟

میں ویسے ہی کہہ رہا تھا کہ تاریخ کی یہ عجیب بات ہے اور یہاں نبی اکرمؐ کے اور حضرت صالحؑ کے وقائع زندگی میں بھی یہی بات تھی۔ دونوں میں مماثلت ہے۔ کہا کہ وہ نو تھے جو **يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ** (27:48)۔ فساد کرتے تھے اور اصلاح ہونے ہی نہیں دیتے تھے۔ یہاں ایک اہم نکتہ آیا ہے جس کے لیے میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن نے پھر دوبار اس واقعہ کو کیوں پیش کیا ہے۔ ذہن تو اس طرف ہی جاتا ہے کہ یہی نو کے نو ہی مجرم تھے۔ تباہی آنی چاہیے تھی تو ان نو ہی کی آنی چاہیے تھی۔ نہ صرف یہ کہ تاریخ یہ بتاتی ہے بلکہ یہیں دو آیات کے بعد قرآن انجام یہ بتاتا ہے کہ **اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ** (27:51) پھر وہ جو نو تھے‘ وہ بھی تباہ ہوئے اور ان کے ساتھ ان کی قوم بھی تباہ ہوئی۔ میں نے کہا ہے کہ بظاہر ذہن میں یہ آتا ہے کہ مجرم تو یہ نو ہی تھے تو یہ قوم ان کے ساتھ کیوں تباہ ہوئی۔ اور یہاں قرآن سیاست کا بڑا بنیادی نکتہ بیان کرتا ہے۔ قوم کے لیڈر یعنی برسرِ اقتدار طبقہ اور ان کے Followers یا عوام یا جنہیں محکوم کہہ لیجیے‘ یہ دو طبقے ہوتے ہیں۔ ان میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ اگر اوپر کے یہ انتظام کرنے والے صالح ہوں تو جو خوشگواریاں آتی ہیں وہ انہی کے اندر محدود نہیں رہتیں بلکہ ساری قوم ان سے متمتع ہوتی ہے۔ صرف اس اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو کہا جائے گا کہ صاحب! ان خوشگواریوں میں تم برابر کے حصہ دار تھے۔ کبھی یہ نہیں کہتے تھے کہ صاحب! ہماری وجہ سے نہیں یہ تو ان کے حسنِ انتظام کی وجہ سے آیا ہے۔ یہ انہی تک ہونا چاہیے‘ ہمیں بھوک سے مرتے رہنا چاہیے۔ ایسا نہیں ہوتا۔ جب ان کی بدنظمی کی وجہ سے تباہی آتی ہے تو اس تباہی میں قوم شریک ہوتی ہے لیکن قرآن اس طرح یونہی بات کہہ کر نہیں بڑھ جاتا کیونکہ بات بڑی اہم ہے۔ اندازِ بیان بڑا حسین ہے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ جو تدریجی حقائق ہیں جن کو ہم Abstract Truth کہتے ہیں یعنی غیر محسوس‘ غیر مرئی صداقت کہتے ہیں‘ آپ اسے قانون کہہ لیجیے یہ عملی زندگی میں بڑے معانی رکھتے ہیں۔

---

❶ وہ دھڑ کا ایک وبائی مرض (چیچک) کی صورت میں آیا تھا۔

قانون تو ایک لفظی چیز ہوتی ہے اور جب قرآن اس کو بیان کرتا ہے تو ایک اسلوب بیان کرتا ہے جسے محاکاتی Descriptive کہتے ہیں۔یعنی محسوس شکل میں پیش کرنا جیسے ایک Concrete (ٹھوس) شکل ہوتی ہے۔اس شکل میں وہ ان حقائق کو بیان کرتا ہے۔اس سے یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے اور یہ بات کو سمجھانے کا مؤثر ترین طریقہ بھی ہوتا ہے۔آپ عام Ethics (اخلاقیات) کی کتابیں دیکھیے تو بچے کبھی انہیں اس طرح غور سے یا دلچسپی سے نہیں پڑھتے' انہی کو جب کہانی کے رنگ میں بیان کیا جاتا ہے تو وہ ان کو یاد (حفظ) ہو جاتی ہیں۔پھر آگے ہم پڑھتے ہیں تو ڈرامے آتے ہیں' Stories (کہانیاں) آتی ہیں۔صحیح ڈرامے قوموں کے اندر انقلاب برپا کر دیا کرتے ہیں۔وہ جو وہاں کا واعظ ہوتا ہے' وہاں کا جو تقریر کرنے والا ہوتا ہے' وہ تو اس کو Exploit کرتا ہے' یہ ذہنیت ڈراموں کی تیار کی ہوئی ہوتی ہے۔لٹریچر قوموں کی زندگی کے اندر بڑی بلا ہے۔عربوں کے ہاں تو پھر پوچھو نہیں' وہ تو ویسے ہی بہت باتیں کرنے والی قوم تھی۔ان کے ہاں تشبیہات' استعارات' مثالیں اور مرادفات تھے اور ایک ایک چیز کے لیے ہزار ہزار الفاظ ہوتے تھے۔آپ سمجھتے ہیں کہ جب وہ Descriptive (محاکاتی) ڈرامہ نویسی لٹریچر میں کرتے تھے تو ان کی کیا کیفیت تھی۔قرآن نے اسلوبِ بیان وہ اختیار کیا ہے۔بات وہ یہ کرنا چاہتا ہے کہ قوم کے لیڈر یا صاحبِ اقتدار طبقہ' قوم کے عوام یا ان کے جو متبعین (Followers) ہیں' یہ جو قوم کے اندر نظام کی خرابیاں یا فساد ہوتے ہیں' یہ دونوں اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں یا صرف یہی ذمہ دار ہوتے ہیں۔یہ ہے غور طلب پوائنٹ (نکتہ)۔قرآن اسے ڈرامائی انداز میں Explain (واضح) کرتا ہے۔

عزیزانِ من! پہلی بات تو یہ ہوگئی کہ یہ دونوں جہنم کے اندر ہوتے ہیں۔آگے چل کر وہ کہے گا کہ انہیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔اور وہاں جہنم میں آپس میں یہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں گے۔وہاں برابر کی گفتگو ہوتی ہے۔یہاں تو بہت کم مواقع ملتے ہیں۔یہ اربابِ اختیار مواقع دیتے ہی نہیں ہیں۔وہاں وہ دونوں آمنے سامنے ہوں گے اور برابر کی گفتگو ہوگی۔کہا کہ جب عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو وہ جوان کا شوکت وحشمت وغربت وافلاس ہے' وہ مٹ جاتا ہے۔قرآن نے **دمرنا** کہا ہے یعنی ہم نے اس قوم کے اوپر Road Roller (روڈ رولر) پھیر دیا ہے۔یہ **دمرنا** (27:51) بڑا عجیب لفظ ہے۔پستیاں اور بلندیاں ہموار کر دیتے ہیں جب قوم عذاب کے اندر آتی ہے۔اس میں یہ دونوں طبقے برابر کے شریک ہوتے ہیں۔اگر آپ کے پاس قرآن کے نسخے ہیں تو میرے حوالوں سے آیات نکال لیجیے' اگر نہیں ہیں تو ان حوالوں کو لکھ لیجیے۔عزیزانِ من! ان درسوں کا فائدہ اسی صورت میں ہوگا کہ آپ کے پاس ان کا ریکارڈ محفوظ رہے ورنہ یہ تو بہر حال ایک دن یہ سلسلہ تو ختم ہونا ہے۔اور اگر یہ جو میں نے کہا ہے اور آپ نے سنا ہے' تو وہ ہوا میں چلا گیا' اس کا بڑا وقتی فائدہ ہوتا ہے۔اور یہ چیزیں وقتی فائدے کی نہیں ہیں' ان حقائق کے اوپر سانس کی طرح زندگی کا مدار ہے۔یہ نہیں ہے کہ آپ کہیں کہ اچھا جی دس منٹ تک وہاں جا کر سانس لے آتے ہیں' بعد میں وہ سانس لیے یا نہ لیے' وہ تو جس وقت بھی رکا اسی وقت موت

ہو جائے گی' قرآنی حقائق اس طرح سے ہیں۔ اسی لیے جو قرآن نے کہا ہے کہ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (2:132) مرتے دم تک مسلمان رہو۔ اس کے یہ معنی ہیں۔ قرآن چونکہ آپ کے سامنے ہے اس لیے میں قرآن کی وہ آیات سرِ دست نہیں پڑھتا بلکہ ان کا مفہوم آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ آیت پہ آپ نگاہ رکھیے' گھر جا کر دیکھیے۔

قرآن کہتا ہے کہ اے رسول یا اے مخاطب! اس منظر کو سامنے لائیے جب یہ لوگ جنہوں نے ظلم کی راہ اختیار کی تھی' خدا کے حضور کھڑے ہوں گے اور اپنی غلط روش کا ایک دوسرے پر الزام دھر رہے ہوں گے۔ خوشحالی میں کوئی الزام نہیں دھرتا۔ جب تباہی آتی ہے تو پھر اس وقت یہ چیز ہوتی ہے کہ دوسرے پر الزام دھر رہے ہوں گے۔ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے۔ یہاں میں وہ دو الفاظ دہرا ہی دوں جن کا ترجمہ یا مفہوم میں نے عوام اور لیڈر کیا ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں یَقُوْلُ الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا (34:31)۔ آپ دیکھیے کہ ایک وہ ہیں جنہیں استکبار ہے' جن کے ہاتھ میں کبریائی ہے' جو صاحبِ اقتدار ہیں اور دوسرے وہ ہیں جنہیں یہ لوگ اپنی اپنی تدبیروں سے کمزور بنا کر رکھتے تھے۔ ویسے اگر یہ بھی آزاد رہتے تو انہی جیسے صاحبِ قوت ہوتے۔ انہیں کمزور بنا کر رکھا جاتا ہے۔ قرآن ایک ایک لفظ میں کیا بات کہہ جاتا ہے! یہ میں نے کہا تھا کہ میں آپ کے سامنے الفاظ لاؤں کہ وہ کیا ہیں۔ میں نے اس لیے اس کا ترجمہ عوام کیا ہے کہ یہی دو گروہ ہوتے ہیں: عوام ہوتے ہیں اور وہ لیڈر ہوتے ہیں۔ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ اگر تم ہمیں گمراہ نہ کرتے تو ہم یقیناً قوانینِ خداوندی پر ایمان لے آتے۔ لیڈر کہیں گے کہ ہمیں کیوں مطعون کرتے ہو۔ جب سیدھا راستہ تمہارے سامنے آ گیا تو کیا ہم نے تمہیں روکا تھا کہ اس راستے کو اختیار نہ کرنا۔ تم خود ہی جرائم کا ارتکاب کرنا چاہتے تھے' اب مفت میں الزام ہم پر دھرتے ہو۔ وہ اپنی مدافعت میں یہ پیش کرتے ہیں کہ تم خود ان چیزوں کے اندر سے تیار بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے تو ذرا سی بات کی اور تم پیچھے لگ گئے۔ یہ ہے ان کا جواب۔ ان کے متبعین کہیں گے کہ ہمیں جو تم کہہ رہے ہو کہ ہم خود ہی اس راستے پہ لگ گئے ہیں لیکن تم دن رات اس قسم کی چالیں چلتے اور سازشوں کا جال بچھاتے تھے جس سے ہم سیدھے راستے کی طرف آ ہی نہ سکیں۔ کیا اس کے بعد بھی تم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہو کہ تم نے ہمیں نہیں بہکایا تھا۔ آگے بات آتی ہے کہ ان کا یہ عذر بھی قابلِ پذیرائی نہیں سمجھا جائے گا۔ قرآن بتاتا ہے کہ یہ کیوں قابلِ پذیرائی نہیں ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ چند لوگ جنہیں تم صاحبِ اقتدار اور قوت کا مالک کہتے ہو' ان کی قوت کا موجب تو تم ہی تھے۔ تم ان کی تائید نہ کرتے' ان کو ووٹ نہ دیتے تو ان کو پوچھتا کون تھا۔ کیا ہم نے ان کو کوئی دس دس ہاتھ اور پچاس پچاس سر دے کر بھیجا تھا کہ تمہارے اوپر یہ جنوں کی طرح سوار ہو جاتے؟ یہ تو تم ہی میں سے تھے' تم نے ان کو صاحبِ اقتدار بنایا تھا' تم نے یہ قوت ان کو عطا کی تھی۔ تمہاری اس وقت کے اوپر جو قوت دی ہوئی تھی اس کی بنیاد پر یہ غلط چال چل رہے تھے۔ تو تم کیسے بری الذمہ ہو سکتے ہو:

تمہیں تو تم کے سوا کوئی کچھ نہ کہتا تھا

''جناب'' ہم نے بنایا ''حضور'' ہم نے کیا

ان کو ''جناب'' اور ''حضور'' تو تم نے بنایا تھا۔ سورۃ الصّٰفّٰت میں ہے کہ جہنم میں جانے والے ایک دوسرے کو مطعون کریں گے۔ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ تم یورشیں کر کے ہماری طرف آیا کرتے تھے اور اس طرح ہمیں غلط راستے پر ڈال دیتے تھے۔ سابقہ ادوار میں یعنی پہلے دور کے اندر تو معلوم نہیں کہ یہ یورشیں کس قسم کی ہوتی تھیں' ہمارا یہ جو Modern (جدید) دور آیا ہے اس میں ساری دنیا کی قوموں میں دیکھیے۔ انتخابات کے دنوں میں دیکھیے۔ یہ جو ووٹوں کے لیے Stand (کھڑے ہوتے) کرتے ہیں تو ووٹروں کے پاس کس طرح سے یورشیں کر کے آتے ہیں۔ سابقہ دور میں وہ یورشیں کر کے آیا کرتے تھے۔ وہ ان سے کہیں گے کہ ہمارا تم پر کیا اختیار و اقتدار تھا۔ کیا ہم نے تم سے جبراً پرچی چھین لی تھی' تم خود ہی سیدھے راستے پر چلنا نہیں چاہیے تھے۔ محلے کے آدمی اگر یہ چاہیں کہ شریف آدمی کو ووٹ دیں تو کون مجبور کر سکتا تھا۔ تم خود ہی اس قسم کے لوگوں سے بگاڑنا نہیں چاہیے تھے' صحیح راستے پر آنا نہیں چاہیے تھے۔ تم صحیح راستے پر چلنا چاہتے تو ہمارے پاس کون سی قوت تھی جس سے ہم تمہیں مجبور کر کے غلط راستے پر ڈال سکتے۔ ٹھیک ہے کہ ہم خود غلط راستے پر چل رہے تھے تو تم نے ہمارا اتباع شروع کر دیا اور اسی راستے پر چل نکلے۔ اب اس عذاب میں تو ہم اور تم برابر کے شریک ہیں۔ اس لیے قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ **وَ اتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً** (8:25) دیکھو! اس تباہی سے بچنے کا پہلے سے انتظام کر لو کہ جب وہ آیا کرتی ہے تو انہی لوگوں تک نہیں آیا کرتی جنہوں نے ظلم اور زیادتی کی تھی بلکہ یہ سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہے۔ عزیزانِ من! یہ سیلاب آتا ہے تو صرف وہ جو PWD [1] والے ہوتے ہیں' جنہوں نے سیمنٹ کی جگہ ریت ملا کر بند بنایا تھا' کیا وہ سیلاب صرف انہی لوگوں کو اجاڑتا ہے؟ سیلاب کے متعلق وہ فارسی کا بڑا عمدہ شعر ہے:

سیلاب نہ پرسد کہ درِ خانہ غلام است

وہ مندا اور مسجد میں' راشی اور متقی پرہیزگار کے گھر میں' تمیز کرنا تو ایک طرف رہا' وہ تو یہ بھی آ کر نہیں پوچھا کرتا کہ صاحب! اس گھر کا دروازہ کدھر ہے کہ میں اس دروازے کی طرف سے اندر آؤں۔ قرآن کہتا ہے کہ اس خطرے سے' اس تباہی سے' قبل از وقت حفاظت کا انتظام کرو کہ جب وہ آیا کرتا ہے تو صرف ظالمین تک محدود نہیں رہا کرتا۔ وہ تو سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا ہے۔ یہ انہیں کہیں گے کہ اچھا یہ' جو کچھ بھی ہوا' سو ہوا' اب اس عذاب سے تو ہمیں چھڑا دو جو آ رہا ہے۔ وہ ان سے کہیں گے کہ ہم خود اسی عذاب میں مبتلا ہیں۔ اگر ہم میں تمہیں عذاب سے نجات دلانے کی قدرت ہوتی تو پہلے ہم خود ہی عذاب سے کیوں نہ نکل جاتے۔ اب تو ہم سب کو

---

[1] Public Works Department

عذاب بھگتنا پڑے گا۔

## نظامِ معاشرت میں برائیاں پھیلنے کی وجہ

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ جو چیز ہے کہ قوم اربابِ اقتدار کی غلط کوشیوں سے بری الذمہ ہونا چاہتی ہے لیکن قرآن یہ عذر نہیں مانتا۔ وہ ہر فرد کو برابر کا ذمہ قرار دیتا ہے۔ اور اگر قوموں میں ہر فرد اس ذمہ داری کو محسوس کرنے لگ جائے تو نظام کبھی بگڑ ہی نہیں سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ صاحب! ہم خاموش رہے۔ یہ تو بہت بڑا جرم ہے۔ جتنی استطاعت ہو اس کے مطابق نہ روکنا اور خاموش رہنا' بے عمل رہنا' بہت بڑا جرم ہے۔ ہمارے ہاں اردو زبان میں تو اس کے لیے لفظ ہی نہیں ہے' البتہ انگریزی میں تین الفاظ ہیں۔ اور وہ تیسرا لفظ جو ہے وہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک تو Moral یا Morality ہے یعنی حسنِ اخلاق' اچھے اخلاق والا ہونا۔ دوسرا ہے Immoral یا Immorality یعنی بد اخلاق' یا بد اخلاقی' یہ تو دو الفاظ ہیں۔ وہاں تیسرا ایک لفظ Amoral (لا اخلاقی) بھی ہے۔ یہ تیسرا لفظ بڑا عجیب لفظ ہے کہ نہ Morality ہو' نہ Immorality ہو۔ تو پھر یہ انسان کیا ہوا۔ فلسفۂ اخلاق میں کہا گیا ہے کہ سب سے بڑے' تباہی کے باعث یہ Amoral (لا اخلاقی) لوگ ہوتے ہیں۔ ابلیسیت بھی اپنا نتیجہ رکھتی ہے' کفر بھی اپنا نتیجہ رکھتا ہے' تخریبی ہی سہی لیکن بات تو سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اس نے غلط راستہ اختیار کیا ہے' ایمان اور حسنِ انتظام جو خدا کے قانون کے مطابق ہو تو اس کے نتائج کا پوچھنا کیا ہے۔ یہ جو جمِ غفیر ہے جو Amoral (لا اخلاقی) کی صف میں آتا ہے' یہ پتھروں کی طرح بیٹھے ہوئے ہیں۔ انسانوں کی سی شکلیں ہیں لیکن یہ بات غلط ہے۔ سیاست میں یہ کہا کرتے ہیں کہ جو ہمارے ساتھ نہیں ہے وہ ہمارے دشمن کے ساتھ ہے۔ خواہ وہ کہتا پھرے کہ ہم اس کے ساتھ نہیں ہیں۔ قرآنِ کریم اسی لیے ان لوگوں کو جو اس قسم کے ہیں بہت بڑا مجرم قرار دیتا ہے۔ وہ ہر فرد کا فریضہ قرار دیتا ہے کہ جسے تم غلط سمجھے ہو اپنی استطاعت کے مطابق اس کے روکنے کے لیے تم پہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ تمہارا خاموش رہنا تو ان کو بیباک کر دیتا ہے۔ یہ ہے وہ چیز جو قرآن یہاں بتاتا ہے کہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب مت دے لو کہ ہم عملاً چونکہ اس میں شریک نہیں ہیں اس لیے ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔ تمہارا خاموش رہنا' تمہارا اس کو روکنے کے لیے انگلی نہ اٹھانا' جرم ہے۔ عربوں کے ہاں تو محاورہ تھا کہ تم برائی کو روکو خواہ ایک انگلی کے اشارے سے ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے عزیزانِ من! قرآنِ کریم پوری قوم کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔

عزیزانِ من! پہلے نو (۹) کہہ کر یہ کہا کہ اصل میں وہ یہ کچھ کیا کرتے تھے۔ یہ باقی قوم کے لوگوں کو معذور اور غیر ذمہ دار نہیں ٹھہرا دیتا کہ تم بے گناہ ہو۔ وہ کہتا ہے کہ جب وہ جہنم آتا ہے تو اس میں پھر

نہ تیرا منزل از با شد نہ میرا

وہ اور تم سب برابر کے شریک ہوتے ہو۔ اور یہ تو پھر آج ہماری دیکھی ہوئی بات ہے۔ جب بھی قوموں پہ' ملکوں پہ' تباہی آتی ہے تو کیا پھر وہ انہی لوگوں تک رہا کرتی ہے جو اس کے براہِ راست ذمہ دار ہوتے ہیں؟ نہیں' قطعاً نہیں' اس لیے یہ ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ برائی کو روکنے کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق کچھ کرے' خواہ انگلی ہی کیوں نہ اٹھانا ہو۔ آگے اور آیات بھی ہیں۔ آپ ان کے یہ ریفرنسز (حوالہ جات) لکھ لیجیے۔ (26:95-102) اور (40:47-48)۔ آگے ایک اور مقام ہے اس میں افراد کی جگہ پارٹیوں کا ذکر ہے۔ ایک پارٹی جہنم میں آئے گی' اس کے بعد دوسری جہنم میں آئے گی۔ یہ (38:59-61) ہے۔ اور وہ آپس میں یہی چیزیں کہیں گے۔ یعنی بعد میں آنے والی پارٹی کہے گی کہ تمہارے پیچھے پیچھے چلے آئے اور تم بھی جہنم میں گئے اور ہم بھی گرے۔ ہم تو محض اس لیے گرے کہ تمہارے پیچھے پیچھے چلے آئے تھے۔ ہمارا جرم کیا تھا؟ یہاں یہ ایک چیز ہے جس کے لیے میں نے خاص طور پر یہ ریفرنس دیا ہے۔ پہلے (7:38-39) میں ہے اور دوسری جگہ (38:59-61) میں ہے۔ یہ قوم خدا سے کہے گی کہ یا اللہ! اس پہلی قوم کو جس کے پیچھے لگ کر ہم جہنم میں داخل ہوئے' دہرا عذاب دے: ایک ان کے اپنے جرم کا اور دوسرا یہ کہ انہوں نے ہمیں بھی گمراہ کیا تھا۔ وجہ ہمارے ذہن میں کچھ یوں نظر آتی ہے۔ جواب ملے گا کہ تم میں سے دونوں کو دہرا دہرا عذاب ملے گا۔ تمہیں اپنا جرم اور انہیں گمراہ کرنے کا جرم اور انہیں اپنا جرم اور تمہیں تقویت بخشنے کا جرم کہ وہ اس قسم کا ظلم کریں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآنِ کریم ذمہ داری ان تک محدود نہیں کرتا۔ یہ جو پوری قوم ہے وہ اس کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ اور آج تو وہ ساری سیاست اقوامِ عالم میں جو کچھ گزر رہا ہے وہ سب چیزیں یہی بتا رہی ہیں کہ یہی ہوتا ہے۔

## نبی اکرمؐ اور حضرت صالحؑ کے وقائع میں مماثلت

وہاں وہ نو (۹) سرغنہ تھے جو **يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ** (27:48) ملک میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے تھے۔ ایک بات تو یہ آ گئی۔ اب آئی ابلیس کی سیاست۔ حضرت صالحؑ سے انہوں نے معاہدہ کر لیا پھر اپنی میٹنگ بلائی اور **قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ** (27:49) آپس میں کہا کہ قسم اٹھاؤ کہ ہم سب مل کر صالحؑ اور اس کے ساتھیوں پر رات کو حملہ کر دیں گے۔ دیکھا! اندر بیٹھ کر مخفی طور پر سازش کر رہے ہیں کہ صاحب! یہ کانٹا ہی نکال دیا جائے۔ رات کی تاریکی میں چپکے سے بغیر کسی کو پتہ بتائے ہوئے' یہ اور اس کے جو چار ساتھی ہیں ان کا قصہ ختم کر دو۔ ان کو ختم کر دو تو معاملہ ختم ہو جائے گا۔ اب یہاں سیاست کی ریاکاریاں ہیں۔ **ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ** (27:49) اور صبح اٹھ کے پوچھو تو کہیں کہ خدا کی قسم' صاحب! ہمیں

کچھ پتہ نہیں ہے، ہمیں کچھ علم نہیں ہے جو کچھ ہے بس انہیں ختم کرو اور نکل جاؤ۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میکیاوَلی سیاست کی کس طرح سے پردہ کشائیاں ہو رہی ہیں اور کوئی اور تدبیر کارگر نہیں ہو رہی تو یہ ہے کہ انہیں ختم ہی کر دو۔ ختم کرنے کے بعد پھر یہ نہیں ہے کہ دھڑلے سے کہو کہ ہاں صاحب! ہم نے یہ کیا ہے بلکہ مکر جاؤ اور قسمیں کھاؤ کہ نہیں صاحب! ہم تو بالکل سچے ہیں۔

عزیزانِ من! اب یہ چیز بھی ہے جو میں نے کہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اور حضرت صالحؑ کی زندگی میں ایک مماثلت ہے۔ شبِ ہجرت میں یہی چیز تھی جو مکے والوں نے آخر میں سوچی تھی۔ اتنا لمبا عرصہ گزر گیا۔ ہم تو اس کو اس کی تعلیم پھیلانے سے روک نہیں سکتے۔ اس کا قصہ ہی ختم کر دو۔ اور سب نے مل کر یہ سازش کی تھی کہ کسی ایک قبیلے کے ذمے یہ جرم قتل عائد نہ ہو جائے۔ لیکن آگے جو بات کہی ہے کہ ادھر تو ہمیں پتہ نہیں کہ کیا صورت ہوئی تھی مگر ادھر یہ کہا کہ **وَمَكَرُوْا مَكْرًا** (27:50)۔ یہ جو ''مکر'' کا لفظ ہے ہمارے ہاں تو برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی ''سازش یا تدبیر'' کے ہوتے ہیں۔ اچھی تدبیر کے لیے بھی اور بری تدبیر کے لیے بھی عربی زبان میں یہ لفظ آتا ہے۔ کہا کہ وہ قوم تو اس قسم کی اپنی جگہ بری تدبیریں کر رہی تھی۔ **وَمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ** (27:50) اور اُدھر ہم بھی کچھ تدبیریں کر رہے تھے۔ ہماری تدبیروں کا ان کے شعور تک کو علم نہیں تھا۔ ہماری تدبیریں اتنی مخفی ہوتی ہیں۔ یہ دوسری بات میں عرض کروں گا کہ خدا کی تدابیر کس طرح سے آیا کرتی ہیں؟ کائناتی قوانین کا جو نظام ہے یہ اس کے Through (توسط سے) آیا کرتی ہیں۔

بہرحال ان کے شعور تک میں بھی یہ بات نہیں تھی، سو تم دیکھو **فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ** (27:51)۔ اب قرآن درمیان کی کڑیاں چھوڑ رہا ہے۔ کہا کہ انہوں نے غلط نظامِ زندگی کے انجام کے تابع پھر غلطی کی ہے اور غلط قدم اٹھاتے چلے جا رہے ہیں۔ اب اس کا انجام دیکھ لو۔ کیا تھے غلط قدم؟ یہ کہ وعدہ کرتے ہیں وعدہ خلافی کرتے ہیں۔ یوں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تو قتل کرنے کے لیے سازشیں ہو رہی ہیں۔ قتل کے بعد سوچ رہے ہیں کہ جھوٹ بولیں گے، مکر جائیں گے، اس کا اعتراف ہی نہیں کریں گے۔ یہ ساری چیزیں قرآن گنا رہا ہے۔ اب درمیان کی کڑیاں یہاں نہیں دی گئیں۔ صرف یہی کہا کہ **فَانْظُرْ** (27:51) ان کی تدبیر کا انجام دیکھ لو۔ یہ ڈرامائی انداز ہے، اس کو محاکاتی انداز کہتے ہیں۔ **فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ** (47:50)۔ کہا تھا کہ وہ بھی تدبیریں کر رہے تھے اور ہم بھی کر رہے تھے۔ کہا کہ دیکھو! ان کی تدبیروں کا نتیجہ کیا نکلا۔ وہاں اپنی تدبیروں کی طرف اشارہ نہیں کیا کیونکہ ان کے جو غلط اقدام ہیں یہ ان کے نتیجے میں تباہی آئی ہے۔ ان کی تدبیروں کا کیا نتیجہ نکلا؟ **اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ** (27:51)۔ ان نو (۹) اور ان کی قوم، سب کے سب پر، ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل نے روڈ رولر پھیر کر رکھ دیا۔ وہ پست درجہ اور بلند

درجہ قوم کے اندر رہ کر دولت اور قوت کے اقتدار کے نشے میں ناہمواریاں پیدا کرتے تھے۔ ہم نے انہیں زمین کے ساتھ ہموار کر دیا۔ میں نے کہا ہے کہ قرآنِ کریم کا انداز محاکاتی ہے۔ اس کے بعد کہا کہ **فَتِلْکَ بُیُوْتُھُمْ** (27:52) یہ ہیں ان کے مکان! یہ بڑا خوبصورت انداز ہوتا ہے۔ ان کی یہ بستیاں اس شاہراہ پر واقع ہوئی تھیں جہاں سے مکے والے صبح شام جایا کرتے تھے' ان کے تجارتی قافلے ادھر سے گزرا کرتے تھے۔ راستے میں ان کے یہ ''ٹیکسلا اور ہڑپہ'' تھے۔ وہ اس انداز کا ٹیکسلا اور ہڑپہ نہیں ہے جو یہاں پاکستان میں ہے۔ انہوں نے بہت انتظام کیا ہوا تھا۔

## اعمال کا مآل ''بے چراغ'' بستیوں کی صورت دھارتا ہے: یہ ہے مکافاتِ عمل

قرآن بتاتا ہے کہ **فَتِلْکَ بُیُوْتُھُمْ خَاوِیَۃًۢ بِمَا ظَلَمُوْا** (27:52) ہم یونہی ان کے اوپر تباہی نہیں لے آئے تھے۔ وہ دیکھو! ان کے گھر ویران پڑے ہوئے ہیں۔ گھر تو ہیں مگر کھنڈرات ہیں' ویران پڑے ہوئے گھر ہیں۔ کھنڈرات کا باقی رہنا تاریخ کے لیے بڑا سبق آموز ہوتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس سے بڑی عبرت حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ وہ جو روما کے کھنڈرات ہیں' ان کی شان و شوکت سامنے نظر آئے۔ پھر جب وہ اجڑے ہوئے نظر آئیں تو ان کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ یہ ہوتا ہے خاویۃ اجڑے ہوئے۔ اب بھی ہمارے ہاں یہ جو محکمہ مال کی اصطلاحات ہیں' مثلاً یہ اکبر (1605-1556ء) کی وضع کردہ ہیں۔ یہ جو اجڑا ہوا گاؤں ہوتا ہے اسے پٹواری کے کاغذوں میں ''بے چراغ'' لکھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ بڑی خوبصورت ٹرم (اصطلاح) ہے۔ وہ گاؤں جس میں دیا ہی نہیں جلتا۔ یہ بڑی اچھی جامع تفصیل ہے: اجڑے ہوئے کی' ویران کی۔ یہ چیز کہ وہاں دیا ہی نہیں جلتا۔ اسے **بِمَا ظَلَمُوْا** (27:52) کہہ کر قرآن' تاریخ سے اس کو اپنے قانونِ مکافات کی طرف لے آیا ہے۔ تاریخ ہوتی تو اتنا ہی کہتی کہ یہ ان کے اجڑے ہوئے گھرانے ہیں لیکن یہاں **بِمَا ظَلَمُوْا** [1] (27:52) کہا ہے اور آگے پھر یہ ہے کہ اس سے تمہارے لیے کیا بات آئی؟ کہا کہ **اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ** (27:52) وہ قوم جو علم و بصیرت سے کام لے گی' ان کے اجڑے ہوئے کاشانوں کی ٹھیکریوں پر لکھی ہوئی' ان کے عبرت و انجام کی چیزیں' ان کے لیے بڑی اہم اور سبق آموز ہوں گی بشرطیکہ وہ علم و بصیرت سے کام لیں۔ یہ تھی قومِ ثمود اور **وَاَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ** (27:53) ان میں سے جو صحیح صداقتوں پر ایمان لے آئے تھے اور اس کے مطابق وہ محتاط رہے تھے کہ تباہیوں سے بچ جائیں تو ان کو ہم نے بچا لیا۔

---

[1] یہ اس لیے ہوا کہ وہ لوگوں پر ظلم کرتے تھے۔

## علم کے باوجود جاہل کے جاہل

عزیزانِ من! اس کے بعد قومِ لوط کا قصہ ہے۔ درس کے ختم ہونے میں دس منٹ باقی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید بات ختم ہو جائے۔ یہ بات پہلے بھی آ چکی ہوئی ہے۔ Sex (جنسیات) کے متعلق قرآن نے اسی ایک قوم کا ذکر کیا ہے۔ مجھے اب زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح لوطؑ کی سرگزشت ہے۔ **وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ** (27:54) جس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم سب کچھ دیکھتے بھالتے، سمجھتے سوچتے، اس قدر کھلی ہوئی بے حیائی کا کام کرتے ہو! یہ ہے بات، اسے دہرا دوں کہ تم جاہل قوم نہیں ہو، دیکھتی بھالتی ہو، بصیرت رکھتی ہو۔ اس کے باوجود اس قسم کی فحش کاریوں میں ہو! وہ تو ہزاروں سال پہلے کی اس زمانے کی بات ہے، میں نے جب عرض کیا تھا کہ انگلستان میں انگریزوں، جیسی قوم جس کے تہذیب و تمدن ساری دنیا میں مانے جاتے تھے، آج نہیں تو کل تک ان کی یہی کیفیت تھی۔ ان کے ''تبصرون'' ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ لیکن آج دنیا میں کسی قوم نے قانونی طور پر اس Sex (جنسیات) کو اپنے ہاں جائز قرار دیا ہے تو انگریزوں کی قوم نے دیا ہے۔ یہ دنیا میں تہذیب پھیلانے کی مدعی قوم ہے۔ اس نے Sodomy کو قانوناً جائز قرار دیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ** (27:55) تمہاری حالت یہ ہے کہ تم، جنسی خواہش کی تسکین کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف آتے ہو۔ یہ کتنی بڑی جہالت کی بات ہے! تمہارا علم و بصیرت کا اتنا بڑا دعویٰ ہے اور عمل کی یہ کیفیت ہے تو اس سے بڑی جہالت اور کیا ہو سکتی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ علم کے باوجود جہالت ہے۔ **فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ** [1] (27:56)۔ جواب یہ ملتا ہے۔ وہاں تو انہوں نے صرف یہ کہا تھا کہ تم بڑے منحوس ہو۔ یہاں انہوں نے کہا کہ وہ چند آدمی ہیں، ان سے کہو کہ جی ٹھیک ہے، ہم ایسے ہی ہیں، بدمعاش ہیں، غلط کوش ہیں۔ تم بڑے نیکوکار بنتے ہو، پرہیزگار بنتے ہو، تو جاؤ، جا کر وہ پرہیزگاری کی بستی ہے، جا بسو۔ جو غلط کار کو غلط کار کہے تو اس کا جواب یہ ہوتا ہے کہ اس کو اپنے معاشرے سے الگ کر کے کہیں اور بھیج دو تا کہ غلط کار ہمیں کچھ کہہ ہی نہ سکے۔ یہ بڑی چیز ہے جو یہ جواب ہے کہ انہیں میں سے الگ کر دو۔ یہ بہت متقی پرہیزگار بنتے پھرتے ہیں، بہت نیکوکار ہیں، ہماری غلط کاریوں کے اوپر ہمیں ٹوکتے ہیں۔ انہیں معاشرے سے الگ کر دو۔

---

[1] اس کی قوم کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا بجز اس کے کہ انہوں نے باہمی مشورہ کیا کہ لوطؑ کی جماعت کے لوگوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کیا جائے۔ یہ بڑے پاکباز بنتے ہیں! (ایسے ''پاکبازوں'' کا ہم جیسے ''سیاہ کاروں'' سے بھلا کیا کام! (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص ص، 872)۔

## دل کا قرآنی مفہوم

قرآن کہتا ہے کہ فَاَنۡجَیۡنٰہُ وَ اَہۡلَہٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَہٗ ۫ قَدَّرۡنٰہَا مِنَ الۡغٰبِرِیۡنَ (27:57)۔ یہاں ایک لفظ ''اہل'' ہے، پھر یہ وضاحت طلب ہے۔ کہا کہ وہ جو حضرتِ لوطؑ اور ان کے پاکباز ساتھی تھے، ان کو ہم نے اُس تباہی سے بچالیا جو وہاں اس قوم پہ آنے والی تھی لیکن اس کی جو بیوی تھی، اسے نہیں۔ یہاں اہل کہا ہے۔ اہل وعیال اب تک ہمارے ہاں بھی تو ہے، بیوی تو سب سے پہلے اہل ہوتی ہے۔ حضرتِ نوحؑ کے قصے میں انہوں نے کہا کہ بیٹا میرا اہل تھا تو انہیں کہا گیا تھا کہ وہ تمہارا اہل نہیں ہے۔ تمہارا اہل تو وہ ہے جو تمہارا اتباع کرتا ہے۔ باپ اور بیٹے کا تعلق منقطع ہوا۔ یہاں بیوی کے متعلق کہا ہے کہ حضرتِ لوطؑ کے جو اہل تھے، انہیں بچالیا لیکن بیوی کو نہیں بچایا، وہ اس کے اہل میں سے نہیں تھی۔ یہ کہتے ہیں کہ دو قومیں کیسے بنتی ہیں؟ اگر Ideology (نظریہ حیات) کا فرق ہو، یہاں باپ اور بیٹا اہل میں سے نہیں ہوتے، میاں اور بیوی ایک اہل میں سے نہیں ہوتے۔ یہاں لفظ ہے: قَدَّرۡنٰہَا مِنَ الۡغٰبِرِیۡنَ (27:57)۔ بس یہاں جو ترجمے ہیں وہ ہیں جو انسان کو تباہی میں ڈال دیتے ہیں۔ کہیں ترجمہ دیکھا ہوگا کہ اس کے مقدر میں ہی یہ لکھا ہوا تھا۔ مقدر کا یہ کہتے ہیں کہ خدا لکھتا ہے۔ آپ سوچیے کہ جب خدا نے ہی لکھا تو پھر اس کے اوپر ظلم کیسا؟ اس لفظ قدر کا اور تقدیر کا پہلے دن سے ایسا غلط ترجمہ ہوا، اسی میں پوری قوم، قرآن کے ایک غلط ترجمے سے، تباہیوں کے اندر ڈوب گئی۔ میں زیادہ تفصیل میں تو اس مقام پہ نہیں جاؤں گا۔ یہ تو بہت بڑا موضوع ہے۔ اگر آپ دلچسپی رکھتے ہیں تو میری ''کتاب التقدیر'' کے نام سے ایک کتاب ہے۔ تقدیر کا پورا مسئلہ اس میں آ گیا ہے۔

یہاں تو یہ کہہ کر آگے چلے جائیے کہ جس قسم کی اس کی روش تھی، جس قسم کی وہ باتیں کرتی تھی، جو کچھ ان کا اندازِ زیست تھا، اس سے اندازہ یہی ہوا ہے کہ یہ لوطؑ کا ساتھ نہیں دے گی، ان کا ساتھ دے گی۔ قدر تو پیمانے کو کہتے ہیں، اندازے کو کہتے ہیں۔ وَ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدۡرِہٖۤ (6:91) انہوں نے خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا۔ کوئی بھی ہو، اگر اس کو ذرا ٹسٹ کریں کہ اس کی وہ روش کس قسم کی ہے، کیسی ذہنیت ہے، کیسی باتیں کرتے ہیں، تو یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہوتا کہ ایسے ٹیسٹ کے وقت یہ کیا روش اختیار کرلے گا۔ کہا کہ اس ٹسٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ان کا ساتھ نہیں دے گی بلکہ ان کا ساتھ دے گی۔ یہ ہے اس کے معنی، عزیزانِ من! ''مقدر ہو چکا تھا'' اس کے معنی نہیں ہیں۔

## عذابِ الٰہی اور مادی اسباب میں ربط

اب یہاں پھر وہی بات آتی ہے کہ کہو وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ مَّطَرًا فَسَآءَ مَطَرُ الۡمُنۡذَرِيۡنَ ❶ (27:58)۔ یہ جو Dead Sea (بحرِ مردار) ہے اس کے اردگرد کے علاقے میں وہ رہتے تھے۔ وہاں بہت سے آتش فشاں پہاڑ تھے۔ ان آتش فشاں پہاڑوں سے لاوا نکلا یا پتھر نکلے یا Smoke (دھواں) نکلا۔ اس نے بستیوں کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اب یہ چیز میں حضرتِ نوحؑ کے قصے میں وضاحت سے بیان کر چکا تھا کہ قوم کی اخلاقی برائیوں کا ذکر ہوتا ہے تو ان دونوں ❷ میں کیا تعلق ہے؟ میں یہ ربط و تعلق بڑی وضاحت سے بیان کر چکا ہوں۔ میری کتاب ''جوئے نور'' میں پہلا ہی ذکر حضرتِ نوحؑ کا ہے۔ اس میں بھی میں نے اس کو Explain (واضح) کیا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جو قوم بھی اخلاقی طور پر پستیوں میں یعنی برائیوں میں گر چکی ہوتی ہے' اس کا نظام غلط ہوتا ہے' اس قوم کے ہاں افراتفری' مفاد پرستی' خودغرضی کی یہ ساری چیزیں اس قدر آ جاتی ہیں کہ ان کا جو طبعی نظام ہوتا ہے وہ بگڑ جاتا ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو نظر آئے گا کہ صاحب! یہ سیلاب روز آتے ہیں' تباہیاں مچا جاتے ہیں تو کیا یہ اس قوم کی افراتفری' مفاد پرستی اور خودغرضی کی وجہ سے آتے ہیں؟ یہ کیوں ہوتا ہے؟ تحقیق کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ وہ جو اربابِ اقتدار تھے' ان کی کرپشن کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ اس تمام عملے نے یا ان تمام اربابِ ذمہ دار نے جن کے ذمہ سیلاب کی روک تھام تھی' Corruption (بے ایمانی و بدعنوانی) سے کام لیا' مسالہ صحیح نہیں لگایا' اس کے بعد نتیجہ یہ ہوا کہ صرف اربابِ اقتدار ہی نہیں بلکہ ساری قوم سیلاب میں غرق ہو گئی۔ یہ ہوتا ہے ان دونوں ❸ کے اندر ربط۔ اور یہ بڑی بات ہوتی ہے۔

حضرتِ نوحؑ کے قصے میں بھی یہ آیا تھا کہ وہ سامنے بیٹھے کشتی بنا رہے تھے' وہ بتا رہے تھے کہ یہ نظر آ رہا ہے۔ پچھلے ریکارڈ بھی یہ

---

❶ چنانچہ اس قوم پر کوہ آتش فشاں سے پتھروں کی بارش ہوئی۔ کسی قدر بُری تھی' وہ بارش جوان لوگوں پر برسی' حالانکہ انہیں اس کے متعلق پہلے سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ (لیکن انہوں نے اپنا شیوہ بنا لیا تھا کہ لوطؑ کی ہر بات کی مخالفت اور تکذیب کرنی ہے)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 872)

❷ خارجی کائنات کے طبعی حوادث (مثلاً سیلاب' زلزلہ' آندھیاں' جھکڑ' خشک سالی' طوفانِ بادِ تند' سونامی' آتش فشاں پہاڑوں کا پھٹنا وغیرہ) اور اخلاقی برائیوں میں

❸ عذابِ الٰہی اور مادّی اسباب میں ربط۔ جس قوم میں اجتماعی بدکرداری (Corruption) آ جائے یا جو قوم (مثلاً) عیش و عشرت میں غرق ہو کر اپنے ملک کے نظم و نسق کی طرف سے غافل ہو جائے تو اس کی اس بدنظمی کی وجہ سے اس قسم کے طبعی حوادث ان کی تباہی کا موجب بن جاتے ہیں یعنی یہ حوادث رونما تو ان کی اس طبعی بدنظمی کی وجہ سے نہیں ہوتے لیکن ان کی بدنظمی کی وجہ سے ان کا نقصان سخت ہوتا ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ جو قوم اپنے نظم و نسق کو درست رکھے وہ اس قسم کے نقصانات سے یا بالکل محفوظ رہتی ہے یا ان کا ازالہ بعجلت کر لیتی ہے۔ یہی پہلے ہوتا تھا' یہی اب ہوتا ہے (35:43)۔ (پرویزؒ: جوئے نور' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1994 ص۔ 31)۔

بتا رہے ہیں کہ پہاڑ کے اوپر بارشیں ہوئیں ہیں تو اس وادی کے اندر بڑا پانی آ جائے گا' بے حد سیلاب آ جائے گا۔ سیلاب سے بچنے کے لیے یہ طریقہ ہے کہ کشتی ہونی چاہیے۔ سیدھی سی بات ہے۔ جب نبی اور ان کے ساتھی بھی کشتی کے ذریعے سیلاب سے بچ رہے ہیں تو اگر وہ قوم بھی کشتی بنا لیتی تو کیا اللہ میاں ان کی کشتی کو ڈبو دیتا۔ وہ مذاق کرتے تھے کہ کیا کہہ رہے ہو تم' ہمارے پاس انتظامات ہیں۔ وہ ان سے کہتے تھے کہ تمہارا انتظام کام نہیں دے گا۔ جیسا کہ حضرتِ نوحؑ کے بیٹے نے کہا تھا کہ کوئی بات نہیں' میں ذرا جو اونچی سی چوٹی ہے اس پہ چلا جاؤں گا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر پانی اتنا زیادہ ہو گیا' چوٹی پہ بھی آ گیا تو کیا کر لو گے' نہیں بچ سکو گے۔ اس سیلاب سے خدا کے قانون کی رو سے ہی بچا جائے گا۔ اور وہ ہے کشتی بنانا۔ یہاں یہ الفاظ آئے ہیں: **فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ** (27:58) کس قدر بُری تھی وہ بارش جوان لوگوں پر برسی' حالانکہ انہیں اس کے متعلق پہلے سے وارن کر دیا گیا تھا کہ

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہ گزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے [1]

یہ پیشین گوئی کوئی ولی نہیں کر رہا۔ یہ ہے **فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ** (27:58)۔ یہ ان کے لیے تھی جنہیں آگاہ کر دیا گیا تھا' جنہیں وارن کر دیا گیا تھا کہ ان کا انجام کس قدر برا ہوا تھا۔ کہا کہ **قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ** [2] (27:59)۔ دیگر جگہ بھی آیا ہے کہ خدا نے ان ظالموں کی جڑ کاٹ دی۔ ظالم کی جڑ کاٹنے کے معنی یہ ہیں کہ جو مظلوم ہے وہ محفوظ ہو جائے۔ یہاں ظالم کی جڑ کٹنے پہ خوشی نہیں ہو رہی بلکہ مظلوم کی جو حفاظت ہو گئی ہے اس کے اوپر یہ کہا گیا ہے کہ وہ خدا کس قدر مستحقِ حمد و ستائش ہے جو مظلوموں کی حفاظت کا سامان ظالموں کی تباہی سے کر دیتا ہے۔ یہی تو الحمد للہ کا مقام ہے ورنہ تباہی تو کسی انسان کی بھی آ رہی ہو تو وہاں یہ ہے کہ خدا یہ کہہ رہا ہے کہ **يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ** (36:30) او میرے بندو! تم نے کس طرح اپنے آپ کو تباہ کر لیا ہے! لیکن اس کے مرنے سے یہ جو مظلوم اور مقہور کی حفاظت ہو جاتی ہے' تو اس پر وہ [3] کہتا ہے کہ

---

[1] اقبالؒ: بالِ جبریل' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص۔ 81۔

[2] ان تاریخی شواہد کی روشنی میں' یہ حقیقت تمہارے سامنے بے نقاب ہو جائے گی کہ خدا کا قانونِ مکافات کس قدر درخورِ حمد و ستائش ہے جو ظلم کرنے والوں کو تباہ کر دیتا ہے اور جو لوگ اس کے قوانین کی محکومیت اختیار کرتے ہیں' انہیں ان ظالمین کے گروہ سے الگ کر کے امن و سلامتی میں رکھتا ہے۔ (اگر خدا کا قانون مکافات نہ ہوتا' تو جو گروہ ایک دفعہ کسی طرح قوت حاصل کر لیتا' وہ دوسروں پر ظلم و ستم کیے جاتا' اور کوئی اسے روکنے والا نہ ہوتا)۔ اس کے بعد سوچو کہ کیا خدا (کے قانونِ مکافات) کا غلبہ اور اقتدار بہتر ہے یا ان قوتوں کا جنہیں یہ لوگ خدا کے ساتھ شریک کرتے ہیں! (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 872 تا 873)۔

[3] یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

مرگِ تُو اہلِ جہاں را زندگی است
باش تابینی کہ انجامِ توچیست

تیری موت میں دنیا کے مظلوموں کی زندگی کا راز پنہاں ہے۔اس انجام پر جو الحمدللہ کہنا ہے' وہ مظلوموں کی حفاظت کے سامان کا ہو جانا ہے۔اس پہ یہ چیز کہی گئی ہے۔

عزیزانِ من! ہم پارہ انیسویں کے آخیر تک آ گئے۔اگلی 60ویں آیت سے 20واں پارہ شروع ہوگا اور ہم سورۃ النمل کی 60ویں آیت سے اگلا درس شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀.....❀❀.....❀❀

# چھٹا باب: سورۃ النمل (آیات:64-63 ;61-60)اور مورس بوکائے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۳﴾ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۶۴﴾

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1978ء کی 6 تاریخ ہے۔ درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ النمل کی آیت 60 سے یوں کہیے کہ ہونا چاہیے تھا۔ اس سورۃ کی 60ویں آیت سے بیسواں پارہ شروع ہوتا ہے۔ یہ جو پاروں کی تقسیم ہے' قرآن کریم کی ترتیب میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تلات کی سہولت کے پیش نظر' یہ جو رکوع اور پارے تھے' اِن کی تقسیم کی گئی ہے۔ بہرحال یہاں سے بیسواں پارہ شروع ہوتا ہے۔

## پچیس سال کے طویل عرصہ میں دیئے جانے والے دروس کے بالمقابل اپنی نوعیت کا یہ پہلا درس

میں نے یہ عرض کیا ہے کہ آج کا درس یہاں یعنی سورۃ النمل کی آیت 60 سے شروع ہونا تھا تو گویا یہاں سے بات کچھ دوسری طرف چلی گئی۔ آج کا درس ایک خصوصیت کا حامل ہے۔ اور اِس میں ایسی انفرادیت ہے کہ جہاں تک میں غور کر رہا ہوں' میرے درس کے سلسلوں میں جو پچیس برس سے مسلسل چلے آ رہے ہیں' یہ اِس انداز کا پہلا درس سامنے آئے گا۔ مجھے افسوس یہ ہے کہ پچھلے ہفتے میرے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ یہ آیات آ رہی ہیں ورنہ میں اِس کا اعلان ضرور کر دیتا۔ آیات جو سامنے آ رہی ہیں وہ ہیں: اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ءَ

شَجَرَهَا ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ o اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَ جَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ❶ (27:60-61)۔اگلی ایک آیت چھوڑ کر یہ آیات ہیں:اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ مَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا ۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ o اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ❷ (27:63.64)۔یہ بڑی عظیم آیتیں ہیں۔یہ خارجی کائنات کے مختلف گوشوں کے متعلق توجہ دلائی گئی ہیں۔

---

❶ اس حقیقت کی شہادت کے لیے کہ کائنات میں قانون صرف خدا کا کارفرما ہے' کسی اور کا قانون اس میں شریک نہیں' ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جس نے اس تمام سلسلہ کائنات کو پیدا کیا ہے۔جو تمہارے فائدے کے لیے بادلوں سے بارش برساتا ہے پھر اس پانی سے نہایت خوشنما باغات اگاتا ہے۔تمہارے لیے تو یہ ممکن نہیں تھا کہ خدا کے ان عطیات (زمین' پانی' ہوا' روشنی' حرارت) کے بغیر ان درختوں کو اگا سکتے۔اب بتاؤ کہ کیا یہاں قانون خداوندی کے اختیار و اقتدار کے علاوہ' کسی اور کا اقتدار و اختیار بھی کارفرما ہے؟ کیا اس کے ساتھ کوئی اور الہ بھی ہے؟ (اگر یہ لوگ اس پر خالی الذہن ہو کر غور کریں تو اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو کہ یہ سب کچھ خدا اور صرف خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے اس لیے کائنات میں کوئی اور ہستی ایسی نہیں جسے الہ قرار دیا جا سکے)۔لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ لوگ سیدھے راستے پر چلنے کے بجائے اپنے جذبات کے تابع' ایک طرف کو جھک جاتے ہیں اور یوں کجروی اختیار کر لیتے ہیں (27:60)۔پھر ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جس نے زمین کو (باوجود اس کی اس قدر تیز گردش کے) ایسا بنا دیا جس پر ہر شے نہایت عمدگی سے ٹھہر سکتی ہے۔اور اس کے اندر دریا بہا دیئے۔اور بلند پہاڑ کھڑے کر دیئے۔اور دو دریاؤں کے درمیان روک کا سامان پیدا کر دیا (25:53)
اب بتاؤ کہ کیا کوئی اور ہستی بھی ایسی ہے جس کا اقتدار اس تمام نظم و نسق میں شریک ہو؟ جب کوئی اور اس میں شریک نہیں تو خدا کے ساتھ کوئی اور الہ کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن یہ لوگ علم و بصیرت سے کام نہیں لیتے (اور محض توہم پرستی اور جہالت کی بنا پر غلط راستے اختیار کر لیتے ہیں)۔(27:61)۔(پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔874 تا 875)۔

❷ پھر ان سے پوچھو کہ جب تم رات کی تاریکیوں میں' صحراؤں یا سمندروں میں سفر کرتے ہو تو وہ کون ہے جو (ستاروں کی روشن قندیلوں سے) تمہاری راہ نمائی کرتا ہے (اور اس میں کبھی غلطی نہیں ہوتی)۔اور وہ کون ہے جو اس بارش سے پہلے' جو مخلوق کے لیے سامانِ پرورش اپنے دامن میں لاتی ہے' ہواؤں کو بھیجتا ہے جو اس (بارش) کی آمد کا مژدہ جانفزا سناتی ہے۔بتاؤ کہ خدا کے علاوہ کوئی اور بھی ہے جس کا قانون یہ سب کچھ کرتا ہے؟ کیا اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ خدا کی ذات اس سے بہت بلند ہے کہ اس کے ساتھ اور قوتوں کو بھی شریک کیا جائے (27:63) ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو ہر شے کی تخلیق کی ابتدا کرتا ہے' اور پھر اسے گردشیں دے کر مختلف ارتقائی مراحل میں سے گزارتا ہوا اس کی منزل مقصود تک پہنچاتا ہے۔وہ کون ہے جس کا نظامِ ربوبیت' فضا کی بلندیوں اور زمین کی پستیوں کے باہمی تعاون سے تمہارے لیے سامانِ رزق پیدا کرتا ہے۔بتاؤ کہ خدائے واحد کے قانون کے علاوہ کسی اور کا قانون و نظام بھی یہ کچھ کر سکتا ہے! اگر تم سمجھتے ہو کہ ایسا ہو سکتا ہے تو اپنے دعوے کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرو (اس لیے کہ ہمارا ہر دعویٰ دلیل و برہان پر مبنی ہے اس لیے اس کی تردید بھی دلیل و برہان ہی سے کرنی ہوگی۔اور دلیل و برہان تم کوئی پیش نہیں کر سکتے (23:17)۔(27:64)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔875)

ہمارے ہاں کی جو عام محسوس Observation (مشاہدہ) میں بارش کا برسنا' نباتات کا اگنا' نہروں کا بہنا' اجناس کا زمین سے پیدا ہونا' یہاں سے لے کر آگے چلتے ہوئے ستاروں کی دنیا' کرّوں کی دنیا' ارض کی یہ مختلف خصوصیات ہیں جن کا ذکر آیا ہے اور پھر یہ چیز ہے کہ تخلیقِ ارض وسما کی ابتدا کیسے ہوئی' کن کن مراحل میں سے گزرتی ہوئی یہاں تک پہنچی؟ اور ہر آیت کے بعد کہا ہے کہ کیا خدا کے ساتھ کوئی ایسا صاحبِ اقتدار بھی ہوسکتا ہے جو یہ کچھ کرے؟ اس کے بعد یہ کہا ہے کہ اگر تم یہ دعویٰ کرتے ہو تو اِس کی تائید میں دلیل و برہان لاؤ' یہ بہت بڑی چیز ہے۔

## کائنات کے متعلق پیش پا افتادہ تصورات کی الجھنیں

یہ کہنے کے بعد کہ یہ بڑی عظیم چیز ہے میں نے دو تین دفعہ کہا ہے کہ آج کا درس بھی ایک منفرد درس ہے۔ یہ نظر آئے گا کہ یہ تو عام پیش پا افتادہ چیزیں ہیں کہ بارشیں ہوتی ہیں' نباتات اگتی ہے' نہریں بہتی ہیں' انسان چلتے پھرتے ہیں۔ یہ تخلیق ہوگئی۔ تو یہ کیا خصوصیت ہے؟ ٹھیک ہے ہمارے نزدیک واقعی خصوصیت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی چیز ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتیں ہیں' یا اللہ! تیرا شکر ہے' تُو نے یہ دیا۔ وہ واقعی بڑا قادرِ مطلق ہے جو یہ سب کچھ کرتا ہے اور الحمدللہ کہہ کر ہم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کبھی کوئی اثر ہمارے قلب و دماغ پہ ان چیزوں کا نہیں ہوتا۔ یہ چیز غور طلب ہے کہ یہ سب کچھ کہنے کے بعد وہ کہہ رہا ہے کہ اگر اس چیز سے تمہیں انکار ہے تو اِس کی تردید میں کوئی دلیل لا کر بتاؤ۔ وہ دلیل مانگتا ہے۔ بات کیا ہے؟ ہمارے ہاں کے اکثر نوجوان جن کے سامنے قرآن نہیں بلکہ مذہب پیش کیا جاتا ہے' وہ بیچارے تڑپتے ہوئے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اِس کا ثبوت کیا ہے کہ یہ قرآن واقعی خدا کی کتاب ہے' ذہنِ انسانی کی تخلیق نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی یا کسی انسان کی جو تاریخ کے کسی دور میں ہوا ہے فکر کا نتیجہ نہیں ہے۔ اِس کی دلیل کیا ہے؟ اس کا ثبوت کیا ہے؟

## قرآنِ حکیم کے نزدیک وہ ایمان ہی نہیں کہلاتا جس کے متعلق کوئی دلیل نہ ہو

یہ ٹھیک ہے کہ قرآن تو بغیر ثبوت کے' بغیر دلیل کے' کسی چیز کو منواتا ہی نہیں ہے۔ وہ تو اُس ایمان کو ایمان ہی نہیں کہتا جو دلیل و برہان اور علم و بصیرت کے اوپر مبنی نہ ہو۔ اسی لیے وہ یہاں بھی کہتا ہے کہ اگر تمہیں اس میں کوئی شک ہے تو اِس کے خلاف دلیل لاؤ۔ وہ تو دلیل مانگتا ہے۔ اگر یہ نوجوان آکر پوچھتے ہیں تو یہ تو ہے نہیں کہ ماتھے پہ تیوریاں ڈالوں' منہ میں جھاگ آجائے' آنکھیں خشمگیں ہوجائیں اور لاحول ولا پڑھ کر اُن کو دھتکار دوں کہ تم کافر ہوگئے ہو۔ وہ اپنا اطمینان چاہتے ہیں۔ یہ سوال بڑا بنیادی ہے اور ہر ایک کے دل میں اٹھنا چاہیے کہ اِس کا ثبوت کیا ہے کہ یہ قرآن کسی انسان کا کلام نہیں ہے بلکہ خدا کا کلام ہے۔ ہم جو مانتے چلے آرہے ہیں تو کبھی تنہائی میں اپنے

آپ سے پوچھیے گا کہ ہمارے پاس اِس کا کوئی ثبوت ہے کہ یہ واقعی خدا کی کتاب ہے۔ یہ ایمان تو ایک طرف رہا کہ حضورِ نبی اکرم ﷺ کی صداقت پر ہمارا ایمان ہے۔ حضور ﷺ نے یہ کہا کہ یہ میری فکر کی تخلیق نہیں ہے' یہ خدا کی طرف سے Revealed (وحی شدہ) ہے' یہ مجھ پہ وحی ہوئی ہے۔ ہم مانتے ہیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ اس کے لیے برہان لاؤ' دلیل لاؤ' جو تم مانتے ہو۔ سوچیے کہ کیا ہمارے پاس اس کے لیے کوئی دلیل ہے' اس قسم کا کوئی ثبوت ہے؟ کسی دوسرے کو قائل کرنا تو ایک طرف' کیا ہم اپنے آپ کو بھی دلیل و برہان سے اطمینان دلا سکتے ہیں کہ یہ واقعی خدا کی کتاب ہے؟ آپ نے یہ غور فرمایا۔ قرآن نے اس بات کے پرکھنے کا ایک طریقہ بتایا کہ یہ واقعی خدا کی کتاب ہے۔ اور وہ ایک ایسا نرالا سا طریقہ ہے شاید آپ کے ذہن میں پہلے کبھی نہ آیا ہو۔ یوں نظر آتا ہے جیسے وہ مذہب کی دنیا سے ہٹ کر ایک بات کر رہا ہے۔ مجھے افسوس یہ ہے کہ بار بار کہنے کے باوجود قرآنِ کریم کے نسخے آپ لوگوں کے پاس نہیں ہوتے۔

## قرآنِ حکیم کو خدا تعالیٰ کی کتاب ماننے کا طریق

اُس نے کہا ہے کہ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ [1] (41:53)۔ اس بات کے متعلق یقین تک پہنچنے کے لیے کہ قرآن واقعی یہ کہتا ہے کہ میں خدا کا کلام ہوں' خدا کی کتاب ہوں' اس کو ایک حقیقت ثابتہ کی طرح ماننے کے لیے طریقہ کیا ہے؟ اب آپ سنیے کہ وہ طریقہ کیا ہے۔ کہا کہ اے نوعِ انسان! ہم تمہیں اس خارجی کائنات میں اور خود تمہاری اپنی دنیا کے اندر اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے۔ آیت کے معنی ہوتا ہے وہ چیز جس کو دیکھ کر کسی حقیقت کا یقین آ جائے۔ جیسے میں بتایا کرتا ہوں کہ اگر ہم دور سے دھواں دیکھتے ہیں تو اُس سے ہم یہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ نیچے آگ ہوگی۔ صحرا میں کہیں پرندہ اڑتا ہوا نظر آ جائے تو ہم اندازہ لگا لیتے ہیں کہ نیچے کہیں پانی ہوگا۔ کہیں ویرانے میں دُور سے کتا بھونکتا سنائی دے تو نظر آئے گا کہ وہاں کوئی بستی ہوگی۔ یہ جو چیزیں ہیں مثلاً دھوئیں سے آگ کا براہِ راست تعلق نہیں ہے۔ پرندے کا براہِ راست پانی سے تعلق نہیں لیکن یہ اس چیز کی علامتیں بنتی ہیں کہ نیچے یہ کچھ ہے۔ اِسے آیت کہتے ہیں۔ اب آپ نے سوچا کہ قرآن کی آیات کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ خدا کہتا ہے کہ ہم اِس خارجی کائنات میں' Universe (کائنات) کے اندر' خود انسانوں کی اپنی زندگی کے اندر' اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے۔ اور ہر وہ نشانی جو سامنے آئے گی وہ اِس بات کا ثبوت ہوگی کہ قرآن واقعی خدا کی کتاب ہے۔ وہیں کہا ہے کہ ہم نے کیوں اتنا بڑا دعویٰ کر دیا ہے؟

---

[1] (یہ لوگ قرآن کی صداقت سے اس وقت انکار کرتے ہیں تو کرنے دو) ہم ایسے حالات پیدا کرتے چلے جائیں کہ ان لوگوں کو خود اپنی قوم میں اور اپنے گرد و پیش کی اقوام میں (جب یہ نظام مرکز عرب سے نکل کر' اور علاقوں میں پھیل جائے گا) ہمارے قانون کی صداقت کی محسوس نشانیاں نظر آ جائیں گی' حتیٰ کہ یہ حقیقت ان کے سامنے نکھر کر آ جائے گی کہ قرآن نے جو کچھ ان سے کہا تھا' وہ حق پر مبنی تھا' اور ٹھیک اسی طرح واقع ہو کر رہا۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1124)۔

کہا کہ اس لیے کیا ہے کہ اَوَلَمۡ یَکۡفِ بِرَبِّکَ اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ(41:53) یہ جتنی چیزیں ہیں ہم نے کہا ہے کہ یہ مستور حقائق ہیں' اِن پہ پردے پڑے ہوئے ہیں۔ جوں جوں ایک ایک پردہ اٹھتا چلا گیا' اِس کو انگریزی میں Discovery of Science کہتے ہیں' Discover کے معنی ہوتا ہے پردہ اٹھا دینا' حقیقت واضح ہوتی چلی جائے گی کہ قرآن واقعی خدا کی کتاب ہے۔

## قرآنِ حکیم کے بیان کردہ حقائق پر پڑے ہوئے پردے وقت کے ساتھ ساتھ اُٹھتے چلے جائیں گے

قرآن حکیم یہ کہتا ہے کہ یہاں حقائق پر پردے پڑے ہوئے ہیں' جوں جوں علمِ انسانی اوپر اٹھتا چلا جائے گا وہ ایک ایک پردہ اٹھاتا چلا جائے گا۔ ہر پردہ جو اٹھے گا تو اُس کے نیچے سے جو حقیقت نظر آئے گی' وہ اس بات کی دلیل اور ثبوت ہوگی کہ قرآن واقعی خدا کی کتاب ہے۔ یہ ان دونوں میں تعلق کیا ہے' دونوں میں ربط کیا ہے کہ خارجی کائنات کے کسی Truth (سچائی' حقیقت' صداقت) کی Discovery (نقاب کشائی) اس بات کا ثبوت ہو جائے گی کہ یہ واقعی خدا کی کتاب ہے؟ خود تو اُس نے یہ دلیل دی۔ کہنے لگا کہ اس لیے کہ یہ تمہاری نگاہوں سے تو اوجھل ہیں' اِن پہ پردے پڑے ہوئے ہیں اور خدا کی نظروں کے سامنے ہیں۔ تو جس کی نظروں کے سامنے کوئی چیز ہو تو جب وہ اُسے بیان کرے تو وہ تو صحیح صحیح بیان کرے گا۔ تم کہیں بعد میں جا کے اسے Discover (بے نقاب) کرو گے۔ کہنے لگے کہ اُس نے جو بیان کر دیا ہوا ہے اگر اُس کے بعد تم اُس کو Discover (بے نقاب) کر لو' خواہ ہزار سال کے بعد بھی کیوں نہ کر لو' اور وہ بات اُس کے مطابق نکل آئے جو اُس نے بیان کیا تھا تو مانو گے کہ خدا نے دیکھی ہوئی بات کہی تھی۔ مانو گے کہ دیکھنے والے خدا نے قرآن میں یہ بیان کی ہے تو اس سے دلیل بن جائے گی' ثبوت مل جائے گا۔ کہا کہ وہ خدا جس کے سامنے ہر چیز موجود ہے اور وہ ہر جگہ موجود ہے' کیا یہ اُس کے لیے کافی نہیں ہے کہ جو کچھ وہ بیان کرے وہ حقیقت ہو؟ وہ پہلے بیان کر دے اور تمہارے سامنے ابھی Covers (نقابوں) کے اندر ہو' پردوں کے اندر ہو' جب بھی پردہ اٹھے' آپ کو جو نظر آئے اگر وہ اس کے مطابق ہو جو اُس نے ہزار برس' چودہ سو برس پہلے کہہ دیا تھا تو مان جاؤ گے کہ واقعی اُس نے دیکھی ہوئی بات کہی ہے۔ اور یہ اُس نے کہا جو اُس وقت اُسے دیکھتا تھا جبکہ اُس وقت کوئی اور انسان تو دیکھتا نہیں تھا۔ دلیل آپ نے ملاحظہ فرمایا۔

میں نے عرض کیا تھا' عزیزانِ من! کہ آج کا درس کچھ منفرد قسم کا ہے۔ اس وقت جو میرا انداز ہے اس کو درس کہا جاتا ہے' جیسے کلاس روم میں بات سمجھائی جاتی ہے۔ ہے یہ صحیح' دل کو چھوتی ہوئی بات کہ اس نے ٹھیک کہا کہ جو چیز اُس نے اتنا عرصہ پہلے کہی تھی' وہ نہ اُس وقت انسانوں کے علم میں تھی بلکہ اُس کے صدیوں بعد تک بھی نہیں تھی۔ جس وقت بھی کسی ایسی چیز پر سے جو اُس نے پہلے کہی' پردہ اٹھے گا' اگر وہ بعینہٖ اُس کے مطابق نکل آئے تو مان لو گے کہ اُس کا علم ایسا تھا کہ اُس نے دیکھی ہوئی بات کہی تھی اور یہ علم کسی انسان کا تو ہو نہیں

سکتا۔اُس دور میں اُس کے بعد آج تک کسی انسان نے یہ نہیں بتایا تھا۔قرآن طریقہ یہ بتاتا ہے۔اِس طریقے کے مطابق ہم نے اور جب میں کہوں گا ہم نے' تو مراد ہے ہم مسلمانوں نے کیا یہ طریقہ استعمال کیا؟ وہ پہلا دور تو چھوڑ دیتا ہوں' کیا ہم نے ہزار بارہ چودہ سو سال سے اس طریقے سے کہیں یہ ثابت کیا ہے کہ یہ واقعی خدا کی کتاب ہے؟ ہم سارے تو اس کو Faith (عقیدے) کے طریقے پہ ہی' ایمان کے طریقے پہ ہی مانتے چلے آرہے ہیں کہ اللہ کی کتاب ہے اور ایک احترام ہے ہمارے دل میں' کہ چومتے ہیں چاٹتے ہیں اور اوپر رکھ دیتے ہیں۔اس طریق سے جو اُس نے بتایا ہے کیا کبھی اُس کو آزمایا ہے کہ کہہ سکیں کہ ہم اِس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ واقعی یہ خدا کی کتاب ہے؟ اُس نے تو طریقہ یہ بتایا تھا۔لکھنے کے لیے یوں کہیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ کمرے ہال کوٹھیاں کتابوں سے بھر دیں لیکن جو اُس نے طریقہ بتایا ہے اُس کے مطابق بھی کہیں آپ کو کچھ نظر آیا؟

## تمام عقائد اور تمام الجھنوں سے کنارہ کش ہو کر خالی الذہن قرآن کی طرف آنا ہوگا

ذہن میں بات آ گئی جو میں نے عرض کیا ہے۔ہم نے تو یہ نہیں کیا۔آپ کو یاد ہوگا کہ میں اکثر یہ بھی کہتا رہتا ہوں کہ قرآن اُس فرد یا اُس قوم کی سمجھ میں آئے گا جو کسی قسم کے تعصب کے بغیر یا کسی قسم کے پہلے سے اختیار کردہ عقیدے کو چھوڑ کر خالی الذہن ہو کر قرآن کی طرف آئے گا۔قرآن ہو اور علمی تحقیق ہو' اور وہ علمی تحقیق کو مقدم رکھے' اُس کے نتیجے میں جو اُس کے سامنے آئے پھر وہ دیکھے کہ قرآن کیا کہتا ہے۔میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ یہ طریقِ عمل وہ قوم اختیار کر سکے گی' وہ فرد اختیار کر سکے گا' جو قدامت پرستی کی الجھنوں اور جھنجھٹوں سے نکل چکا ہو۔جس قوم میں یہ بات ہو کہ جو آپ نے کہا ہے وہ پوچھے کہ پہلے بھی کسی نے ایسا کہا ہے تو وہ قوم براہِ راست قرآن تک نہیں آسکتی۔جو قوم یہ کہے کہ جو کچھ پہلے کہا جا چکا ہے اُس میں نہ ترمیم ہو سکتی ہے' نہ تنسیخ ہو سکتی ہے' نہ اضافہ ہو سکتا ہے' نہ ردوبدل ہو سکتا ہے' وہی آپ کو ماننا پڑے گا تو وہ قرآن کو نہیں سمجھ سکے گا۔اگر وہ قوم یہ کہتی ہے کہ زمین ساکن ہے اور سورج گردش کرتا ہے اور آپ کے ہاں یہی کہتے چلے آرہے ہیں تو آپ کو یہ ماننا پڑے گا۔اس کے خلاف کہنے سے یہ ہوگا کہ یہ تمام اِس وقت تک کے جو پہلے اسلاف ہیں' یہ ان کی خلاف ورزی ہے اور یہ دین نہیں ہے۔جہاں یہ عقیدہ ہوگا تو قرآن سمجھ میں نہیں آسکے گا۔قرآن ہر دور کی قوم' زمانے' انسان کو تدبر کی دعوت دیتا ہے۔

وہ جو سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا (41:53) ہے تو یہ لفظ جو ''نریھم'' ہے تو اس پہ ذرا غور کیجیے۔یہ ''رأی'' ہے۔یہ رویت ہلال کا تو لفظ آپ نے سنا ہے تو وہیں سے یہ لفظ ہے۔اُس کے معنی ہوتا ہے'' آنکھوں سے دیکھنا۔'' رویت ہلال کے معنی یہ ہوتا ہے کہ ہم آنکھوں سے چاند دیکھتے ہیں۔عربی زبان میں اس لفظ کے معنی آنکھوں سے دیکھنا ہے۔یعنی یہ سنریھم اٰیٰتنا کوئی ذہنی بات نہیں ہے' محض کوئی نظری سی

چیز نہیں ہے۔ سَنُرِيهِمْ (41:53) تم ہماری ان آیات کو نشانیوں کو خارجی کائنات میں اور انسانوں کی دنیا میں آنکھوں سے دیکھو گے۔ ہم ان کو ان کی آنکھوں سے دکھائیں گے۔ آنکھوں سے دیکھ کر اِس نتیجے پر پہنچنا کہ یہ واقعی وہی کچھ ہے جو قرآن نے چودہ سو سال پہلے کہا تھا۔ اِس سے محکم ثبوت کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ ہم نے تو کبھی یہ کیا ہی نہیں ہے۔ اور میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ یہ وہ قوم کر سکے گی جو خالی الذہن ہو کر قرآن کی طرف آئے۔

## میں پچاس سال سے قرآنِ حکیم کو اس انداز سے سمجھ رہا ہوں: پرویزؒ

عزیزانِ من! میں تو قرآن کا ادنیٰ طالب علم ہوں۔ جیسا میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ مجھے قرآنِ کریم پہ اس انداز سے غور کرتے ہوئے پچاس سال ہو گئے۔ وہ جو ابتدائی دور تھا اس میں' میں نے قدامت پرستانہ انداز میں قرآن پڑھا' سیکھا' سمجھا۔ سمجھا تو خیر کیا کہا جائے۔ اگر وہ پہلے بیس پچیس سال کا دور چھوڑ دیا جائے تو میری ساری عمر اِسی میں گزری ہے۔ پچاس سال قریباً اس انداز سے قرآن پر غور کرتے ہوئے مجھے گزرے ہیں۔ اُس کے بعد میں نے یہ چیز کہی کہ قرآن پہ تدبر ہر دور کے انسان کے لیے ہے۔ وہ **یاایھا الناس** کہتا ہے تمام بنی نوع انسان کو مخاطب کرتا ہے۔

## مذہب پرست قوم قرآن کی طرف نہ خود آئے گی' نہ دوسروں کو آنے دے گی

میں نے یہ کہا تھا کہ مجھے نظر آتا ہے کہ جن اقوام اور ممالک میں اسلام بحیثیت مذہب جاگزیں ہو چکا ہے' وہاں بڑی مشکل ہے' وہاں قرآن نہیں آئے گا۔ یہ جو قرآن کے خلاف قوتیں کھڑی ہیں یہ خود ہمارے ہاں کی مذہبیت کی قوتیں ہیں۔ وہ قرآن تک نہیں آنے دیں گی۔ وہ راستے میں دیوار بن کر کھڑی ہو جائیں گی۔ وہ کفر کے فتوے لگا دیں گی۔ اُن کے پروپیگنڈے کا سیلاب اُن کو بہا کر لے جائے گا۔ وہ بات کو آگے ہی نہیں چلنے دیں گے۔ ہماری تاریخ یہ بتا رہی ہے۔ اُن لوگوں کی تاریخ تو انہوں نے رہنے ہی نہیں دی۔ کہیں کہیں یہ اپنی کتابوں میں گالیاں دیتے ہیں۔ جسے گالی دیتے ہیں تو گالی دینے کے لیے کہتے ہیں کہ دیکھیے جی یہ شخص یہ کہتا تھا۔ نظر آ جاتا ہے کہ وہ شخص قرآن کی بات کہتا تھا۔ قتل کر دیا گیا' کتابیں مٹا دی گئیں' نام مٹا دیئے گئے۔ میں یہ بات کہا کرتا ہوں کہ مجھے تو یہ نظر آتا ہے۔ اِس میں کوئی بات نہیں کیونکہ یہ تو نوعِ انسانی کے لیے ہے' کسی خاص قوم کے لیے نہیں ہے۔ قرآن نے یہ خود کہا ہے کہ اگر تم اِس سے اعراض برتو گے تو تمہاری جگہ دوسری قوم آ جائے گی جو اِس کو حقیقت کی طرح اپنے سینے سے لگا لے گی اور پھر وہ تمہاری مثل نہیں ہو گی۔

## قرآن نے اس دور کے تمام علوم کا احاطہ کر رکھا ہے

قوم کا تو میں کہہ نہیں سکتا' پچھلے ہی ہفتے سے میرے سامنے ایک ایسی کتاب آئی ہے جسے یوں کہیے کہ میں عمر بھر تلاش کرتا رہا کہ اِس

انداز سے قرآن کا سمجھنے والا کوئی سامنے آجائے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ جس انداز سے میں نے سمجھا ہے' قرآن کو اسی انداز سے سمجھو' بلکہ یہ تو قرآن خود کہہ رہا ہے کہ مجھے اس انداز سے سمجھیے۔ قرآن کریم میں واضح نصیحت ہی نہیں ہے' صرف اخلاقیات ہی نہیں ہیں' اُس کی بنیادی تعلیم تو انسان کی راہنمائی ہے' انسانیت سازی ہے' سیرت گری ہے لیکن اس بنیادی مقصد کے لیے وہ جو اضافی علوم ساتھ لاتا ہے' وہ آج دنیا میں جتنے علوم ہیں قریباً ہر ایک کو وہ گھیرے ہوئے ہے۔ علم الانسان' علم اللسان' علم الافلاک' سوشیالوجی' بائیالوجی' زوآلوجی' یعنی یہ تمام علوم جتنے بھی ہیں قرآنِ کریم میں اُن کے متعلق کہیں نہ کہیں آیا ہے۔ یہ مقصود بالذات نہیں ہے۔ مقصود تو وہی انسانیت کی سیرت سازی ہے۔ اُس کے لیے تائیداً یہ چیزیں آئی ہیں لیکن آئیں تو قرآن میں ہی ہیں۔ یہ وہ Subjects (مضامین) ہیں' یہ وہ موضوعات ہیں' جن کے لیے Specialist (ماہر خاص) کی ضرورت ہے۔ یہ جو وہ کہتا ہے کہ تم Discover (بے نقاب) کرو گے' تو یہ جتنے حصے سائنس کے علوم کے ہیں اِن کو تو سائنٹسٹ ہی Discover (بے نقاب) کرے گا۔ میں نے اِن علوم کے متعلق مطالعہ کیا لیکن بہرحال وہ تو ایک مبتدی کا مطالعہ ہی آپ کہہ سکتے ہیں۔ قرآنی حقائق کو پوری طرح Discover (بے نقاب) وہی لوگ کریں گے جو دورِ حاضر کے علوم کے ماہر ہوں گے۔ اتنے سارے علوم میں Specialization (مہارتِ خصوصی) کرنا کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں ہے۔ اور دیکھا یہ ہے جو قرآن کہتا ہے کہ جو دورِ حاضر کے ان تمام علوم کو Discover (بے نقاب) کریں گا وہ سپیشلسٹ ہیں۔ یہ انہی کا کام ہے۔

## مورس ڈاکٹر بوکائے کی کتاب[1] The Bible, The Qur'an And Science کے چند حوالہ جات

میں نے عرض کیا ہے کہ اس ایک کتاب کا چرچا قریباً تین چار ہفتے پہلے میں نے سنا تھا۔ میرے جی کو لگ گئی کہ ہوسکتا ہے کہ یہ کام کی بات ہو۔ ابھی وہ پاکستان میں نہیں پہنچی' بہرحال میں نے کوشش کی اور میرے دوستوں نے انگلستان سے براہِ راست ایک شخص کے ہاتھ مجھے بھیج دی۔ وہ کتاب میرے سامنے ہے۔ اس کتاب کا نام ہے: The Bible, The Qur'an & Science۔ (بائبل' قرآن اور سائنس)۔ لکھنے والا ایک فرینچ یعنی فرانسیسی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میں اُس کے نام کا صحیح تلفظ نہ بولوں کیونکہ فرینچ کا تلفظ بھی ہمارے ہاں مشکل ہوتا ہے۔ اُس کا نام Maurice Bucaille (1911-1989) (مورس بوکائے) ہے۔ یہ بڑے پائے کا Scientist (سائنسدان) ہے اور Medicine کا ڈاکٹر ہے' سرجن ہے۔ عیسائی تھا' اب بھی وہ عیسائی ہوگا۔ اُس نے لکھا یہ ہے کہ

---

[1] پاکستان میں چھپنے والی اس کتاب کا حوالہ یہ ہے:

Bucaille, Maurice (1998). The Bible, The Qur'an and Science (2nd Edition) Lahore:Islamic Book Service.

میں نے بائبل کو ایک سائنٹسٹ کے نقطہ نگاہ سے پڑھا تو مجھے نظر آیا کہ وہ خدا کا کلام تو ایک طرف' وہ تو کسی سمجھدار انسان کا کلام بھی نظر نہیں آتا۔ تو اُسے میں خدا کا کلام مان کر اس پر ایمان کیسے لے آؤں۔ کہا کہ پیدائشی عیسائی ہونے کی جہت سے تو اور بات تھی' اب میری مشکل یہ ہوگئی کہ میں نے جب سائنٹسٹ کی حیثیت سے یہی جو حصہ بائبل میں سائنس سے متعلق ہے' کا مطالعہ کیا' تجزیہ کیا' تو میں نے یہ دیکھا کہ وہ کسی صاحبِ علم انسان کا کلام بھی نظر نہیں آتا۔ اسے میں خدا کا کلام کیسے مان لوں! ذہن میں یہ چیز آئی کہ یہ جو مذاہب کے اندر بات ہے کہ خدا کی کتاب ہے' خدا کا کلام ہے' یہ اصل میں یونہی افسانہ ہی ہے اور وہ آنکھیں بند کر کے کہہ رہا ہے اور ہم مانتے چلے آتے ہیں۔ اب میرے ذہن میں یہ آیا کہ یہ عیسائی اور یہودیت مذاہب ہیں ان کے ساتھ یہ اسلام بھی مسلمانوں کا مذہب ہے' یونہی اسے دیکھو تو سہی۔ اُس نے لکھا ہے کہ میں اسلام کو نہیں مانتا تھا۔ محض اس بنا پر کہ ایک اور بھی کتاب ہے' ایک اور بھی مذہب ہے' ذرا اُس کو بھی دیکھوں۔ کہتا ہے میں نے یونہی چھلکتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا تو اُس میں مجھے کچھ چمک نظر آئی کہ یہ تو کچھ پتے کی باتیں ہیں۔

## عربی زبان کے حوالے سے ڈاکٹر مورس بوکائے کی شاہ فیصل سے ملاقات

عزیزانِ من! آپ ہمارے اور مغرب کے محققین کا انداز دیکھیے۔ اس نے مختلف Translations (تراجم) دیکھے' اُن میں اختلاف بھی پایا اور ایسی باتیں بھی دیکھیں جو ایسی ہی تھیں جیسی بائبل میں مجھے ملتی تھیں۔ دل میں آیا کہ یہ دو قسم کا اختلاف کیوں ہے۔ کہیں چمک ہے تو بالکل آسمان کی بجلیوں جیسی نظر آتی ہے۔ اُس کے بعد پستی نظر آتی ہے تو انسانی فکر سے بھی نیچے چلی جاتی ہے۔ تو اگر یہ (معاذ اللہ) کسی سمجھدار انسان کا بھی کلام ہے جو اِس قسم کی بلند چیزیں کہتا ہے تو وہ ساتھ ہی پست تو نہیں کہہ سکتا۔ میں نے کہا کہ میں ترجموں پر انحصار کر رہا ہوں۔ ایک محقق کے تو یہ شایانِ شان نہیں ہے کہ کسی کتاب کے متعلق وہ کچھ سوچنا سمجھنا تجزیہ کرنا چاہے اور اپنا انحصار ترجموں پہ رکھے جو دوسرے انسانوں کے ذہن کی پیدا کردہ چیز ہے۔ یہ غلط ہے۔ تحقیق کرنی ہے تو قرآن سمجھنے کے لیے عربی سیکھنی ضروری ہے۔ اور پھر عربی سیکھی تو اس انداز کی کہ خود عرب میں جا کر رہا۔ نظر آتا ہے کہ اُس کا Status (عہدہ و مقام) بڑا بلند ہے کیونکہ اس نے کہا کہ پھر میں نے سمجھا کہ یہ جو بات ہے کہ میرے دل میں جو باتیں پیدا ہو رہی تھیں' وہ وہاں کے عام مولویوں اور عالموں سے کیا پوچھتا۔ شاہ فیصل [1] زندہ تھے۔ میں نے کہا کہ براہِ راست اُن سے کیوں نہ بات کر کے دیکھوں۔ اِس کے اوپر شاہ فیصل (1905-1975ء) سے گفتگوئیں رہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں تحقیق کرنے والوں کی کیفیت!

---

[1] شاہ فیصل ابن عبدالعزیز السعود (1905-1975)

## ہمارے اور مورس بوکائے کے مابین قرآن پڑھنے میں فرق

ہمارے ہاں کروڑ در کروڑ انسان مسلمان' نہایت عزت واحترام سے ساری عمر قرآنِ کریم ناظرہ ہی پڑھتے رہتے ہیں' اسے آپ کے ہاں رمضان شریف میں دہرایا جاتا ہے۔ ایک ایک رات میں بھی دہرایا جاتا ہے۔ نہ وہ آگے کھڑا ہوا قاری' نہ وہ حافظ سمجھتا ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور نہ پیچھے کھڑے ہوئے سینکڑوں کی تعداد میں وہ مقتدی سمجھتے ہیں کہ ہم کیا سن رہے ہیں۔ بس صرف ثواب ہی اِن کو حاصل ہوتا ہے۔ ہم میں جو بہت زیادہ ''جینوں کیندے نیں کہ جھنگ ماردا [1] اے'' تو وہ ترجمہ پڑھ لیتا ہے۔ یہ ہم ہیں جو اِس پہ ایمان رکھتے ہیں اور اُدھر وہ ہے جو صرف تحقیق چاہتا ہے۔ وہ صرف ناظرہ بھی نہیں پڑھتا' وہ ترجموں پہ بھی انحصار نہیں کرتا۔ وہ زبان سیکھتا ہے اور اس پائے کی سیکھتا ہے: عربوں میں جا کر سیکھتا ہے' وہ شاہ فیصل (1905-1975) سے باتیں کرتا ہے کیوں کہ میں نے جو عربی کا قرآن ہے اُسے سمجھنا ہے۔ اس کے بعد اُس نے کہا کہ اب یہ بات ہوئی کہ یہ جو کتاب میرے سامنے ہے اس کے متعلق بھی تو یقین ہونا چاہیے کہ جو محمد ﷺ نے دی تھی یہ وہی کتاب ہے' کچھ راستے میں اور لوگوں نے تو اس میں نہیں ملا دیا ہوا۔ اور یہ خدا کی کتاب ہے تو میں تحقیق کر کے ہی مانوں گا۔

## قرآنِ حکیم کے سلسلہ میں مسلمانوں کے متعلق اس فرانسیسی کا تصور

عزیزانِ من! تحقیق کا انداز دیکھیے کیا ہے! کیا چیزیں آ رہی ہیں! کوئی اُس کو یہ کہہ نہیں رہا کہ یہ بھی کرو' وہ بھی کرو۔ اُس نے تحقیق کر کے اُس کتاب کا پورا ایک Chapter (باب) اس کے لیے Devote (وقف) کیا ہے کہ پھر میں خود اپنی ذاتی تحقیق سے اِس نتیجے پہ پہنچا کہ یہ جو ہمارے ہاں کتاب ہے یہ لفظاً لفظاً وہی ہے جو محمد ﷺ نے دی تھی۔ وہ کہنے لگا ہے کہ یہ بات پکی ہوگئی۔ وہ مسلمانوں سے کہتا ہے کہ تم لوگوں کو ایک فریب دیا گیا ہے اور تم اُس فریب میں آ گئے ہو۔ یہ جو West (مغرب) والے ہیں' یہ اسلام کے بڑے دشمن ہیں۔ ہمارے ہاں کے Orientalists یعنی مستشرقین نے ایک سازش کی۔ اور اسلام کو اُنہوں نے Mohammedanism (محمڈن ازم) کہا اور مسلمانوں کو Mohammedans (محمڈنز) کہا۔ یعنی اُن کے دین کی نسبت محمد ﷺ سے ملا دی۔ وہ خود جو Christians (عیسائی) تھے ان کی Christ (حضرت عیسیٰؑ) کے ساتھ نسبت تھی۔ ان مستشرقین نے کہا کہ ان کی خدا کی طرف نسبت کاٹ دو' ان کی نسبت ہی محمد ﷺ کی طرف رکھو۔ زیادہ سے زیادہ ذہن یہیں تک پہنچے گا کہ وہ جو ایک پیغمبر یا عرب میں شخص تھا' اُس نے یوں کیا تھا اور یہ لوگ اُس کے Followers (پیروکار) ہیں۔ پھر خدا تو بیچ سے کٹ جائے گا۔ عزیزانِ من! سوچیے کہ یہ شخص مورس بوکائے (1911-1989) کیا کیا کچھ کہہ رہا ہے۔ اور وہ ہمیں کہہ رہا ہے کہ تم اِس جُل میں آ گئے اور تم نے بھی محمڈن اور محمڈن ازم کہنا شروع

---

[1] جسے کہتے ہیں کہ وہ خوب زور لگاتا ہے۔

کر دیا۔ پچھلے دور کی جو ہماری جتنی کتابیں ہیں ان میں مسلمانوں کو محمڈن ہی لکھتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ اِس سے آپ لوگوں کو نکلنا چاہیے۔

اب ضمناً ایک بات آ گئی۔ یہاں پاکستان میں نظامِ مصطفیٰ کی اصطلاح رائج ہوئی ہے۔ میں یہ عرض کر دوں کہ حضورِ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کے ساتھ کس مسلمان کو احترام وعقیدت نہیں۔ سب کو ہے ہمارا تو ایمان یہ ہے کہ بعد از خدا بزرگ توُ ای قصہ مختصر لیکن خدا خدا ہے اور اُس کا رسول اُس کا رسول ہے۔ دونوں کے اپنے مقام ہیں۔ دین خدا کا دیا ہوا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی معرفت انسانوں کو ملا ہے۔ دین رسول اللہ ﷺ کا اپنا وضع کردہ نہیں ہے۔ یہ دینِ محمدیؐ نہیں ہے' یہ دین اللہ ہے۔ قرآن نے خود کہا ہے کہ یہ دین اللہ ہے اور یہ کہ کسی رسول کا دین نہیں ہوتا' رسول صرف دین لاتا ہے۔ خدا رسول کی وساطت سے اپنا دین انسانوں کو دیتا ہے۔ اسے دین اللہ ہی کہو۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ یہ جو ہم دین کا ترجمہ نظام کرتے ہیں ہمیں اسے دینِ خداوندی ہی کہنا چاہیے۔ اس مورس بوکائے (1911-1989) کو یہ Strike ہو رہا ہے کہ یہ دین محمڈن نہیں ہے۔ یعنی ہر چیز پہ وہ خود ذاتی تحقیق کر رہا ہے۔ تحقیق کے بعد اِس نتیجے پہ پہنچا ہے کہ واقعی یہ کتاب لفظاً لفظاً وہی ہے۔ اب اُس کے بعد اُس نے کہا ہے کہ پھر اِس کے سمجھنے کا طریقہ کیا ہے؟

## قرآن فہمی کے سلسلہ میں علامہ اقبالؒ کی طرف سے علامہ پرویزؒ کی رہنمائی

عزیزانِ من! میں کوئی بطور افتخار اپنے متعلق عرض نہیں کرتا' بطورِ تحدیثِ نعمت عرض کرتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہ یہ بات پچاس سال یا چالیس سال پہلے میری سمجھ میں آئی اور جیسا میں نے کئی دفعہ یہ کہا ہے کہ یہ فیضانِ اقبالؒ تھا کہ اس نے کہا تھا کہ قرآن سمجھنے کے لیے محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات سے کام لو۔ یعنی یہ دیکھو کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں' اُس زمانے کے عرب' قرآن کے اِس لفظ کا کیا مفہوم لیتے تھے کیوں کہ یہ اُن کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ پہلے مخاطب تو وہی تھے۔ اُن کے سامنے قرآن پیش کیا تو کسی نے نہ کوئی اعتراض کیا' نہ کوئی وضاحت چاہی۔ قرآن پیش ہوا اور وہ سمجھتے گئے۔ پہلی چیز قرآن نے یہ کہی ہے کہ یہ عربی مبین کی کتاب ہے تو اسے اُس زبان کی رو سے سمجھو۔ پہلی چیز یہ ہے۔ عزیزانِ من! میں نے جو لغت مرتب کیا ہے وہ اسی بنیاد پہ کیا ہے کہ ان الفاظِ قرآنی کے معانی اُس زمانے میں کیا تھے۔ اُس شخص ❶ کو میرا علم بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ تو اردو بھی نہیں جانتا ہوگا' میرا نام بھی نہیں سنا ہوگا۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ اگر کوئی شخص Independently یعنی آزاد نہ' خالی الذہن ہو کر قرآن کی طرف آئے تو کس طرح سے وہ دونوں چیزیں ملتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔

---

❶ یہ اشارہ ڈاکٹر مورس بوکائے (1911-1989) کی طرف ہے۔

## قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے مورس بوکائے نے چند ایک اصولوں کو ضروری جانا

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے لیے مورس بوکائے (1989-1911) یہ کہتا ہے کہ پہلی چیز محاورۂ عرب ہے کہ عرب اس لفظ کے کیا معنی لیتے تھے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ قرآن میں ایک موضوع پہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک جگہ نہیں کہا گیا' مختلف مقامات پر بکھرا ہوا ہے' وہ سارے مقامات سامنے آنے چاہئیں۔ یہ وہی چیز ہے جو میں نے اپنی کتاب ''تبویب القرآن'' میں آپ کو دی ہے۔ اور تیسری چیز وہ اور کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ عربی زبان ہے۔ اس کا ایک ایک مادہ بڑے وسیع معانی رکھتا ہے۔ اُن لوگوں نے تو اپنے ہاں پتہ نہیں کس طرح اِس سے فائدہ اٹھایا لیکن وہ کہتا ہے کہ قرآن کے سمجھنے کے لیے خود قرآن نے یہ انداز اختیار کیا ہے۔ اور یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی کا تعلق مختلف گوشوں سے ہے۔ کہیں اکنامکس سے ہے' کہیں اقتصادیات سے' کہیں معاشرت سے' کہیں سیاست سے' کہیں علومِ سائنس سے' کہیں تاریخ سے۔ ان علوم پر عبور حاصل کرنا فہم قرآن کے لیے ضروری ہے۔

اُس نے کہا کہ قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ ایک ہی مادہ (Root) کے بنے ہوئے الفاظ جو وہ اِن مختلف علوم کے اندر لاتا ہے' اُس Particular (خاص) علم کی جو اصطلاحات ہیں' اُسی Root (مادہ) سے' اُس اصطلاح میں بھی' معنی آپ کو مل جاتے ہیں۔ اور اُس نے کہا ہے کہ یہ بات بڑی غلط ہوگی کہ ہم ایک علم کے دائرے کے اندر کسی ایک لفظ کا جو اپنے ہاں مفہوم یا ترجمہ لیں' وہ جتنے علوم ہیں اُس میں وہی مفہوم اور ترجمہ لیتے چلے جائیں تو وہ غلط ہو جائے گا۔ بات بڑی آسان ہے۔ عام انگریزی کے الفاظ کو آپ دیکھیے کہ وہی لفظ اکنامکس میں کچھ اور معنی دیتا ہے' تاریخ میں کچھ اور معانی دیتا ہے' معاشرت میں کچھ اور معانی دیتا ہے حالانکہ وہ ایک ہی اصطلاح ہوتی ہے۔ مثلاً آپ Account کو دیکھ لیجیے کہ Accountability کیا ہوتی ہے' بینک والا اکاؤنٹ کیا ہوتا ہے' Account for کیا ہوتا ہے۔ یعنی میں ایک ایک لفظ کو لاتا ہوں۔ یوں یہ بات ہماری سمجھ میں آتی ہے۔ یہ بات اُس مورس بوکائے (1989-1911) نے سمجھائی ہے کہ قرآن کے ان مفردات کے یہ معانی ایک علم کے ضمن میں آپ لیں تو ہر جگہ انہی الفاظ کے وہی معنی نہ لیتے چلے جائیں۔ اس علم میں اُس کے لیے اُس علم کی ایک اصطلاح ہوگی۔ اور اُس کے بعد یہ محقق کہتا ہے کہ شرط یہ ہے کہ وہ جو اس لفظ کے Root (مادہ) کے معنی ہیں آپ اُس سے الگ نہ ہٹیں۔ یہ اگر آپ نے کر دیا تو یہ تحریف ہو جائے گی۔ اس کے مطابق رہیں گے تو یہ قرآن کے مطابق ہوگا۔

## مورس بوکائے کے نزدیک سابقہ دور میں کیے گئے تراجم وتفاسیر موجودہ دور کا ساتھ نہیں دے سکتے

اس کا کہنا یہ بھی ہے کہ یہ جو اِس سے پہلے تراجم یا تفاسیر ہوئی ہیں' وہ آج کام نہیں دیتیں۔ وہ کہتا ہے کہ میں اُن کی تنسیخ نہیں کرتا' میں اُن پہ تنقید نہیں کرتا' یہ ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔ اُس زمانے میں علم انسانی اتنا بلند ہوا ہی نہیں تھا۔ یہ اُن کی اپنی ذہنی سطح تھی' وہ اپنی اس سطح

کے مطابق ہی کچھ بیان کر سکتے تھے۔ اِس میں اُن کا نقص نہیں بلکہ علم انسانی کی جو سطح کم تھی یہ اُس کی وجہ سے تھا لیکن اب یہ تو ضرور ہے کہ علمِ انسانی کی سطح تو اتنی آگے چلی گئی اور ہم اُسی کے پابند رہیں جو اُس علمی سطح کے اوپر اُن لوگوں نے کہا تھا۔ اُس نے کہا کہ غلطی یہ ہے

## نظریات کی دنیا میں ردوبدل انسانی عقل کا خاصہ ہے

اُس کے بعد وہ اس کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ جو کچھ میں آج کہونگا وہ نظریات ہونگے' مسلمات A priori نہیں۔ اس سلسلے میں اُس نے دو چیزیں کہی ہیں۔ سائنس میں ایک تو Theories (نظریات) ہوتی ہیں' نظریہ ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو نظریہ ہوتا ہے وہ ابھی Proved (ثابت شدہ) نہیں ہوتا۔ یعنی پایہ ثبوت تک نہیں پہنچا ہوتا۔ وہ نظریہ ایک وقت میں جا کر یا مسترد ہو جاتا ہے یا پایہ ثبوت تک پہنچ جاتا ہے۔ مورس بوکائے (1911-1989) کہنے لگا کہ میں یہ بھی نہیں کرونگا کہ جو چیزیں ابھی نظریات کی دنیا میں جا رہی ہیں' اُن کو میں مسلمات A priori کہوں اور ان کے مطابق قرآن کی آیات کو لوں۔ بالکل نہیں۔ اُن کے متعلق میں یہی کہوں گا کہ یہ ابھی تک نظریہ (Theory) ہے۔ قرآن اِس کے متعلق اِس نظریئے سے آگے جاتا ہے۔ میں ابھی اسے Touch (بیان) نہیں کرتا' میں وہ چیزیں لونگا جو اِس وقت تک ہمارے ہاں سائنٹفک علوم میں Prove (ثابت) ہو چکی ہیں' کلیہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں' وہ لونگا اور اُس کے مطابق میں قرآن کی آیات لونگا۔

## قرآن حکیم کے تراجم اور تفاسیر غلط کیوں ہوتے ہیں؟

یہ کہتے ہوئے کہ ان تراجم میں اور ان تفاسیر میں یہ غلطیاں کیوں ہوئی ہیں' وہ کہتا ہے کہ

> Why do such errors in translation exist? They may be explained by the facts that modern translators offen take up, rather uncritically, the interpretations given by older commentators. ❶

اس لیے کہ آج کے دور کے جو ترجمہ کرنے والے یا تفسیریں کرنے والے ہیں' وہ انہی سے بندھے ہوئے چلے آ رہے ہیں جو پہلے دور کے کرنے والوں نے کیا تھا۔

> In their day,the latter had an excuse for having given an inappropriate definition of an Arabic word containing several possible meanings; ❶

اُس دور میں جب ابھی علمِ انسانی اتنا نہیں تھا اُن کے پاس یہ معقول عذر تھا کہ وہ اتنا ہی سمجھ سکے' اس سے زیادہ نہیں سمجھ سکے۔

---

❶ The Bible, The Qur'an And Science. P-118-119 (یہ تمام حوالہ جات ''لاہور: اسلامک بک سروس'' میں طبع ہونے والے نسخہ کے ہیں۔ اس کا ذکر ص۔ 138 کے فٹ نوٹ 1 میں کیا گیا ہے)۔

they could not possibly have understood the real sense of the word or phrase which has only become clear in the present day thanks to scientific Knowledge. ❶

اُس زمانے میں وہ واضح نہیں ہوسکتا تھا۔آج وہ بے نقاب ہوکر سامنے آ گیا ہے۔علومِ سائنس کے انکشافات کا شکریہ کہ اُس نے ہمیں قرآن سمجھنے کی توفیق عطا کر دی ہے۔یہ کچھ ایک غیر مسلم محقق کہہ رہا ہے۔

## آج علوم سائنس نے کئی ایک قرآنی نظریات کو Prove (ثابت) کر دیا ہے

اب اِس نے جتنے علوم سے بحث کی ہے وہ اُن کے ساتھ اس طریق سے ہے جس پہ وہ خود قرآن کو سمجھنے کے لیے پہنچا' اس کے لیے وہ قرآن کی آیات کو لایا ہے۔وہ آیات اگر ساری کی ساری ہوں تو اُس کے لیے تو معلوم نہیں مجھے کتنے درس چاہئیں۔میں پھر اپنی زندگی کی آخری آرزو دہرادوں' دہراتا ہی چلا جاؤنگا کہ کاش! کوئی کلاس ہوتی' نصاب ہوتا' Post Graduate طالبعلم ہوتے' مختلف علوم میں ایم اے کیے ہوئے ہوتے' تو وہ بات تھی کہ اُن کے ایک ایک علم کے مطابق یہ جو چیزیں تھیں' میں اُنہیں یوں پڑھاتا۔اپنی عمر بھر کی قرآن کے اوپر نگاہ کو ان لوگوں کی اس تحقیق کو یعنی ان دونوں کو ملا کر اُن کے سامنے پیش کرتا تو پھر اُنہیں پتہ چلتا کہ قرآن کیا کہتا ہے۔

## قرآنِ حکیم کی روشنی میں چودہ سو سال پیشتر کائناتی کرّوں کے متعلق بیان کردہ حقائق

ابھی میں یہ عرض کرونگا کہ مورس بوکائے (1989-1911) قرآن کے متعلق کہتا کیا ہے۔میں صرف دو تین مثالیں پیش کرونگا کیوں کہ ہمارے پاس وقت تو بہت تھوڑا ہوتا ہے۔قرآنِ کریم میں فلکیات کے متعلق ہے کہ **وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ** (21:33) اللہ وہ ہے جس نے رات اور دن' چاند اور سورج اور باقی سب کو تخلیق کیا۔مولانا محمود الحسن شیخ الہند ❷ مرحوم (1997ء)۔؟ ترجمہ ❸ کرتے ہیں' مولانا ❷ شبیر احمد عثمانی مرحوم (1949-1887ء) اس کی تائید ❹ فرماتے ہیں اور مولانا شاہ عبدالقادر علیہ الرحمتہ کا ترجمہ ❺ ساتھ ہے۔ہمارے ہاں کے یہی بلند تریں چوٹی کے لوگ ہیں۔وہ

---

❶ The Bible, The Qur'an And Science. P. 118-119

❷ سلیچ' محمد منیر احمد ڈاکٹر: وفیاتِ نامورانِ پاکستان' اردو سائنس بورڈ' لاہور' 2006' ص ص۔809 اور 389۔

❸ ترجمہ اردو از مولانا محمود حسن شیخ الہند' سنِ تحریر 1343ھ۔

❹ تفسیر عثمانی از مولانا شبیر احمد عثمانی۔سنِ تکمیل 1350ھ۔

❺ ترجمہ اردو مع تفسیر از شاہ عبدالقادر محدث دہلوی۔سن تکمیل 1205ھ۔

تمام كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ(21:33) کا ترجمہ کرتے ہیں کہ ''یہ سب اپنے اپنے گھر میں پھر رہے ہیں''۔ یہ اُن کا ترجمہ ہے۔ اب مورس بوکائے اس آیت کے تین لفظ لیتا ہے۔ جس چیز کو آج Orbit کہتے ہیں یعنی مدار کہتے ہیں یعنی وہ سیکٹر جس کے اندر ایک کرّہ پھر رہا ہے' اُس نے متعین کیا ہے کہ ''فلک'' کا یہ لفظ Orbit (مدار) کے معنی میں آتا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ شمس اور قمر اور مختلف Planets (سیّارے) جو بنائے ہیں' اُن میں سے ہر ایک اپنے اپنے Orbit (مدار) کے اندر گردش کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کئی ایک ایسے ہیں جنہوں نے اس کا ترجمہ سویر کیا ہے۔ اِس کا ترجمہ سویر نہیں ہے۔ اِس کا ترجمہ وہ راستہ ہے' وہ Orbit (مدار) ہے جس کے اندر وہ کرہ پھر رہا ہے۔ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ(21:33) قرآن چودہ سو سال پہلے کہتا ہے جب ابھی کرّوں کا تصور بھی نہیں تھا۔ کم از کم زمین تو ساکن ہی مانی جاتی تھی۔ وہ کہہ رہا ہے کہ ''ان میں سے ہر کرّہ اپنے اپنے Orbit (مدار) کے اندر گردش کر رہا ہے''۔ انہوں نے اِس لفظ ''یسبحون'' کا ترجمہ ''پھر رہے ہیں'' کیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب میں نے قرآن سے تسبیح کا لفظ سمجھایا تھا تو کہا تھا کہ اس کے بنیادی معنی اس کے مادہ (Root) ''س ب ح'' میں ہیں۔ انہی حروف (س ب ح) سے لفظ سبح نکلا ہے' انہی سے یسبحون کا لفظ یہاں آیا ہے۔ اِس کے معنی ہیں ''پورا ہاتھ مار کر تیرنا' گھوڑے کا اپنی ٹانگیں پوری طرح پھیلا کر دوڑنا' اس تیزی سے تیرنا' اس طرح سے دوڑنا''۔ مورس بوکائے (1911-1989) بھی یہ چیز کہتا ہے۔ آپ دیکھیے کہ ایک سائنٹسٹ کہاں پہنچتا ہے۔ اس مادے یا Root کو لے کر وہ کہتا ہے کہ

> All the senses of the verb imply a movement that is associated with a motion that comes from the body in question. If the movement takes place in water, it is 'to swim'; it is 'to move by the action of one's legs' if it takes place on land. (P.161) ❶

عرب تو تیرنے میں' دوڑنے میں یہ لفظ استعمال کرتے تھے۔ اس نے کہا کہ اس کے بنیادی معنی یہ ہیں۔

عزیزانِ من! سنیے اسے سائنٹفک ریسرچ کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ کسی شے کے متحرک ہونے کے لیے' Move (حرکت میں) ہونے کے لیے' تو باہر سے کوئی چیز چاہیے جو اُس کو Move (چلائے) کرے' جیسے ہمارے ہاں انجن پٹہ (Belt) کو Move (چلاتا) کرتا ہے یا ہم ہاتھوں سے اسے Move (چلاتے) کرتے ہیں۔ یہ تو ہوتی ہے یہ چیز۔ اس نے یہ چیز کہی کہ ایک چیز متحرک ہو اور وہ اپنے اندر کی طاقت سے متحرک ہو تو سبح کا لفظ اُس کے لیے آتا ہے۔ پانی میں تیرنا ہے تو کوئی اُس کو دھکا نہیں دے رہا ہوتا' وہ اپنے اندر کی قوت سے تیر رہا ہوتا ہے۔ گھوڑا دوڑ رہا ہوتا ہے تو کوئی اُس کو پیچھے سے یا آگے سے پکڑ کر کھینچ نہیں رہا ہوتا بلکہ وہ اپنی اندرونی قوت سے دوڑ رہا ہوتا ہے۔ مورس بوکائے (1911-1989) کہنے لگا کہ اُس لفظ کی بنیاد میں یہ چیز ہے کہ حرکت ہو اور ایسی حرکت ہو جو اُس شے کے اندر کی قوت کی وجہ سے پیدا ہو' خارج سے نہ ہو۔ کہا کہ کرّوں کے متعلق یہ کہنا کہ یہ جو متحرک ہیں' دوڑ رہے ہیں' اُن کو خارج کی کوئی قوت نہیں

---

❶ The Bible, The Qur'an and Science, P-161

دھکیل رہی' بلکہ اُن کے اندر یہ قوت پنہاں ہے جس کے زور پہ یہ چل رہے ہیں۔ اُس کے بعد کہتا ہے کہ او بتاؤ' دنیا کے دانشورو! چودہ سو سال پیشتر کون اس لفظ کو اس طرح استعمال کرسکتا ہے! کیا کسی انسان کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے؟ کہتا ہے کہ اگر یہ خدا نہیں تھا تو کون تھا؟ آپ غور فرما رہے ہیں کہ قرآن کے الفاظ سے یہ سائنسدان کہاں پہنچ رہے ہیں۔ معاف رکھیے گا میں بھی عرض کردوں' میرا تو کوئی Special Subject نہیں ہے۔ میں نے اپنے ہاں لغت میں 'تیرنا' گھوڑے کا دوڑنا' کسی کام یا پروگرام کی تکمیل کے لیے پوری پوری کوششیں کرنا' یہ سب سبح کا ترجمہ لکھا ہے۔ یہ بات کوئی سائنٹسٹ ہی لکھ سکتا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ یہ چیز ابھی کل تک کسی کے ذہن میں نہیں آئی تھی کہ اِن کی جو Movement (حرکت) ہے یہ اِن کا زورِ دروں ہے' اُن کے اندر کی ایک قوت ہے جو اُن کو اِس طرح سے مصروفِ حرکت رکھ رہی ہے۔ عربوں کے ہاں کی زبان عجیب وغریب تھی۔ اُن کے ہاں جو چیز از خود اپنی قوت سے چلے' اُس کے لیے الگ لفظ ہے۔ اور اگر کوئی دوسرا اسے متحرک کرے تو اُس کے لیے اُن کے ہاں الگ لفظ تھا۔ یہ لفظ اُسی زبان کی خصوصیت تھی۔ اور وہ کہتا ہے کہ وہ جو انتخاب تھا پھر قرآن کے اندر یہ وہی کرسکتا تھا جسے چودہ سو سال پیشتر پتہ ہوتا کہ ہر کرۂ اپنے Orbit (مدار) میں چل رہا ہے اور اپنے اندر کی قوت سے جا رہا ہے۔ خارج کی قوت اُس کو نہیں چلا رہی۔ کہتا ہے کہ کہو تو سہی کہ خدا کے سوا کوئی اور یہ کہہ سکتا تھا؟ اُس کے اپنے الفاظ سن لیجیے:

> It appears therefore that a verbal nuance in the Qur'an refers to the Sun & Moon's own motion. These motions of the two celestial bodies are confirmed by the data of modern science. (P.162)

وہ کہتا ہے کہ اِسی دورِ حاضر کی سائنس نے یہ بات بتائی ہے کہ اُن کی یہ Movement (حرکت) ان کے اندرونی زور سے ہوتی ہے۔ اور اُس کے بعد ہے کہ

> It is inconceiveable that a man living in the Seventh century A.D. however knowledgeable he might have been in his day, could have imagined them. [1]

چودہ سو سال پیشتر ساتویں صدی عیسوی کے اندر ایک شخص کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہوتا' وہ اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ

---

[1] The Bible, the Qur'an And Science, P.162

محمد ﷺ کے معاملے میں تو یہ بات بھی نہیں تھی وہ تو اَن پڑھ تھا۔ ساتویں صدیں عیسوی میں عرب جیسے ملک میں ایک اَن پڑھ شخص تھا۔ وہ کہتا ہے کہ کیا کوئی ذہن میں لاسکتا تھا کہ وہ یہ بات کرے گا۔

عزیزانِ من! ایک مثال اور ہے اسے بھی لے لیجیے۔ وہ بہت Deep (گہرائی تک) جاتا ہے۔ سورۃ الرحمٰن کی وہ مشہور آیت ہے لیکن عام ذہن کے لیے بڑی مشکل آیت ہے۔ اسے قرآن کی مشکل ترین آیتوں میں سے سمجھا جاتا تھا۔ آج اسے سمجھا جائے گا کیونکہ بات سامنے آگئی ہے۔ قرآن کی وہ آیت یہ ہے کہ **یٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ اِنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ اَنۡ تَنفُذُوۡا مِنۡ اَقۡطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ فَانۡفُذُوۡا لَا تَنۡفُذُوۡنَ اِلَّا بِسُلۡطٰنٍ** (55:33)۔ ہمارے ہاں اِس کا ترجمہ یہی ہوتا گیا اور کیا ہوسکتا تھا! وہ بہت مستند ترجمہ مانا جاتا ہے۔ میں اسی لیے وہ پیش کرتا ہے۔ ''اے انسانوں اور جنوں کے گروہو! اگر تم سے ہوسکے تو آسمانوں اور زمینوں کے کناروں سے نکل بھاگو تم نہیں نکل سکتے سوائے سند کے۔'' ٹھیک ہے جوانہوں نے کہا ہے وہی میں کہونگا کہ اِن پر تنقید کی بات نہیں کیوں کہ اُن کے دور میں علمِ انسانی اتنا ہی تھا۔ غلطی اُن کی نہیں ہماری ہے جو اِس کو حرفِ آخر سمجھ لیتے ہیں۔

## قرآن حکیم کی روشنی میں ارض وسما کو عبور کرنے کے سلسلہ میں مورس بوکائے کی تحقیق

وہ کہتا ہے کہ آیئے! بتائیں کہ بات کیا تھی۔ عام طور پہ یہی کہا جاتا ہے کہ اے گروہِ جن وانس! اگر تم یہ کرسکتے ہو تو اقطار السمٰوٰت والارض سے آگے چلے جاؤ۔ تم قوت کے بغیر یہ نہیں کرسکو گے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک تو یہ جو لفظ تنفذوا ہے اس کا ترجمہ نکل بھاگنا ہی کرتے چلے گئے۔ اِس کا ترجمہ عربی میں بالخصوص جب اُس کے بعد ''مِنْ'' آئے تو یہ ہوتا ہے کہ ''تیر کی طرح کسی چیز کے آر پار ہوجانا۔''[1] وہ کہتا ہے کہ ''نفذ'' کے بعد جب ''مِنْ'' آئے تو اس کا یہ ترجمہ ہوتا ہے اور اگر یہ اکیلا آئے یعنی اس کے بعد ''مِنْ'' نہ ہو تو اِس کے معنیٰ ''کسی چیز کا چھید کرنا ہی'' ہوتا ہے۔ اُس کے بعد ''مِنْ'' آئے تو اُس کے معنیٰ ہوتا ہے کہ ''تیر کی طرح کسی چیز سے آر پار ہوجانا''۔[1] پہلے تو یہ دیکھیے کہ اس کے بعد ''مِنْ'' آیا ہے یا نہیں۔ آپ اندازہ لگا رہے ہیں کہ یہ محقق کہاں تک پہنچتا ہے۔ اور آگے چلیے کہ وہ کہاں تک پہنچتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **اسۡتَطَعۡتُمۡ اَنۡ تَنفُذُوۡا** (55:33) اس کا ترجمہ کیا کہ ''اگر تم کرسکو تو''۔ اس نے کہا کہ انگریزی زبان وسیع زبان ہے لیکن اس میں بھی اُس کے لیے ایک لفظ ''If'' ہی ہے۔ اور اگر ہم اپنی طرف آئیں تو اُس کو تو پتہ نہیں تھا کہ ہمارے ہاں بھی ایک لفظ ''اگر'' ہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ عربی ہے۔ اِس کے ہاں عربی زبان میں اسی ''اگر'' کے لیے یہ تین حرف ''اذیااذا اور لَوْ اَن'' ہیں۔ یعنی

---

[1] To pass right through and come out on the other side of a body (e.g. an arrow that comes on the other side of a body). It therefore suggests a deep penetration and emergence at the other end into the regions in question (P.168)

ایک اِس میں ''اذ'' حرف ہے یا جس کو ''اذا'' کہتے ہیں اور دوسرا ''اِن'' ہے۔ وہ کہتا ہے کہ (اگر) If کے بعد اذ یا اذا اُس وقت بولتے ہیں جب کوئی چیز لینے میں Possible ہو یعنی ممکن ہو۔ مثلاً اگر میں وہاں گیا تو یہ کرونگا۔ وہ اُس Condition (شرط) میں اِس کے ساتھ اذ کہیں گے کہ جب وہ چیز اُس شخص سے ممکن ہو جو یہ کہہ رہا ہے۔ ''ان'' وہاں آئے گا جہاں Condition (شرط) ایسی ہو کہ اُس میں Possibility (امکان) تو ہو؛ ہوسکتا ہے کہ ایک وقت میں کسی ایک کے لیے اسے حاصل کرنا Possible (ممکن) نہ ہو لیکن دوسرے وقت میں اُس کے لیے Possible (ممکن) ہو جائے۔ جب کہیں یہ Condition (شرط) ہو تو عرب اُس کے لیے ''اِن'' استعمال کرے گا اور اگر ایسی چیز ہو جو ناممکن ہو تو اُس کے لیے ''لو'' استعمال کرے گا۔ کہا کہ اس آیت کے اندر اِنِ اسْتَطَعْتُمْ (55:33) آیا ہوا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہاں ''اِن'' کیوں آیا ہے۔ اس میں نظر یہ آتا ہے کہ اگر اِس میں استطاعت ہو؛ اگر تم یہ کر سکتے ہو تو کرو۔ کہا کہ نظر آرہا ہے کہ جس دور میں یہ آیت اتری تھی اُس دور میں تو یہ چیز ابھی Possible (ممکن) نہیں تھی لیکن ''اِن'' کے استعمال نے یہ بات بتادی کہ یہ Possible (ممکن) ہوسکتی ہے۔ ❶

## حقیقت تو یہ ہے کہ مورس بوکائے نے عربی سیکھنے کا حق ادا کر دیا

اسے کہتے ہیں عربی سیکھنا' اِسے کہتے ہیں غور و تدبر' اِسے کہتے ہیں تحقیق۔ یہ مورس بوکائے (1911-1989) وہ دونوں چیزیں اپنے سامنے لا رہا ہے۔ اور میں یہ چیز ابھی عرض کرونگا۔ میں دوسری آیت پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آیت کا لفظ میں یونہی نہیں کہہ رہا۔ یہ آیت میں اس کی تائید میں پیش کرونگا۔ کس کے سامنے پیش کرو گے؟ وہ علم کی بارگاہ میں جواب دہ ہے۔ وہ وہاں پیش کرنا چاہتا ہے۔ کہا کہ یہی جو چیز تھی' یہ تھا ''اِن'' جو اُس نے کہا کہ مجھے پکڑ کے بیٹھ جاؤ کہ بات کوئی ایسی ہے کہ جو اُس دور میں تو ممکن نہیں تھی لیکن ہمیشہ کے لیے ناممکن نہیں تھی۔

---

❶ ان نکات کی توضیح و تبیین مورس بوکائے کے اپنے الفاظ کے لیے دیکھیے۔ The Bible, the Qur'an and Science.PP. 167-169.

(The word "if" expresses in English a condition that is dependant upon a possibility and either an achievable or an unachievable hypothesis. Arabic is a language which is able to introduce a nuance into the condition which is much more explicit. There is one word to express the possibility (ida-اذا), another for the achievable hypothesis (in-اِنْ) and a third for the unachievable hypotheis expressed by the word (lau-لَو). The verse in question (55:33) has it as an achievable hypothesis expressed by the word (in-اِن). The Qur'an therefore suggests the material possibility of a concrete realization. (P.168)

## اس ''اِن'' کے سلسلہ میں مورس بوکائے راکٹ کو بطور شہادت پیش کرتا ہے

قرآن نے قوت کہا ہے کہ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (55:33) اگر ''سلطان'' حاصل ہو جائے گا' یہ قوت اور غلبہ حاصل ہو جائے گا' تو یہ ممکن ہو جائے گا۔ اگر ''سلطٰن'' نہیں ہے تو یہ ممکن نہیں ہوگا۔ اس لیے ''اِن'' دونوں معنی اپنے اندر رکھتا تھا۔ اُس زمانے میں عربوں کو تو ''سلطٰن'' حاصل نہیں تھا' اس لیے وہاں کا ''ان'' تو یہی تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ اُس نے کہا کہ جب پہلی دفعہ فضا کو چیرتا ہوا یہ راکٹ ❶ آگے گیا ہے اور جب میں نے اُسے دیکھا تو اس ایک لفظ نَفَذَ کے معنی سمجھ میں آئے کہ وہ تیر کی طرح چیرتا ہوا اُس فضا سے چلا جاتا تھا' اور اس سے آر پار ہو رہا تھا' درمیان میں نہیں لٹک رہا تھا' شیک Shake نہیں کر رہا تھا۔ جس انداز سے یہ تیر کی طرح جا رہا تھا تو میں نے ذہن میں سوچا کہ کسی عرب کو یہ کہا جائے کہ بتاؤ اِس کے لیے تم کیا لفظ استعمال کرو گے تو وہ اس کے لیے نَفَذَ کا لفظ استعمال کرتا۔ اور کہتا کہ نَفَذَ تیر کی طرح سے فضا کو چیر کر آر پار ہو جانے والا ہے۔

## قرآن حکیم میں لفظ ''ان'' کی اہمیت' مفہوم اور بوکائے کے نزدیک قرآن کے مقابل بائبل کا مقام

اب بات سمجھ میں آئی کہ یہاں ''ان'' کیوں آیا ہے۔ اُس زمانے کے عربوں کے پاس تو وہ ''سلطٰن'' نہیں تھا لیکن قرآن نے اِس کو ناممکن قرار نہیں دیا تھا۔ کہا تھا کہ جب بھی ''سلطٰن'' حاصل ہو جائے گا اُس وقت یہ چیز ممکن ہو جائے گی۔ آج کی دنیا میں یہ ''سلطٰن'' حاصل ہوا ہے' یہ قوت حاصل ہوئی۔ اُس نے کہا ہے کہ یہ قوتیں انسان کے اندر تھیں۔ یہ چیزیں بھی یہیں پڑی ہوئی تھیں' ایٹم بھی یہاں رکھا ہوا تھا' انسان کا ذہن بھی موجود تھا۔ اس پہ پردے پڑے ہوئے تھے۔ اور وہ کہتا ہے کہ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا (41:53) نے مجھے بتایا کہ اِس طرح سے خدا کی آیات سامنے آتی ہیں۔ یہ ہے وہ ''سلطٰن''۔ مورس بوکائے (1911-1989) جب بھی کوئی اِس قسم کی ایک مثال دیتا ہے تو اُس کے ساتھ ہی یہ کہتا ہے مثلاً بائبل کا تقابل کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ

> Whereas monumental errors are to be found in the Bible, I could not find a single error in the Qur`an. I have to stop and ask myself: If a man was the author of the Qur'an, how could he have written facts in the Seventh century A.D. that today are shown to be in keeping with modern scientific knowledge? ❷

---

❶ 4/اکتوبر 1957ء میں روس نے اسپٹنک نامی مصنوعی سیارہ پہلی بار خلا میں بھجوا کر ایک عالم کو ورطۂ حیرت میں غرق کر دیا (خورشید عالم: خلا کا عالمی کردار' طلوع اسلام فروری 1968ء' ص ص 40 تا 47)۔ اور پہلا انسان بردار سیارہ 1961ء میں خلا میں بھیجا گیا۔

❷ The Bible, The Qur'an And Science, P.120

بائبل میں تو قدم قدم کے اوپر مجھے یہ غلطیاں نظر آتی ہیں لیکن قرآن میں کوئی ایک مقام بھی ایسا نہیں ہے کہ اُس نے سائنس کے متعلق کچھ کہا ہو اور وہ غلط ثابت ہوا ہو۔ تو اِس مقام کے اوپر مجھے رکنا پڑتا تھا اور اپنے آپ سے پوچھنا پڑتا تھا کہ اگر یہ قرآن کسی انسان کے ذہن کی تخلیق تھا تو وہ چودہ سو سال پہلے کس طرح سے یہ Imagine (تصور) کر سکتا تھا جس کا انکشاف آج سائنس نے کیا ہے؟ اگر یہ قرآن انسان کا تھا تو دنیا کے دانشورو! بتاؤ مجھے یہ کیسے ممکن ہے۔ کوئی مجھے اس کا جواب دو۔ اف میرے اللہ! کیسے چیلنج کرنے والے الفاظ ہیں اس کے!

## ہمارے ہاں ان آیات کا کیا گیا ترجمہ

**وَ لَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ o لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ** (15:14-15)۔ ہمارے ہاں ان دو آیات کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اگر ہم ان کے سامنے آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیتے اور یہ اُس میں دن بھر چڑھتے بھی رہتے تو یہ کہتے کہ ہمیں تو کچھ نظر نہیں آتا' ہماری آنکھوں نے دھوکا کیا ہے' ہم پہ کسی نے جادو کر دیا ہے۔ ان دو آیات کا یہ ترجمہ ہمارے ہاں عام ہے۔ مورس بوکائے (1911-1989) کہتا ہے کہ میں نے یہاں ''لـــو'' کا لفظ دیکھا اور یہ معلوم کیا کہ اُس زمانے کے جو اُن کے مخاطب تھے وہ اس کا کیا مفہوم لیتے ہیں۔ اگر یہ بات ہوتی جو میں ابھی کہنے لگا ہوں کہ آسمان کا جو دروازہ کھل رہا ہے تو کیا واقعی اُن کی صورت یہ ہوتی!! تعجب ہے اس کی علمی سطح کے اوپر' جیسے پاگل ہو جاتا ہے' جیسے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اُس زمانے میں تو یہی ترجمہ تھا کہ ان کے سامنے اگر کبھی ایسا ہو تو اِن کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جائے' وہ مبہوت ہو جائیں' وہ کہیں کہ ہم پر کسی نے جادو کر دیا ہے' بات ان کی سمجھ میں نہ آئے۔ [1]

---

[1] مورس بوکائے کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

" Even if We opened unto them a gate to Heaven and they were to continue ascending therein, they would say: Our sight is confused as in drunkenness, Nay, we are people bewitched." The above expresses astonishment at a remarkable spectacle, different from anything man could imagine.

The conditional sentence is introduced here by the word lau (لَو) which expresses a hypothesis that could never be realized as far as it concerned the people mentioned in these verses. When talking of the conquest of space therefore, we have two passages in the text of the Qur'an: one of them refers to what will one day become a reality thanks to the powers of intelligence and ingenuity God will give to man, and the other [باقی اگلے صفحے پر]

## قرآن حکیم کی تائید میں راکٹ کے خلانوردوں کا بیان

عزیزانِ من' سنیے! مورس بوکائے(1911-1989) کہتا ہے کہ جب یہ خلانورد' یہ جو خلا میں جاتے ہیں' فضا کے پار ہو کر چاند پہ جاتے ہیں تو انہوں نے کیفیات بیان کی ہیں۔ انہوں نے کہا یہ ہے کہ جب ہم سطح زمین کے اوپر جو بارہ چودہ میل تک ایک Atmosphere ہے یعنی فضا ہے' اُس کے اندر یہ روشنی ہے' سے آگے گئے ہیں تو ہم کہہ نہیں سکتے کہ وہاں کیفیت کیا ہوئی۔ یہ Atmosphere (فضا) تو ختم ہو گیا تھا' آگے کوئی Atmosphere (فضا) تھا نہیں۔ اب وہاں صورت یہ ہوئی کہ ہمیں ایسا نظر آیا جیسے ہم پاگل ہو رہے ہیں' اندھیرا چھا رہا ہے۔ ہم کہیں گے کہ ہمیں کیا ہو گیا ہے؟ مورس بوکائے نے کہا کہ انہوں نے آ کر یہ چیز کہی اور قرآن کی یہ آیت میری سمجھ میں آئی کہ اگر آسمان کے دروازے کھل جائیں اور اِس میں سے اوپر جانا شروع کر دیں تو پہلی چیز اُن کے ہاں یہ آئے گی کہ آنکھوں کے آگے اندھیرا آ جائے گا اور یہ کہیں گے کہ جیسا ہم پہ کسی نے جادو کر دیا ہوا ہے۔ انہوں نے اس کے اندر یہ لکھا ہے۔ اس نے کہا کہ اُس زمانے والوں کے لیے تو یہ ''لَوْ فَتَحْنَا'' (15:14) ناممکن تھا۔ اور اِس دور میں وہ جو وہاں اس نے اِن

---

describes an event that the unbelievers in Makka will never witness, hence its character of a conditon never to be realized. The event will however be seen by others, as intimated in the first verse quoted above . It describes the human reactions to the unexpected spectacle that travellers in space will see: their confused sight, as in drunkenness, the feeling of being bewitcheed This is exactly how astronauts have experienced this remarkable adventue since the first human spaceflight around the world in 1961. It is known in actual fact how once one is above the earth's atmosphere, the Heavens no longer have the azure appearance we see from Earth, which results from phenomena of absorption of the Sun's light into the layers of the atmosphere. The human observer in space above the Earth's atmosphere sees a black sky and the Earth seems to be surrounded by a halo of bluish colour due to the same phenomena of absorption of light by the Earth's atmosphere. The Moon has no atmosphere however, and therefore appears in its true colors against the black background of the sky. It is a completely new spectacle therefore that presents- itself to men in space, and the photographs of this spectacle are well known to present day man. (Bucaille, Maurice (1998). The Bible, The Qur'an And Science. Lahore: Islamic Book Service. P.169).

اسْتَطَعْتُمْ (55:33) کہا کہ یہ سُلْطٰن [1] (55:33) کے ذریعے سے ممکن تھا۔تو اب وہ اِن کے تابع آ کر جب یہ اوپر گئے ہیں تو ایک تو وہ نَفَذَ کی طرح یعنی تیر کی طرح چیرتے ہوئے گئے اور آ کر اُنہوں نے جو سنایا ہے' وہ سورۃ حجر کی دونوں آیتیں ہیں' انہوں نے آ کے ان دونوں کا ترجمہ بیان کیا ہے۔اور اس کر بعد پھر وہ وہی بات لکھتا ہے:

Here again it is difficult not to be impressed when comparing the text of the Qur'an to the data of modern science, by statements that simply can not be ascribed to the thought of a man who lived more than fourteen centuries ago.(P169)

کہا کہ اِن کے بیانات قرآن کے بیان کیے ہوئے ہیں۔مورس بوکائے کہتا ہے کہ اِن کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا کہ ہم یہ کہیں کہ یہ کسی انسان نے چودہ سو سال پہلے کہا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ بہت دانشوروں نے' حکما نے بھی' اس قسم کی باتیں کہی ہیں۔ یہ میرے علم میں ہیں' میں نے یہ سب پڑھا ہے۔ٹھیک ہے' اکثر لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ جی رسول اللہ ﷺ نے وہاں اُن کی کچھ اڑتی ہوئی باتیں سن لی ہونگی اور پھر اپنے ہاں قرآن میں یہ بیان کر دی ہیں۔اُن کے ذہن میں اس کی اور کوئی توجیہ آتی نہیں تھی۔ وہ کہتا ہے کہ

It is quite common in the works of the great philosphers of antiquity to find a mixture of valid and invalid ideas about the Universe.(P.162)

ان کے ہاں خیالات ملتے ہیں لیکن ان میں اختلاف ہوتا ہے' وہ ملے جلے ہوئے ہوتے ہیں' کچھ غلط' کچھ صحیح ہوتے ہیں۔

The brilliance of these human works comes from the advanced ideas they contain.(P.162)

مورس بوکائے کہتا ہے کہ ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ اُن کے ذہن اور اُن کی فکر بھی واقعی اپنے ہمعصروں سے آگے چلی گئی تھی۔

but they should not make us over- look the mistaken concepts which have also been left to us.(PP.162-163)

لیکن اس کا بھی اقرار کرنا پڑے گا کہ اُن میں بہت باتیں غلط بھی ہیں۔

---

[1] یہ پوری آیت یوں ہے: یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لاَ تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (55:33)۔اس کی تشریح کے لیے مورس بوکائے کی اس کتاب کا ص-168 دیکھیے۔

From a strictly scientific point of view, this is what distinguished them from the Qur'an. (P.163) ❶

لیکن قرآن اُن سے بالکل منفرد ہو جاتا ہے اور وہ اِس طرح کہ قرآن میں

In the latter, many subjects are referred to that have a bearing on modern knowledge without one of them containing a statement that contradicts what has been established by present- day science. (P.163) ❶

## مورس بوکائے کے ہاں رسول خداؐ کی نبوت کی تائید اور خراجِ تحسین

اُن حکما اور دانشوروں کی باتوں میں غلط بھی ہیں، صحیح بھی ہیں۔ قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے بے شمار مقامات پہ یہ دعاوی کیے ہیں۔ ایک مقام بھی ایسا نہیں ہے جو سائنٹفک انکشافات کے بعد غلط ثابت ہوا ہو۔ اس لیے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ محمدؐ نے ان مفسرین کے افکار مستعار لے لیے۔ اگر وہ یہ کرتا تو اُس میں غلط اور صحیح دونوں ہوتیں۔ اور کہا ہے کہ اگر اُسؐ نے اُن میں سے غلط چیزوں کو چھانٹ کر صرف صحیح چیزیں رکھی تھیں تو وہ کونسا ذریعہ علم تھا جس سے اُس نے سمجھا کہ وہ غلط ہیں۔ اُس دور میں تو کسی بڑے سے بڑے محقق نے بھی اُن کو غلط نہیں کہا تھا۔ مورس بوکائے کہتا ہے کہ اس کو تو پھر انسانی فکر سے ماوراسرچشمہ علم ہی غلط کہہ سکتا تھا۔

عزیزانِ من! بے شمار مقامات ہیں، جہاں اس نے ان باتوں کو دہرایا ہے۔ میں کیا کیا عرض کروں۔ ہر مقام کے اوپر جب وہ یہ چیز ثابت کرتا ہے تو اُس کی تحریر سے یہ نظر آتا ہے کہ وہ وجد میں آ جاتا ہے۔ ثابت کرنے کے بعد اُس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ اے دنیا کے دانشورو! خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ کوئی انسانی ذہن یہ بات کہہ سکتا تھا۔

عزیزانِ من! میں تو صرف Universe (کائنات) اور Atom (جوہر) کے متعلق ہی چار باتیں کہہ رہا ہوں۔ وہ مورس بوکائے تو قریباً تمام علوم کو Touch (مس) کرتا گیا ہے۔

---

❶ Bucaille, Maurice (1998). The Bible, The Qur'an and Science. Lahore: Islamic Book Service.

## قرآن حکیم کے ہاں انسانی پیدائش کی کہانی' مورس بوکائے کی زبانی

عزیزانِ من! یہ جو جنین (Embryo) کے متعلق اُس کا حصہ ہے' یہ رحم مادر کے اندر بچے کی پرورش ہے' میری یہ قرآنی عزیزہ بیٹی ہے جو اِس علم کی ماہر ہے۔ یہ جو حصہ ہے میں اُسے دونگا کہ وہ سمجھے اور پھر مجھے بھی سمجھائے۔ مورس بوکائے یہ کہتا ہے کہ

> The Qur'anic description of certain stages in the development of embryo corresponds exactly to what we today know about it, and the Qur'an does not contain a single statement that is open to criticism from modern science. (P.205)

وہ کہتا ہے کہ جنین کے متعلق کل تک کچھ انسانی علم نہیں تھا' یہ آج معلوم ہوا ہے۔ اور جو معلوم ہوا ہے اُس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں .Not a single statement' ارے کوئی ایک بیان بھی قرآن کا ایسا نہیں' جسے جدید سائنس ہدف تنقید بنا سکے' جسے Scientific knowledge (سائنسی علم) کی Discovery (پردہ کشائی) نے غلط ثابت کر دیا ہو۔ مورس بوکائے کا مسلمانوں کی حالتِ زار پر تبصرہ اور اس پژمردگی کی وجوہات جاننے کے لیے اب وہ آگے ہماری دکھتی ہوئی رگ پر آتا ہے۔ اسے کہتے ہیں محقق۔ وہ کہتا ہے کہ پھر مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اس قسم کی قرآن جیسی کتاب اپنے پاس رکھتے ہوئے یہ ان تو اہم پرستیوں کے اندر آج تک چلے آ رہے ہیں اور اُن کے ہاں کے علما' مفسرین اور محدثین' وہ یہ سارا کچھ' تواتر سے لکھتے چلے آ رہے ہیں اور یہ اُسے مانتے چلے آ رہے ہیں۔ مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اُن کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ پھر میں نے اِس کی تحقیق کی کہ اِن کے ساتھ ہوا کیا۔ کہنے لگا کہ یہ جو ہمارے عیسائیوں کے ساتھ ہوا' وہ یہ تھا کہ ہمارے ہاں بائبل تھی' وہ خدا کی کتاب نہیں رہی' وہ صرف انسانوں کی لکھی ہوئی کہانیاں ہیں اور ہم نے اُن کو خدا کی کتاب سمجھ لیا۔ اِن مسلمانوں کے ہاں ہماری بائبل کے مقابلے میں حدیثیں آئیں۔ وہ انسانوں کی باتیں تھیں' اُسی دور کے انسانوں کی باتیں تھیں۔ وہ کہتا ہے کہ وہ جیسی ہونی چاہئیں تھیں' اگر وہ ویسی ہی رکھتے تو کوئی بات نہیں تھی۔ ہمارے ہاں اِس قسم کی چیزوں تھیں انہوں نے ہمارے ہاں والوں کی طرح کہا کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آنکھیں بند کر کے مانتے چلے آئے۔ جب ہم نے اُس پہ تھوڑی سی تحقیق کی تو ہم نے سرے سے ان Fables (کہانیوں) کا انکار ہی کر دیا۔ وہ کہتا ہے کہ ان مسلمانوں کے ہاں یہی حیثیت اُن حدیثوں کی ہے۔ وہ اُن میں سے مثالیں لاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دیکھیے' یہ حدیث ہے اور یہ دیکھیے' سائنس کا انکشاف ہے۔ وہ مفسر جو کچھ کہہ رہا ہے تو دیکھیے چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں اُس دور کے اندر یہی خیالات عام تھے۔ کہا کہ اس سے یہ نظر آ گیا کہ یہ انسانوں کی باتیں ہیں جو اُس دور کی فکر سے متاثر تھے تو انہوں نے یہ چیزیں لکھ دیں۔ کہنے لگا کہ اِس میں کمال یہ

ہے کہ قرآن دینے والے اُن کے خدا نے اُس قرآن کو اُس سے بالکل الگ رکھ دیا ہے' درمیان میں گڈ مڈ نہیں ہونے دیا کہ کچھ کہیں قرآن ہو اور کچھ بیچ میں وہ آ جائے۔ وہ تو پھر وہی بات ہو جاتی کہ بائبل میں کچھ بات ٹھیک بھی ہے اور غلط بھی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ اِس دین کا کمال ہے کہ وہ بالکل الگ تھلگ رکھا ہوا ہے۔ ان دونوں چیزوں کو سامنے رکھ لیجیے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تو خدا ہی کی کتاب ہے اور یہ انسانوں کی چیز ہے۔

## ہم مسلمانوں سے مورس بوکائے کی التجا

میں اِن کو مشورہ دونگا اگر میری یہ بات مان لیں کہ وہ قرآن کو ہی خدا کی کتاب کہہ کر پیش کریں تو دنیا میں کوئی اس سے انکار نہیں کرے گا۔ اگر انہوں نے اپنے مذہب کو خدا کا دین کہہ کر پیش کیا اور یہ اُس کا جزو بنا دیا جیسا اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن بھی وحی ہے' یہ احادیث بھی مثلہ معہ وحی ہیں' اگر وہ یہی پیش کرتے رہے تو وہ مسلمان قوم تو گئی ہے' اِس سے تو باقی دنیا بھی ادھر نہیں آ سکے گی۔ [1] اور وہ یہ کہہ رہا ہے کہ علم و فضل اور سائنس کی دنیا کے اندر قرآن کو پیش کرو تو اِس انداز سے اُس کو پرکھ کر اور سمجھ کر پیش کرو۔ اگر اس طرح پیش کرو گے تو دنیا کا کوئی اہلِ علم اِس کو چیلنج نہیں کر سکے گا۔ اس نے کہا کہ گو یہ جو ہسٹری ہے میرا میدان نہیں لیکن میں ہسٹری پہ بھی آتا ہوں۔

## مورس بوکائے کی کتاب کا آخری باب طوفانِ نوح کے متعلق بائبل کے افسانوں اور قرآنِ حکیم کے حقائق کا غماز ہے

آخری باب میں اُس نے طوفانِ نوح [2] کی وہ روداد جو بائبل میں آئی ہے' وہ روداد جو قرآن میں آئی ہے' وہ روداد جس کا اب تاریخ نے انکشاف کیا ہے' کا ذکر لیا ہے۔ وہ ان تینوں کو سامنے رکھ کر کہتا ہے کہ ہمارے ہاں کی یہ بائبل ہے تو ذرا دیکھو تو سہی کہ اُس کے اندر کیا کچھ لکھا ہے۔ یہ آج کے تاریخ کے انکشافات ہیں انہیں سامنے رکھو اور پھر قرآن کی ساری Description (توضیح و تشریح) سامنے لے آؤ اور دیکھو کہ یہ دونوں آپس میں لفظاً لفظاً مل رہی ہیں۔ قرآن کے تو کسی دور میں بھی آپ جائیں گے' جب بھی کوئی انکشاف ہوگا' تو یہ انکشافِ حقیقت قرآن کی تائید کرے گا اور اُس کی ایک ایک چیز کے متعلق یہ کہے گا کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔ عزیزانِ من!

---

[1] جو قارئین ان نکات کو مورس بوکائے کے الفاظ میں دیکھنا چاہیں وہ اس کی اس کتاب کا یہ باب زیر مطالعہ لائیں: The Qur'an, Hadiths and Modern Science (PP. 242. 248) (قرآن کریم' احادیث اور علوم جدید سائنس)۔

[2] اس کے لیے مورس بوکائے کی اسی کتاب کا باب The Flood (ص ص۔ 214 تا 218) زیر مطالعہ لائیے۔

ایک غیر مسلم، جس نے کہا ہے کہ میرا اسلام پہ کوئی عقیدہ نہیں، اُس نے اس انداز سے قرآنِ کریم کو سمجھا ہے جو قرآن نے بتایا ہے۔

## مورس بوکائے کی کتاب کے تراجم

عزیزانِ من! سنیے یہ باتیں ہی نہیں ہیں بلکہ اُس نے پہلے یہ کتاب فرانسیسی میں چھاپی، کتنی حدیثیں چھاپیں، انگلش میں تو ابھی یہ چیز آئی ہے۔ ہاں البتہ جب اس کا انگلش میں ترجمہ ہونے لگا تو وہ پاس بیٹھ گیا۔ کہنے لگا کہ میں اعتبار نہیں کرسکتا، میں ترجموں کا ڈسا ہوا ہوں۔ وہ خود ساتھ بیٹھ گیا۔ کہنے لگا کہ میری اپنی انگریزی [1] اتنی اچھی نہ تھی لیکن میں سمجھتا تو ہوں۔ اُس کے بعد عربی زبان کے اندر اب وہ اِس کو مصر میں چھاپ رہا ہے۔ [2]

## کیا قرآن حکیم واقعی خدا کی کتاب ہے؟

میں اپنے عزیزوں سے جن کے دل میں خیال اٹھتا ہے پوچھتا ہوں کہ اِس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ قرآن محمد ﷺ کی اپنی فکر کی تخلیق نہیں ہے بلکہ یہ خدا کی کتاب ہے۔ میں اُن سے کہونگا کہ عزیزانِ من! اِس کا جواب مجھ سے نہ پوچھیے، کسی مسلمان سے نہ پوچھیے کیوں کہ کہا جائے گا کہ تمہارا تو ان پہ ایمان ہے۔ یہ اُس سے پوچھیے جس کا یہ ایمان نہیں ہے اور وہ ہے مورس بوکائے۔ وہ اپنی اس کتاب کے کم از کم بیس مقامات پہ ہر تحقیق کے بعد یہ دہراتا ہے اور کہتا ہے کہ اے دنیا کے دانشورو! مجھے یہ بتاؤ کہ کیا اُس دور کے اندر کوئی انسان یہ کہہ سکتا تھا۔ اور اگر نہیں کہہ سکتا تھا تو پھر کیا اِس کے ماننے میں کوئی تامل ہوسکتا ہے کہ اِس کا سرچشمہ انسانی فکر سے ماورا ہوتا ہے۔ اور یہ ہے وہ چیز جو میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ قرآنِ کریم کو یہ قومیں سمجھیں گی۔ اِس کا نظام بھی وہی قومیں لاسکیں گی جو اِس طرح قرآن کو سمجھیں گی۔ میں نے اختصار سے کام لیا ہے ورنہ کہنے کے لیے بہت کچھ تھا۔

## قرآنِ حکیم پر ایمان لانے کا طریق

قرآنِ کریم نے اَلَمْ تَرَ (35:27) کہا تھا۔ یہ وہی لفظ رأی کے ساتھ ہے۔ یہ وہی سُنُرِيهِمْ (41:53) والی بات ہے جو قرآن کہتا ہے کہ یہ ذہنی بات نہیں ہے، یہ فکری بات نہیں ہے، یہ Theoretical چیز بھی نہیں ہے، یہ محسوس چیزوں کو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد کی بات ہے اور پھر آگے جو غور کیا جائے والی بات ہے۔ محسوس علم الحواس Perceptual Knowledge کے ذریعے، جب ان محسوس چیزوں پر غور کیا جاتا ہے تو وہ Concepts (تصورات) بنتے ہیں، اِسے Conceptual knowledge

---

[1] فرانسیسی زبان سے انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے والوں میں الاسٹیئر ڈی۔ پینل (Alastair D. Pannell) اور خود مصنف مورس بوکائے شامل ہیں۔

[2] یاد رہے یہ بات اکتوبر 1978ء کی 6 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

(علمِ تصورات) کہتے ہیں۔قرآن کا طریق یہ ہے کہ وہ اَلَمْ تَرَ (35:27) پہلے کہتا ہے کہ Senses (حواس) کے ذریعے پہلے یہ علم حاصل کرو۔اور حاصل کرنے کے بعد پھر جس طرح سے یہ شخص، یہ مصنف، نتیجے پہ پہنچتا ہے تو وہ ہے قرآن، جس کو وہ علم عقل شعور فکر تدبر کہتا ہے۔وہی آیات جو آج کے درس کی ابتدا میں سامنے آئی تھیں، اسی سلسلے میں سورۃ فاطر کی یہ آیت ہے کہ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا (35:27) کیا تم نے یہ دیکھا نہیں ہے، یہ آنکھوں سے دیکھنے کی بات ہے کہ آسمان سے بارش برستی ہے۔پھر یہی بار بار آتا ہے۔یا رزندہ صحبت باقی، وقت بچا تو اور چیزیں بھی بتاؤں گا۔

## مآء کے لفظ کی تشریح اور پھر زندگی کے وجود میں آنے پر ریسرچ

مورس بوکائے (1998-1911ء) تو ایک ایک لفظ پہ کھڑا ہو جاتا ہے۔قرآن نے کہا تھا کہ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (21:30) ہم نے ہر زندہ شے کو پانی سے بنایا ہے۔مآء کے لفظ کی تشریح کرتا ہوا چلا جاتا ہے اور ایک ایک لفظ کا جو Aspect (پہلو، گوشہ) ہے اُس کی رو سے بتاتا ہے کہ اِس کی رو سے کیسے زندگی پیدا ہوتی ہے۔قرآن کا یہ دعویٰ کتنا محیطِ کل ہے کہ ہم نے ہر زندہ شے کو مآء سے پیدا کیا ہے۔ ❶

## قرآنِ حکیم میں زوالوجی کی بنیاد پر پہاڑوں کے مختلف رنگوں کا، بارش کے بعد پھلوں کا، مختلف انسانوں کی نسلوں کا اور ان کی زبانوں کا، تذکرہ اور آج کے دور میں مورس بوکائے کی ریسرچ

مورس بوکائے (1998-1911ء) کہتا ہے کہ یہاں ❷ (35:27) میں مآء کا لفظ آیا ہے جبکہ عربی زبان میں تو اور بھی کئی الفاظ تھے۔اس آیت کا اگلا حصہ ہے کہ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا (35:27) اُس سے ہم نے مختلف قسم کے پھل پیدا کیے۔اس کے بعد ہے کہ وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ (35:27) اور جاؤ پہاڑوں کی چٹانوں پہ، تو وہاں تمہیں نہ زندگی نظر آئے گی نہ روئیدگی نظر آئے گی۔وہاں تم یونہی آگے بڑھ جاؤ گے۔کہا کہ آگے نہ بڑھو، کھڑے ہو جاؤ۔اس میں تمہیں مختلف قسم کی دھاریاں نظر آئیں گی۔عزیزانِ من! میرے عزیز قرآنی طالبعلم جو زوآلوجسٹ ہیں، وہ یہ بتایا کرتے ہیں، وہ جاتے ہی یہ Study (مطالعہ) کرنے کے لیے ہیں۔انہوں نے کہا ہے کہ صاحب! یہ جو پہاڑوں کے اندر دھاریاں ہیں، یہ تو علوم کا ایک ذخیرہ

---

❶ جو قارئین مورس (1998-1911ء) بوکائے کے ان نکات کی مزید وضاحت کے طلبگار ہیں، وہ ان کی اس کتاب (The Bible, The Qur'an and Science) کے عنوان The Origins of life، ص ص۔185 تا 187 کا مطالعہ کریں۔

❷ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ (35:27)

ہے۔ چودہ سو سال پہلے کی ایک کتاب کہہ رہی ہے کہ یہ بارش سے برسنے والا پانی اور اُس سے اگنے والی روئیدگی تو روز دیکھتے ہو۔ پہاڑوں کی چٹانوں میں یہ مختلف جودھاریاں ہوتی ہیں تو کبھی اِن پہ بھی تم نے غور کیا ہے۔ یہ کیوں مختلف رنگوں کی ہیں؟ الم تر' ان پہ بھی کبھی غور کیا ہے؟ اس کے بعد ہے کہ وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ (35:28) اور اسی طرح سے انسانوں میں دیکھو کہ مختلف نسلیں' مختلف Tempraments' مختلف زبانیں' انواع واقسام' مویشیوں کو دیکھو اور جانداروں کو دیکھو۔ کہا کہ کبھی تم نے ان پر غور کیا ہے؟ نہیں غور کیا۔ کہتا ہے کہ تم نے کیا غور کرنا ہے' اور تمہیں کیا پتہ ہے کہ خدا کی عظمت کیا ہے۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (35:28) یہ ان علوم کے اسکالرز اور محقق اور عالم ہی ہیں جو اُن پہ غور کرتے ہیں اور پھر اِن کے بنانے والے کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (35:28) وہ اُس چیز کو جانتے ہیں کہ اُس کا کتنا غلبہ ہے اور اُس نے کتنا حفاظت کا سامان بہم پہنچایا ہوا ہے۔ اتنی اتنی عظیم قوتیں ٹکرا رہی ہیں اور یہ کارخانہ کارگہ تباہ نہیں ہوتا۔ کہتا ہے کہ یہ علما ہی بتائیں گے۔

آپ نے دیکھا کہ علما کا لفظ کہاں آیا ہے۔ ''تے تہانوں وی پتہ اے کہ تہاڈے علما کینوں کیندے ہیگے۔''❶ آپ کے علما یہ تھے جو پہلی دفعہ چاند پہ گئے ہیں تو یہاں لاہور مغلپورہ میں' بہت بڑا وعظ ہوا تھا۔ اُس میں انہوں نے کہا تھا کہ چاند رات تھی' وہ چودھویں تھی' جب وہ آسمان پر گئے ہیں۔ وہ عالم صاحب کہنے لگا کہ ''اینا ں دی گل سن دے او؟ ہنیر پے گیا اے۔ آکیندے نیں کہ چن اتے چلے ہیگے نیں' کین لگے: میں اگے کچھ نئیں کیندا۔ معاف رکھیے گا۔'' پنجابی دا وعظ پنجابی اچ ای سمجھ اوندا اے۔''❷ سمجھتی ہو بیٹیو یا اردو میں ترجمہ کروں؟ تو اب مجھ سے اس کی اردو نہیں ہوتی۔ سنو! انہوں نے کہا کہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم چاند پہ جا رہے ہیں۔ کہنے لگا: لو بتاؤ چاند پہ جا رہے ہیں' یہ نئی نئی باتیں سننے میں آ رہی ہیں' زمانہ ہی ایسا آ گیا ہے صاحب! یہ کیا بتائیں!'' ہنیر پے گیا فسق وفجور کا زمانہ ہے۔ کہنے لگے: جی میں کچھ نئیں کیندا۔''❸ آج کل تو چاند پورا کھلا ہے' یہ چودھویں کی رات تھی۔ تو ''کہن لگے کہ جی ہن نے بڑی جگہ اے۔''❹ اس کے

---

❶ آپ کو بھی معلوم ہے کہ تمہارے ہاں علما کسے کہتے ہیں۔

❷ ان کی بات سن رہے ہو؟ یہ اندھیر نگری' چوپٹ راج ہے' یہ کہتے ہیں کہ چاند پہ چلے گئے ہیں۔ کہنے لگے کہ مجھے آگے کچھ نہیں کہنا۔ معاف رکھیے گا پنجابی کا وعظ پنجابی زبان میں ہی سمجھ میں آتا ہے۔

❸ اندھی لگی ہے۔ فسق وفجور کا زمانہ ہے۔ کہنے لگے: جی! میں کچھ نہیں کہتا۔

❹ کہنے لگے کہ جی! اب اس وقت تو وہاں بڑی جگہ موجود ہے۔

بعد تو وہ چاند سمٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے یہ اِدھر اُدھر ہوتے چلے جائیں گے' تو میں اِن سے پوچھتا ہوں کہ ''جدوں او پہلی دا چن ہونا اے' تے جگہ ای نئیں رہنی' تے فیر کتھے جاؤ گے بچو۔''[1] یعنی جب وہ پہلی کا چاند ہو گیا تو جگہ ہی نہیں رہے گی تو پھر کہاں جاؤ گے۔ یہ ہمارے ہاں کے بہت بڑے جید عالم ہیں صاحب! قرآن کہتا تھا کہ یہ صرف علما کا حصہ ہے جو ان چیزوں کے بعد خدا کے سامنے جھکتے ہیں۔

عزیزانِ من! یہ شخص [2] جو کہتا ہے کہ اسلام کے متعلق تو میرا Faith (عقیدہ) نہیں تھا لیکن قرآن کو میں نے ایک Independent (آزاد) محقق کے طریق سے مطالعہ کیا اور اِس کے ایک ایک بیان کے بعد وہ کہتا ہے کہ

میری نگاہ نے جھک جھک کے کر دیئے سجدے
جہاں جہاں پہ تقاضائے حسنِ یار ہوا

اس کے ایک ایک بیان کے بعد جب میں نے سائنس کی Discovery (نقاب کشائی) کو دیکھا تو میں بے اختیار سجدے میں گر گیا کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔

## ایک انتہائی خواہش

عزیزانِ من! میرا آج کا درس اِس موضوع پہ تھا۔ یہ داستانِ عظیم تھی' جی چاہتا تھا کہ کوئی ایسی قوم اٹھے جو قرآن کو اِس طرح سے لے۔

سوز او اندر دلِ پروانہ رہا

پروانے کے دل کے سوز کا مداوا نہیں ہوا کرتا۔ یہ تو پروانے کے دل کا سوز ہے۔ عزیزانِ من! آج آپ لوگ کہیں گے کہ صاحب! یہ کتاب کہاں سے آئی۔ میں نے عرض کیا کہ یہاں تو نہیں آئی۔ یہ امریکہ میں چھپی ہے۔ ابھی یہاں نہیں پہنچی' مجھے میرے دوستوں نے انگلستان سے براہِ راست ایک شخص کے ہاتھ بھجوائی ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ یہ پاکستان میں آ جائے۔ بہر حال آج کا درس اِس کے متعلق تھا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀.....❀❀.....❀❀

---

[1] جب پہلی کا چاند ہو گا تو پھر تو جگہ ہی نہیں رہے گی وہاں' تو پھر کہاں جاؤ گے؟

[2] یہ مورس بوکائے (1911-1989ء) کی طرف اشارہ ہے۔

# ساتواں باب: سورۃ النمل (آیت 62 اور دعا کا مفہوم)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1978ء کی 13 تاریخ ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے درس میں درس کا آغاز سورۃ النمل کی آیت 60 سے ہونا تھا یعنی (27:60) سے جہاں سے بیسواں پارہ شروع ہوتا ہے۔ 60 سے 65 تک کی یہ آیات قریباً خارجی کائنات میں فطرت کے قوانین اور اس کے مظاہر کے متعلق ہیں اور اس سلسلے میں ہمارے سامنے یورپ کے ایک نام ور سائنٹسٹ کی کتاب [1] تھی جس میں اس نے فطرت کے مظاہر کے متعلق بڑی تفصیل سے گفتگو کی تھی اور بتایا تھا کہ وہ اپنے سائنس کے انکشافات کی روشنی میں جب قرآن کے ان دعوؤں کو دیکھتا ہے اور اس نے اس کی بھی تحقیق کی اور بڑی گہری تحقیق کی، تو وہ ہر تحقیق کے بعد پکار اٹھتا تھا کہ مجھے بتاؤ کہ آج سے چودہ سو سال پیشتر ساتویں صدی عیسوی میں دنیا میں کون شخص تھا جو وہ بات کہہ سکتا جو یہ قران میں کہی گئی ہے۔ اور اس کے بعد وہ کہتا تھا کہ کیا یہ اس کی دلیل نہیں ہے کہ قرآن کسی انسان کے فکر کی تخلیق نہیں ہے۔ یہ فکرِ انسانی سے ماوراء کوئی سرچشمہ ہے، جہاں سے یہ علم آیا ہے۔ یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی کہ وہ یہ کچھ کر سکتا۔ سارا درس اسی کو محیط تھا۔ گویا اس اعتبار سے 60 سے 65 تک جو آیات ہیں، اگرچہ ایک ایک آیت تو نہیں سامنے آئی لیکن جامع طور پر ان آیات کے متعلق نہایت بلیغ انداز سے پچھلے درس میں ہمارے سامنے یہ حقیقت آ گئی تھی۔ انہی آیات کے درمیان ایک آیت آتی ہے جس کا تعلق مظاہرِ فطرت سے نہیں، کائناتی قوتوں سے نہیں، اس کا تعلق انسانی دنیا سے ہے اور اس میں ایک ایسا اہم موضوع آ گیا ہے جو مذاہب کی دنیا میں بڑا اہم بھی ہے اور ایک پریشاں کن معما بھی۔ اور وہ ہے دعا کا موضوع۔

## ''دعا'' کا مفہوم قرآنِ حکیم کے آئینہ میں

وہ 62ویں آیت ہے کہ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ یَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ

---

[1] Bucaille, Maurice (1998). The Bible, The Qur'an and Science. Lahore: Islamic Book Service.

الْاَرْضِ ءَ (27:62)۔ وہ کون ہے جو یہ کرسکتا ہے [1] اور اس کے بعد ہے کہ ءَ اِلٰـهٌ مَّعَ اللّٰهِ (27:62)۔ یعنی ہر قانون کے بعد وہ بتا رہا ہے کہ بتاؤ کہ کوئی اور صاحبِ اقتدار بھی ایسا ہوسکتا ہے جو یہ کرے۔ درمیان میں یہ آیت آئی ہے کہ وہ کون ہے جو قلبِ مضطر کی دعاؤں کو سنتا ہے اور ان لوگوں کی مصیبتوں کو رفع کرتا ہے۔ دعاؤں کو سننا اس آیت کا عام ترجمہ ہے جو کیا جاتا ہے: دعاؤں کو سنتا ہے اور مصیبتوں کو رفع کرتا ہے۔ تو دعا کا مسئلہ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے ہمارے ''مذہب'' [2] میں ہی نہیں' دنیا کے تمام مذاہب میں شروع سے ہی ایک لاینحل سا معما بنا چلا آتا ہے۔ میں کچھ عام فہم الفاظ میں اس کے متعلق بات کروں گا' فلسفہ یا میٹا فزکس (مابعد الطبیعات) کی طرف نہیں جاؤں گا کہ میرا جو درس ہے وہ ان سے الگ ہوتا ہے۔ اس نقطۂ خیال سے میں نے اپنے ہاں دعا کے متعلق کچھ لکھا ہوا ہے۔ ''کتاب التقدیر'' میں آپ دیکھیں گے کہ اس کے متعلق ایک Chapter (باب) ہے لیکن یہاں میں گفتگو عام فہم الفاظ میں کروں گا۔

مذہب کی دنیا میں ایک عقیدہ تو یہ ہے کہ جو کچھ اس دنیا میں ہونا ہے' انسان نے جو کچھ کرنا ہے' وہ پہلے سے طے شدہ ہے' وہ پہلے سے خدا نے مقرر کر رکھا ہے۔ اب اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا سے دعا کی جائے تو کیا وہ اس کو بدل دیتا ہے جو اس نے خود پہلے سے طے کر رکھا ہے۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ دعا کے متعلق اس تصور کے بعد جو اعتراضات پیدا ہوتے ہیں' ہر ایک دل میں یہ پیدا ہوتے ہیں کہ اگر عقیدہ یہ ہے کہ خدا نے پہلے سے ہر شے کو طے کر رکھا ہے' تو پھر اس سے یہ کہنا کہ یہ چیز یوں نہیں یوں کر دے۔ مثلاً کسی بیمار کے متعلق اس نے یہ طے کر رکھا ہے کہ اس نے تین دن کے بعد مر جانا ہے۔ اور اس کے تیماردار یا گھر والے دعائیں کرتے ہیں کہ یا اللہ! اس کو شفا عطا کر دے تو کیا وہ اپنے اس پہلے لکھے ہوئے کو بدل کر یہ کر دے گا کہ نہیں' تین دن کے بعد اس کی موت نہیں واقع ہوگی' اس کو اور زندگی مل جائے گی؟ اس سے تو بہت اعتراض پیدا ہوتے ہیں کہ خدائے علیم نے ایک چیز کو طے کیا اور پھر ہمارے چاہنے پہ اس کو بدل دیا۔ پھر یہ کہ اگر ہم اس سے نہ کہتے تو پھر وہ اس کے مطابق ہی کرتا۔ کیا وہ اپنے پہلے سے کیے ہوئے فیصلے کو ہمارے چاہنے کے مطابق بدلتا جاتا ہے؟ اس سے یہ اعتراض پڑتا ہے۔ اور اگر یہی ہے کہ نہیں اس نے اس کائنات میں کچھ قوانین مقرر کیے ہوئے ہیں اور انسان کو اس کی آزادی حاصل ہے کہ وہ ان کے مطابق کرے یا اس کے خلاف کرے۔ جیسا کرے گا اس قسم کا نتیجہ اس کے سامنے آجائے گا۔ تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر وہ قانون کی خلاف ورزی کر کے دعا کرتا ہے کہ ایسا نہ ہو تو کیا وہ نہیں ہوتا؟ مثلاً اس نے قانون مقرر کیا ہے کہ سنکھیا کھانے سے ہلاکت ہو جائے گی۔ سنکھیا پھانکنے کے بعد وہ دعا کرتا ہے یا اللہ! میری ہلاکت نہ ہو' سنکھیے سے یہ حشر نہ ہو تو وہ جو خدا نے قانون مقرر

---

[1] کہ جب کوئی محکوم اور مجبور قوم' اپنی پریشانیوں میں' اس کے قانون کو پکارتی ہے تو وہ اس کی پکار کا جواب دیتا ہے (اور کہتا ہے کہ اس کی پریشانیوں کا علاج اس کے پاس ہے) اور جب وہ اس کے مطابق عمل کرتی ہے' تو اس کی مشکلات کو دور کر دیتا ہے اور اس طرح تمہیں حکومت و مملکت عطا کر دیتا ہے۔ (24:54.55)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔875)

[2] قرآن کریم نے الدین کہا ہے۔

کیا تھا کہ سنکھیے سے ہلاکت ہوتی ہے' کیا وہ اپنے اس قانون کو بدلے گا؟

## خدا تعالیٰ نہ تو اپنے کسی قانون کو بدلتا ہے اور نہ ہی اپنی سنت (پریکٹس) میں تبدیلی کرتا ہے

قانون کے متعلق تو اس نے بار بار کہا ہے کہ لَا تَبۡدِيۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (10:64)۔ میں نے عرض کیا تھا کہ کلمات نظری طور پہ یعنی Theoretical ہوتے ہیں اور سنت اللہ پریکٹس میں آنے کو کہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ لَا تَبۡدِيۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (10:64) قوانینِ خداوندی میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا (33:62) اللہ کی سنت میں بھی کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔

## سوال یہ ہے کہ کیا ہماری دعا قوانینِ خداوندی کو بدل دے گی؟

جب نہ روش میں تبدیلی ہے' نہ قانون میں تبدیلی ہے تو قانون کی خلاف ورزی کرنے سے جو نتیجہ برآمد ہونا تھا ہم اس پہ دعا کرتے ہیں کہ اس کے خلاف ہو جائے حالانکہ اس نے تو کہا تھا کہ ہم قانون تبدیل ہی نہیں کرتے۔ دوسری شکل میں یہ ایک اور اعتراض پڑتا ہے۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ دعا کا یہ مفہوم لینے سے ہر ذہن میں اس قسم کے اعتراضات اٹھتے ہیں۔

## کیا خدا مظلوم کی' بے بس کی' دعاؤں کو نہیں سنتا؟

پھر اگلی چیز یہ ہے کہ وہ مظلوم کی دعاؤں کو سنتا ہے اور قبول کرتا ہے۔ یہ ہم لوگوں کا روزمرہ کا تجربہ ہے کہ ایک مظلوم سے مظلوم تر ہستی ہے' وہ نہایت خلوص سے سجدے میں سر ڈال کر آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دعائیں کرتی ہے۔ وہ ایک بیوہ عورت ہے جس کا ایک سہارا اس کا جوان بچہ ہے وہ بیمار ہے' وہ قریب المرگ ہے' اس سے زیادہ مخلص دعائیں اور کون کرے گی۔ رات رات بھر وہ سجدے میں پڑی ہوئی دعائیں مانگتی ہے کہ یا اللہ! یہ بچ جائے اور وہ مر جاتا ہے۔ تو پھر یہ بات بھی نہیں ہوئی کہ وہ مظلوم کی دعا سنتا ہے اور اس کے مطابق کرتا ہے۔

## اگر خدا نے حق کا ساتھ دینا ہی ہے تو پھر دعا کرنے کا مقصد؟

پھر اگلا اعتراض یہ پڑتا ہے کہ فرض کیجیے کہ ایک عدالت میں ایک مقدمہ ہے' مقدمے میں مدعی اور مدعا علیہ ہیں۔ صبح کو اس مقدمے کی تاریخ ہے اور رات کو وہ دونوں خدا سے دعائیں کرتے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ میرے حق میں وہ فیصلہ ہو جائے' دوسرا کہتا ہے کہ میرے حق میں فیصلہ ہو جائے۔ یہ کس کی دعا سنے گا اور کس کے حق میں فیصلہ کرے گا؟ کہا جاتا ہے کہ جو حق پر ہے اس کے حق میں خدا یہ فیصلہ کرائے گا۔ اگر سوال یہی ہے کہ وہ جو حق پر ہے اس کے مطابق وہاں فیصلہ ہوتا ہے تو اگر یہ جو حق پر ہے یہ دعا نہ کرے تو کیا پھر وہ فیصلہ

دوسرے کے حق میں ہو جائے گا؟ اس کے دعا کرنے کا یا نہ کرنے کا اس پہ کیا فرق پڑے گا؟ اگر خدا کے ہاں یہی قاعدہ مقرر ہے کہ ان دونوں میں سے جو حق پر ہے وہ اس کی تائید کرتا ہے' خدا اس کی مدد کرتا ہے تو پھر وہ تو سوال ہی نہیں ہے کہ وہ دعا کرے تو اس کی مدد کرے' اگر دعا نہ کرے تو اس کی مدد نہ کرے' دوسرے کے حق میں فیصلہ ہو جائے۔ یہ اور اس قسم کے سوالات' میں نے عرض کیا ہے' کہ ذہنوں میں اٹھتے ہیں۔ میں فلسفے میں نہیں جا رہا' وہاں تو باتیں ہی کچھ اور ہوتی ہیں۔ یہ عام روزمرہ کی چیزیں ہیں' روزمرہ کے تجربے ہیں' روزمرہ کے خیالات ہیں' اعتراضات ہیں جو ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔

## قلبِ مضطرب میں خدا کے متعلق پیدا ہونے والے تصورات اور قرآن کا جواب

تڑپتا ہوا مظلوم میرے پاس آتا ہے۔ ٹھیک ہے' مظلوم کے دل میں ایک قیامت برپا ہوتی ہے جب اس کے خلاف ایک چیز ہوتی ہے۔ وہ آ کر کہتا ہے کہ تمہارا یہ خدا کس قسم کا ہے' دیکھتے نہیں ہو کہ کیا میں حق پہ نہیں ہوں' کیا مجھ پہ ظلم نہیں ہو رہا؟ اگر وہ مظلوم کی مدد نہیں کرتا' ظالم کا ہاتھ نہیں پکڑتا' تو وہ خدا کس کام کا ہے (معاذ اللہ)؟ یہ باتیں تو ٹھیک ہیں۔ قلبِ مضطرب' جس کے ساتھ اس طرح سے زیادتی ہوئی ہو' تو پھر جو جی میں آئے گا' کہے گا۔ ہمارے ہاں یہ کچھ روز کہتے ہیں۔ اس کا کیا جواب ہے ہمارے پاس؟ عزیزانِ من! یہ ہیں وہ اعتراضات' وہ سوالات' جو دعا کے اس تصور کے ماتحت دلوں میں ابھرتے ہیں۔ اب اس کا جواب یہ تو نہیں ہے کہ تم ملحد ہو گئے ہو' بے دین ہو گئے ہو' دہریئے ہو گئے ہو اور جو جی میں آئے اسے کہیے لیکن وہ کہتا ہے کہ

میرے دکھ کی دوا کرے کوئی ❶

یہ ان کے اعتراض کا جواب تو نہیں ہے بلکہ اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم ہر بات دلیل و برہان سے کرتے ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ ہمارے ذہن میں دعا کا جو تصور ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ یہ سارے اعتراضات اس تصور پر عائد ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم سے اگر دعا کا تصور سامنے آ جائے پھر ان میں سے کوئی اعتراض پیدا نہیں ہوتا۔

## دعا کا قرآنی مفہوم ''پکارنا یا آواز دینا'' ہے

پہلی چیز تو یہ ہے کہ عربی زبان میں بھی اور قرآن کی رو سے بھی دعا کے معنی کسی سے کچھ مانگنا نہیں ہے۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔ دعا ''داع'' کے معنی کسی کو آواز دینا ہوتا ہے' پکارنا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تو جب بات آگے آئے گی تو ہم تو دعا مانگنا کہتے ہیں یعنی دعا بھی کہتے ہیں اور ساتھ مانگنا بھی کہتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں ''پکارنا' آواز دینا''۔ لفظ تو میں دعا ہی کہوں گا کیونکہ اس کا تو بدل نہیں ہے۔ دعا کے متعلق

---

❶ ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی (غالب)

ایک جامع آیت ہے۔ یہ جو آیت (27:62) میں نے پڑھی ہے یہ قریباً اسی ہی کا اعادہ ہے جو وہ سورۃ بقرۃ کی آیت ہے اور روزوں کے احکام کے سلسلے میں درمیان میں آتی ہے کہ **وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ** (2:186) اے رسول! جب میرے بندے میرے متعلق تم سے کچھ پوچھیں ان سے کہو کہ **فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ** (2:186) خدا کہیں دور نہیں ہے تمہارے قریب ہے۔ **اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ** (2:186) جب کوئی بلانے والا پکارنے والا آواز دینے والا ہمیں آواز دیتا ہے ہم اس کی آواز کا جواب دیتے ہیں: ''آواز دیتا ہے تو جواب دیتے ہیں''۔ اس سے اگلے جو الفاظ ہیں وہ ایک پروگرام ہے۔ یہ بڑی جامع عجیب وغریب آیت ہے ویسے تو قرآن کی کون سی آیت عجیب وغریب نہیں۔

## خدا تعالیٰ کو پکارنے کا طریق اور اس کی طرف سے اس کا پیش کردہ جواب

وہ الفاظ یہ ہیں کہ **فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ** [1] (2:186)۔ یہ ہے قرآن سمجھنے کا طریقہ۔ یہاں **لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ** (2:186) نے سارا مفہوم واضح کر دیا۔ صحرا میں مسافر ہے اور راستہ بھول گیا ہے۔ وہاں کوئی شخص راستہ بتانے والا نہیں ہے۔ اب سوچیے کہ وہ کس قدر پریشانی میں مبتلا ہوگا۔ کوئی راستہ نظر نہیں آتا' دور ایک آدمی نظر آیا ہے تو سوچیے کہ اسے کتنی بڑی امید بندھی ہے۔ وہ یہ نہیں کرتا کہ اس کے بعد وہ بھاگ کر اس کے پاس جائے بلکہ وہیں کھڑے کھڑے اس کے منہ سے آواز نکلتی ہے ''او بھائی جانے والے آ' ذرا ٹھہر جائیں' ذرا ٹھہر جائیں''۔ وہ وہاں سے ہی آواز دیتا ہے۔ جو مسافر صحیح راستے پہ چلا جا رہا ہے وہ کسی دوسرے جانے والے کو آواز نہیں دیتا۔ آواز وہ دیتا ہے جو راہ گم کردہ ہے' راستے کی تلاش ہے' راستہ ملتا نہیں ہے۔ وہ صحیح راستہ معلوم کرنے کے لیے آواز دیتا ہے۔ یا دور اہے پہ کھڑا ہے کہ جہاں پتہ نہیں کہ کس طرف مڑوں' کوئی قریب نہیں' آواز دیتا ہے۔ یہ ہمارا روزمرہ کا تجربہ ہے۔ وہ یہ پوچھنے کے لیے آواز دیتا ہے کہ جی! صحیح راستہ کون سا ہے' مجھے فلاں جگہ جانا ہے' فلاں منزل پہ پہنچنا ہے' فلاں گاؤں میں جانا ہے' فلاں سمت کو جانا ہے' راستہ کون سا ہے؟ وہ اس کو آواز دیتا ہے' پکارتا ہے اور راستے کی مثال تو یہ صحرا اور سڑک ہی نہیں ہے۔

## انسانی کی پرابلم صرف اس وقت ہوتی ہے جب اس کا حل اس کے سامنے نہ ہو

آپ غور کیجیے گا کوئی مسئلہ آپ کے سامنے آئے' تو جب تک اس کا حل آپ کے ذہن میں نہیں آتا' آپ پریشان رہتے ہیں۔

---

[1] (وہ اس طرح کہ) جب بھی کوئی شخص اپنی راہ نمائی کے لیے مجھے پکارتا ہے' تو میرا قانونِ ہدایت جو قرآن کے اندر محفوظ ہے اس کی پکار کا جواب دیتا ہے (اور اُبھر کر اس کے سامنے آجاتا ہے) لہٰذا ان سے کہہ دو کہ قربِ خداوندی کا طریقہ یہ ہے کہ یہ لوگ میرے قانون کی صداقت پر یقین محکم رکھتے ہوئے اس کی پوری پوری اطاعت کریں (7:56;8:24;32L15:16;40:60;42:26)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔69)

جونہی اس کا حل سمجھ میں آ جاتا ہے' آگے کرنے کی بات باقی رہ جاتی ہے' پریشانی ختم ہو جاتی ہے۔ پریشانی اس وقت ہوتی ہے جب پرابلم کا صحیح حل سمجھ میں نہ آئے یا سامنے نہ آئے۔ پوچھیے کہ بھئی! بیمار کو کچھ افاقہ ہوا' تو وہ کہتے ہیں افاقہ کیسے ہوتا' وہ تشخیص صحیح نہیں ہو سکی۔ جس وقت تشخیص صحیح ہو جائے' آدھی مصیبت تو اس وقت ٹل جاتی ہے۔ یعنی اس کے بعد آپ کی پریشانی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اگلا پروگرام پھر آپ کے ہاں آتا ہے' جب وہ بتاتا ہے کہ بھئی! یہ راستہ اس گاؤں کی طرف جاتا ہے جدھر تم نے جانا ہے تو تمہاری پریشانی ختم ہو گئی' اب راستے پہ چلنا رہ گیا ہے۔

## خدا تعالیٰ کی ذات تو قدم قدم پر آواز کا جواب دیتی ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ اس آیت کے اندر یہ ہے کہ میرے متعلق پوچھتے ہیں تو ان سے کہو کہ جو راستے کی تلاش میں اس وقت مارے مارے پھر رہے ہیں' مسئلے کا حل سمجھ میں نہیں آتا' تو ان سے کہو کہ میں ان سے کوئی دور نہیں ہوں' میں اتنا قریب ہوں کہ جب بھی کوئی آواز دیتا ہے تو میں اس کی آواز کو صرف یہی نہیں کہ سنتا ہوں بلکہ جواب دیتا ہوں۔ تو گویا بہت دور نہیں ہے' بہت قریب ہے اتنا قریب ہے کہ **اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ** (2:186) ہر آواز دینے والا جو ہے' میں اس کی آواز کو سنتا ہوں' جواب دیتا ہوں۔

## لعلکم' لعلھم اور یرشدون کا قرانی مفہوم

میں نے پہلے جو یہ مثالیں دیں ہیں تو یہ میرے اپنے ذہن کی خلاقی نہیں ہے۔ قرآن نے کہا ہے **لَعَلَّهُمۡ يَرۡشُدُوۡنَ** (2:186) تا کہ یہ ہو جائے۔ آپ کو یاد ہے کہ میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ قران کی تو حکمت یہ ہے کہ جہاں کوئی بات کہتا ہے تو اس کے بعد یا تو **لعلکم** یا **لعلھم** آتا ہے۔ اس کا معنی ہوتا ہے کہ ہم یہ سب کچھ اس لیے کر رہے ہیں تا کہ یہ ہو جائے۔ اب ہے **يَرۡشُدُوۡنَ** (2:186)۔ تو یہ کیا چیز ہے؟ اب یہاں سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ ''رشد'' جو عربی زبان کے مادے کے اعتبار سے ''رش د'' ہے' اس کے اندر تین چیزیں موجود ہوتی ہیں: پہلی چیز یہ کہ رشد کے معنی ہوتا ہے صحیح راستہ' دوسری چیز صحیح کے ساتھ ساتھ جو تمہیں تمہاری منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ یہ معنی اس Root (مادہ) کے اندر ان کے ہاں ہیں۔ یہ عرب بھی عجیب قوم تھی۔ وہ راستہ جو تمہیں تمہاری منزل پر پہنچا دے' چنانچہ مرشد کہتے تھے اس راستے کو جو چلنے سے پہلے متعین طور پر معلوم ہو کہ یہ فلاں جگہ پہنچا دیگا۔ ضمناً یہ عرض کر دوں کہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ خدا کے سوا کوئی مرشد نہیں ہے کیونکہ اس نے جو کہا ہے کہ راہنمائی تو وہی ہے جو خدا کی دی ہوئی راہنمائی ہے' دوسرا تو کوئی مرشد ہو نہیں سکتا۔ تو مرشد کہتے تھے ان راستوں کو جو منزل تک پہنچا دیں۔ اور تیسری چیز ان کے ہاں ہوتی تھی کہ کسی صحیح راستے کے معلوم ہو جانے کے بعد اس پر جم کر چل پڑنا۔ یہ تینوں چیزیں ہوں تو پھر ''رشد'' ہوتا تھا۔ یہ سارا کچھ جو پہلے کہا ہے کہ میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو کہو کہ میں قریب

ہوں' جواب دیتا ہوں۔

بیچ میں وہ پروگرام آیا ہے' میں ابھی عرض کرتا ہوں جو دو الفاظ ہیں **لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ** (2:186) تاکہ وہ جس راستے کی تلاش میں ہیں' وہ راستہ ان کے سامنے آ جائے' راستہ وہ جو ان کو منزلِ مقصود تک پہنچا دے بشرطیکہ وہ استقامت سے اس کے اوپر چل پڑیں۔ عزیزانِ من! داع سے **یرشدون** کا سارا مفہوم واضح ہو گیا کہ اس سے یہ ہو گا۔ پھر اس پرابلم کا جو صحیح حل ہے وہ سامنے آ جائے گا۔ راستہ جس کی تمہیں تلاش ہے' جو تمہیں منزلِ مقصود تک پہنچائے گا' تو وہ راستہ جو ہے وہ تمہارے سامنے آ جائے گا۔ اس کا پتہ نشان بتا جائے گا۔ پکارتے ہو اس وقت جب کہ صحیح راستہ تمہارے سامنے نہیں ہوتا' پریشانی اس وقت ہوتی ہے تمہیں۔

## خدا تعالیٰ کی طرف سے جواب دینے کا طریق

اب اگلی بات یہ آئی کہ اس پریشانی میں بھی' راستہ معلوم کرنے کے لیے بھی' ہم پکارتے تو ہیں' اس کی طرف سے ہمارے کانوں میں تو کوئی آواز نہیں آتی جسے ہم جواب کہیں کہ اس نے جواب دیا ہے۔ اب یہ چیز اپنے ذہن میں فرض کر لینا کہ ہاں ہم نے پکارا' اس نے سنا' اس نے جواب دیا۔ ہم نے سنا نہیں' بھئی! اس کی آواز سنی نہیں جایا کرتی۔ جو آواز سنی نہ جائے تو اس جواب کا فائدہ کیا ہے۔ خود بہرہ یا اس کی آواز اتنی دھیمی ہو کہ جو سنی نہ جائے تو اس جواب دینے اور نہ دینے میں فرق کیا ہوا۔ آواز تو ہم سن سکتے ہیں تو کہیں اور سے جواب ملنا ہے۔ یہ آیت معلوم ہے کہاں آئی ہے: **شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ** (2:185)۔ یہ آیت اس دعا والی آیت کے بعد آئی ہے۔ قرآن نازل کیا اور اس قرآن میں انسان کو جس صحیح راستے کی تلاش ہو گی تو اس راستے کا پتہ نشان دیا ہوا ہے۔ Sign Post (نشانِ راہ) لگا دیئے ہوئے ہیں' سنگِ میل لگا دیئے ہوئے ہیں۔ اس میں کسی قسم کا اضطراب نہیں' کسی قسم کا شک نہیں' ریب نہیں' نمایاں طور پر' بین طور پر' راستے کی نشاندہی کر دی ہے اس قرآن کے اندر ہم نے انسانوں کے لیے اور جہاں دوراہا آیا ہے وہاں (**والفرقان**) فرق کرنے کے لیے سائن پوسٹ لگا دیا ہے کہ یہ شہر کی طرف جائے گا' یہ ماڈل ٹاؤن کی طرف جائے گا۔

قرآن کے متعلق بات ہو رہی ہے اور اس کے بعد یہ کہا ہے کہ جب میرے بندے میرے متعلق پوچھیں اور وہ کہیں کہ صاحب! صحیح راستے کے متعلق خدا سے ہم نے پتہ لینا ہے تو وہ کہہ رہا ہے کہ ہم نے تو پہلے ہی یہ اپنی کتاب نازل کر دی' نقشے دے دیئے۔ سڑکیں بنا دیں' انڈکس اس کے سامنے دیدیا۔ ہر چیز تو اس کے اندر ہم نے دی ہوئی ہے' راستے کے متعلق پوچھتے ہو کہ کدھر جائیں تو گائیڈ بک تمہارے ہاتھ میں ہے اور اتنی قریب ہے کہ تمہارے پاس رکھی ہے' دور ہے ہی نہیں۔ اس کو Consult کرو' پکارو مجھے کیونکہ یہ کلام اللہ

ہے' میری باتیں اس میں ریکارڈ ہو چکی ہیں۔ میری ریکارڈ شدہ بات جو تم اس کے اندر دیکھو گے تو تمہاری پکار کا میں ہی جواب دوں گا اور کون دے رہا ہوگا۔ او بھئی! لکھ کر بھی تو ہم دوسروں سے پوچھتے کہ اس پرابلم کا حل کیا ہے۔ نسخے بھی تو لکھتے ہوئے ملتے ہیں۔

## انسان کو قیامت تک جس جس قسم کی بھی رہنمائی درکار تھی وہ قرآن میں محفوظ کر دی گئی

اس نے کہا کہ ہم علیم ہیں خبیر ہیں' ہم جانتے ہیں کہ کہاں کہاں تمہیں راستے کی تلاش ہوگی۔ ہم نے پہلے ہی سے اپنی اس کتاب کے اندر ساری چیزیں درج کر دی ہوئی ہیں۔ اور تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ (6:115) یہ مکمل ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ تم کسی مقصد کے لیے آواز دو اور اس کا جواب قرآن سے نہ ملے۔ براہِ راست خدا نے باتیں کرنا تو ختمِ نبوت کے بعد ختم کر دیا۔ اور جتنی Guidance (راہنمائی) کی ضرورت تھی' راستوں کے پتے نشان کے بتانے کی ضرورت تھی' وہ ساری کی ساری اپنی آخری وحی یعنی قرآن کے اندر مکمل طور پر دے کر اسے محفوظ کر دیا اور یہ دعویٰ اس کے بعد کیا کہ کسی پرابلم کا بھی حل جو تمہیں خود ذہنِ انسانی سے نہ ملتا ہو تو ہم سے اس کا حل لو۔ ہم جواب دیں گے۔ عام فہم زبان میں یوں بات کی جائے گی کہ ہم سے پوچھو ہم بتائیں گے۔ اور پھر کہا کہ ان سے کہو کہ مارے مارے پھرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کہیں جا کے خدا کو ڈھونڈیں' ہر بازار میں جائیں' مکے میں جائیں' کہاں جائیں۔ او کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ پوچھو ہم سے ہم جواب دیتے ہیں۔ عزیزانِ من! کہیے قلب مضطرب کہ جو صحیح راستے کے نہ ملنے کی وجہ سے پریشانی کا باعث بن رہا تھا' ایک لفظ کے اندر جواب دیا کہ میاں! یہ راستہ جاتا ہے تمہارے گاؤں کے اندر' تو ایک سیکنڈ میں ساری پریشانیاں رفع ہو جاتی ہیں اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ (27:62)۔ کون ہے جو قلبِ مضطر سے پوچھتا ہے کہ میں کس طرف جاؤں۔ تو ہم جواب دیتے ہیں' اس کی پریشانی رفع ہو جاتی ہے۔

## راستہ معلوم ہو جانے کے بعد منزل کے حصول کے لیے ایک شرط

وہ نہ صرف راستے کی نشاندہی کرتا ہے بلکہ یہ شرط بھی لگاتا ہے کہ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (2:186)۔ تم نے ہم سے کچھ پوچھا' ہم نے اس کا جواب دیا۔ اس کے بعد ہے کہ کچھ تم نے بھی کرنا ہے کہ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ (2:186)۔ ہم بھی تم سے کچھ پوچھتے ہیں اس کا جواب تمہیں دینا ہوگا۔ یونہی مفت میں یہ جو ہم نے راستہ بتا دیا ہے' یہ سن کر چلے جانے والی بات نہیں ہے۔ آگے پہنچو گے کیسے؟ جواب دو۔ وہ پوچھتا ہے کہ بتاؤ' آگے کیسے پہنچو گے۔ عجیب چیز ہے اجیب۔ پہلے ہے کہ تم پوچھتے ہو' ہم بتاتے ہیں۔ اور پھر ہے کہ ہم پوچھتے ہیں تم بتاؤ ''ایویں مفت وچ تے او کچھ وی نئیں دیندا[1]''۔ فلیستجیبوا لی اور پہلی بات یہ ہے کہ کیا ہم نے جو یہ

---

[1] ویسے ہی' مفت میں' تو وہ کچھ بھی نہیں دیتا۔

کہا ہے اس کے سچے ہونے پر یقین ہے؟ راستہ بتانے والے کی بات پہ اگر یقین ہی نہ ہو تو چلے گا کیسے؟ کہا: ہمیں یہ بتاؤ اس پہ یہ یقین ہے کہ جو ہم نے بتایا ہے وہ صحیح راستہ ہے۔ بس ایک بات ہم تم سے پوچھتے ہیں اس کا جواب دو۔ یقین نہیں ہے تو جاؤ' دھکے کھاتے پھرو۔ یقین ہے اور اس یقین کے بعد پھر یہ بات ہوگی: **لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ** (2:186)۔ یہ صحیح راستہ جو تمہارے سامنے آیا ہے تمہیں منزلِ مقصود پہ پہنچا دے گا۔ غور فرما رہے ہیں کہ یہ آیہ جلیلہ کیا کچھ کہہ گئی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ وہ مسئلہ جو کم از کم اڑھائی ہزار سال سے تو میرے سامنے بھی ہے۔ جہاں تک میرے علم کی وسعت ہے' یونان کے حکما سے تو میں نے اس کو دیکھنا شروع کیا ہے۔ عزیزانِ من! میں نے تو قرآن کو یوں سمجھا ہے۔ فلسفے کے جتنے بھی Schools of Thought (مکاتبِ فکر) تھے ان کو بھی دیکھا۔ میٹا فزکس والوں کو بھی دیکھا' مذاہب کو بھی دیکھا۔ یہ وہ معما ہے جو ان کے ہاں کہیں حل ہی نہیں ہوتا۔

رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

وہ ایک دلیل دے کر ایک مسئلے کو حل کرتے ہیں' اگلے ہی مرحلہ میں وہ دوسرے مسئلے میں پھنس جاتے ہیں۔ قرآن نے ایک آیت کے ایک لفظ کے اندر مسئلے کو حل کر کے رکھ دیا ہے۔ اب ساری بات یہی ہوئی کہ وہ جو اس نے کہا ہے کہ **فلیستجیبوا لی** (2:186) میری بات کا بھی جواب دو کہ اس پہ یقین ہے اور اگلی بات جو میں نے کہا تھا کہ آگے اب پروگرام آتا ہے۔ پروگرام یہ آیا کہ اس پہ اگر یقین ہو گیا ہے جو خدا نے راستہ بتایا ہے' یہی سچا راستہ ہے تو چل پڑو۔ ایک لفظ کے اندر پہلے تو یہ بات آ گئی۔ عربی زبان کا جو لفظ رشد ہے اس کے اندر یہ بات ہوتی ہے۔ صرف صحیح راستے کا معلوم کرنا ہی نہیں' معلوم کرنے کے بعد' استقامت سے چل پڑنا۔ رشد میں یہ تینوں چیزیں آتی ہیں۔ اب قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں دیکھیے وہ کہتا ہے کہ ہم بتاتے ہیں۔

## دعاؤں کی قبولیت کی خاطر یقینِ محکم اور عملِ پیہم کی شرط کو پورا کرنا ہوگا

میں عام الفاظ میں پھر بات کروں گا۔ دعا ہی کا لفظ کہہ کر تو پھر یہ کہوں گا کہ دعائیں کس کی قبول ہوتی ہیں۔ یوں کہنے سے بات تو آپ سمجھ گئے۔ یعنی کس کی پکار کا جواب ملتا ہے؟ **وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ** (40:60)۔ پہلی چیز تو یہ ہے۔ خدا نے یہ کہا ہے کہ راستے کی تلاش ہے تو مجھے پکارو' میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔ اور آگے ہے کہ **اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ** (40:60)۔ یہ پوچھنے کے بعد راستہ بھی ہم بتا دیں لیکن اس کے بعد جو کچھ اس سے کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر وہ اس کی تعمیل نہ کرے' بلکہ اس پہ سرکشی اختیار کرے تو جہنم میں جا گرے گا۔ جنت کا راستہ اس نے پوچھا تھا' ہم نے بتا بھی دیا تھا لیکن اس کے بعد اس نے اس سے سرکشی برتی یعنی جو ہم نے کہا تھا کہ ادھر جاؤ لیکن اس نے سرکشی برتی تو اس کے بعد جہنم میں جا گرا۔

راستے کا صحیح معلوم ہونا ہی اس کے لیے کافی نہیں ہے۔ وہ جو اس کے بعد کہا تھا کہ بتاؤ کیا تمہیں اس کے سچا ہونے پہ یقین ہے؟ اگر ہے تو اگلی بات یہ ہے کہ پھر کیا اس سے سرکشی تو نہیں برتو گے؟ سیدھی سی بات ہے کہ صحیح تشخیص ہوئی اور صحیح نسخہ لکھا۔ اب وہ نسخہ (Prescription) تو آپ نے الگ رکھ دیا۔ اور پھر کسی عطائی سے جا کر کشتہ لے لیا' جہنم میں تو داخل ہو گئے۔ دوسری شرط یہ آ گئی۔ دیکھ رہے ہیں اگر آپ یہی لفظ لینا چاہتے ہیں کہ دعائیں کس کی قبول ہوتی ہیں تو اگلی شرط یہ آ گئی کہ اس کے قوانین کی اطاعت سے سرکشی نہیں برتیں گے۔ وہی صحیح منزلِ مقصود پر پہنچے گا جو اس کے قوانین کی اطاعت کرے گا۔ دو تین اور آیات لیجیے۔ سوال یہی تھا کہ جسے ہم دعائیں قبول کرنا کہتے ہیں تو وہ کس کی قبول کرتا ہے یا وہ کون ہے جس کو وہ راستہ بتاتا ہے اور وہ صحیح منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ صرف راستہ کا معلوم ہو جانا کافی نہیں ہے۔ **وَيَسْتَجِيبُ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** [1] (42:26)۔ وہاں ایمان کی بات ''یرشدون'' پر آ گئی تھی' یہاں کہا ہے کہ دعائیں ان کی قبول ہوتی ہیں' ہمارا بتایا ہوا راستہ انہیں فائدہ دیتا ہے۔

## دعاؤں کی شرط میں ایمان کے ساتھ صالحیت کا ہونا ضروری ہے

اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ اس پہ یقین رکھیں کہ واقعی یہ سچی بات ہے جو اس نے کہی ہے کہ صحیح راستہ ہے اور اس کے بعد **وعملوا الصلحٰت** ہے یعنی جو ہم نے اس کے لیے کہا ہے کہ یہ کچھ کرو گے تو پھر نتیجہ نکلے گا تو وہ یہ کچھ کرے۔ ڈاکٹر کی صداقت پر یقین ہو' تشخیص پر یقین ہو' نسخے کے صحیح ہونے پر یقین ہو۔ تو پھر اگلی بات یہ ہے کہ پھر نسخہ بنوا کر لائے اور استعمال کرے۔ اور اگر پہلی ساری چیزیں کرتا چلا جائے اور اس کے بعد وہ ٹھپ کے رکھ دے' اس کو ''چاندی چڑھوا کے تے گل اچ پالوے''۔ [2] ایمان کے ساتھ یہ عملِ صالح آپ کو سارے قرآن میں ملے گا۔ پہلی چیز ہے جو انسان کی ذہنی پریشانی رفع کر دیتی ہے۔ ٹھیک ہے یہی صحیح حل ہے' راستہ یہی ہے' تشخیص ہو گئی ہے' نسخہ بھی ٹھیک تجویز ہوا ہے تو اس سے انسان کو پریشانیوں سے Relief ہوتا ہے۔ اب اگر بیماری نہیں جاتی تو سنیے! وہ اس سے جاتی ہے کہ وہ اس نسخے کے مطابق جا کر دوا لائے' اس کو استعمال کرے' اس کے مطابق پرہیز کرے' پھر وہ جاتی ہے۔ یہ اگلی شرط بڑی لازمی ہے۔ یہ ہے جس کو عملِ صالح کہتے ہیں لیکن اس کے لیے پہلی شرط بھی لازمی ہے کہ طبیب کی تشخیص پہ صداقت ہو' اس کے تشخیص پہ' نسخے کے صحیح ہونے پر' یقین بھی ہو۔ یہ ایمان ہے۔

---

[1] (اس کا قانون یہ ہے کہ غلط راستوں پر چلنے والے لوگ بھی) اس کے قوانین کی صداقت پر ایمان لے آئیں اور اس کے بعد اس کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1133)۔

[2] چاندی میں لپیٹ کر گلے میں ڈال لے۔

## صالح عمل کی شرط میں ایمان کا ہونا ضروری ہے

کہا کرتے ہیں کہ اگر عملِ صالح ہی ہے تو ایمان کی کیا ضرورت ہے؟ ایمان کے بغیر تو عملِ صالح ہوتا ہی نہیں ہے۔ جس ڈاکٹر کو عطائی سمجھتے ہیں، فریب کار سمجھتے ہیں، اس کے نسخے کو آپ خرید کر استعمال کیوں کر کریں گے؟ اور اگر اس کو صحیح سمجھتے ہیں، اس پہ یقین بھی ہے، ایمان ہے تو عملِ صالح کے بغیر ایمان آپ کو کیا فائدہ دے سکتا ہے؟ ٹھیک ہے یقین ہے جی ہمیں ڈاکٹر کی صداقت پہ بھی، نسخے کی صحت پہ بھی، لیکن اس کے بعد نسخہ لا کر رکھا تو ہے مگر ابھی تو ہم نے استعمال نہیں کیا تو اس کا کیا فائدہ!

## نسخہ کے استعمال کا طریق بھی صحیح ہونا ضروری ہے

اب اگر وہ نسخہ بھی استعمال کے اندر صحیح ہے مگر کیفیت یہ ہے کہ وہ نسخہ حکیم نے لکھ کر دے دیا اور کہہ دیا کہ اس کو گرم پانی میں بھگو کر پی لینا۔ دوسرے دن آ کر اس نے کہا کہ "حکیم جی! فائدہ تے کچھ ہویا نئیں ہیگا[1]"۔ اس نے کہا ہے کہ پتہ نہیں کیوں نہیں ہوا۔ کہنے لگے کہ اچھا وہ نسخہ لاؤ۔ کہنے لگا کہ جی، وہ تو آپ نے کہا تھا کہ گرم پانی میں ڈال کر بھگو کر پی لینا "تے میں تے او بھگو کے پی گئی سی، تے نسخہ کتھوں دیاں تہانوں؟ جے نسخیاں نوں تسی ایس طرح گھول گھول کے پینا اے، تے ورد کرنے نیں، تے وظیفے کرنے نیں، تے تعویذ لکھنے ہیگے نیں، یا بغیر سمجھے ہی اونوں رٹے ہوئے نوں پڑھدے ترے جانا ہیگا اے، تے فیر تے نئیں نا فائدہ ہون لگا[2]"۔ یہ عملِ صالح نہ ہوا۔ اس کے اندر جو صلاحیتیں ہیں وہ برومند نہیں ہوئیں۔ عملِ صالح تو وہ ہوتا ہے۔ تو شرط یہ بتائی کہ **وَيَسْتَجِيبُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَيَزِيدُهُم مِّن فَضْلِهِ** (42:26)۔ کہنے لگا کہ اگر یہ کچھ کرو گے تو تم دیکھو گے کہ جتنی تم توقع لیے بیٹھے تھے اس سے بھی زیادہ فائدہ ہوگا۔ تم اس کو کر کے تو دیکھو۔ اچھے نسخے سے جو ہوتا ہے، تو تم کہتے ہو صاحب! جو مجھے توقع تھی کہ اتنا ہو جائے گا، وہ تو اس سے بھی زیادہ طاقت مجھ میں آئی، اللہ کا شکر ہے، صحت بڑھی ہے۔ کہتا ہے کہ تمہاری توقعات کے پیمانے بڑے محدود ہوتے ہیں۔ ہمارے نسخے کے جو اثرات ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ بڑے ہوتے ہیں۔ تم کر کے تو دیکھو۔

---

[1] فائدہ تو کچھ بھی نہیں ہوا۔

[2] میں تو اسے پانی میں بھگو کر پی گئی تھی، اب میں وہ نسخہ آپ کو کہاں سے لا دوں؟ اگر آپ نے نسخوں (Prescriptions) کو یوں گھول گھول کر پینا ہے، ورد کرنے ہیں، وظیفے کرنے ہیں، تعویذ لکھنے ہیں یا بغیر سمجھے ہی، اس رٹے ہوئے کو پڑھتے چلے جاتا ہے تو پھر تو اس کا کوئی فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔

## کائنات کی حیثیت' اس کی کامیابی' اور اس کی افادیت پر غور وفکر کی دعوت

دو ایک آیات اور لیں۔ پیچھے سے آیت چلی آ رہی ہیں کہ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ o الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ (3:190-191) جو لوگ اٹھتے لیٹتے نظامِ کائنات پہ غور وفکر کرتے ہیں' ایک ایک چیز کا تجزیہ کرتے ہیں' Analyse (تجزیہ) کرتے ہیں' حقائق کی Discovery (نقاب کشائی) کرتے ہیں' تحقیق کرتے ہیں' پھر اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا (3:191) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے یہ نظام کائنات یونہی رائیگاں' باطل' تخریب کے لیے نہیں بنایا ہے۔ وہ اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں۔ پھر آگے ان کی دعائیں ہیں کہ اب اس کے بعد وہ راستہ دکھا دے' جس سے ہم فطرت کی ان قوتوں کو اس طرح استعمال کریں کہ یہ صحیح نتائج مرتب کریں' انسانیت کی تخریب نہ کریں' اس کی تعمیر کریں۔ تو یہ سب کچھ دعائیں ہیں۔ ان دعاؤں کے بعد کہا کہ فَاسۡتَجَابَ لَهُمۡ رَبُّهُمۡ (3:195)۔ پھر ہم نے اس کا یوں ترجمہ کر لیا کہ ''ہم نے تمہاری دعاؤں کو قبول کر لیا''۔ اب تو بس موج ہو گئی' دعا قبول ہو گئی۔ کہا کہ یاد رکھو! یہ جو ہم نے کہا ہے کہ دعاؤں کو قبول کر لیا تو کیا اس کے معنی بھی سمجھے؟ معنی یہ ہیں کہ اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ (3:195)۔ جب تم اس کے مطابق کام کرتے ہو تو وہ کام' وہ نتیجہ برآمد کرتا ہے جس کے لیے وہ حل بتایا گیا تھا۔ اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ (3:195)۔ یہ درمیان میں ہی بات آتی ہے لیکن قرآن کی یہ بات کیا ہے؟ عورت اور مرد کے مقامات اور ان کے مدارج کے لیے وہ اتنی لمبی چوڑی گفتگوئیں ہوتی ہیں اور جب یہ کہہ دیا جائے کہ صاحب! ان دنوں میں مساوات ہے تو ان کو جھنجھنی آ جاتی ہے کہ عورت اور مرد میں مساوات کہہ رہے ہو!!

بات درمیان میں یہ آ رہی تھی کہ من ذکرٍ او انثٰی (3:195)۔ عورت ہو یا مرد ہو' کسی کا عمل رائیگاں نہیں جاتا: بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ (3:195)۔ یہ بات نہیں ہے کہ یہ کوئی اور ہیں' وہ کوئی اور ہیں' تم سب ایک ہی تو ہو۔ یعنی درمیان میں چلتے چلتے بھی وہ بات کر جاتا ہے۔ اور آگے صاحب! وہ جو عمل تھا کہ جن کی دعائیں قبول ہوئی ہوتی ہیں۔ تو پروگرام یہ ہے صاحب! کہ فَالَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا وَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِهِمۡ وَ اُوۡذُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَ قٰتَلُوۡا وَ قُتِلُوۡا (3:195) مصیبتوں کے ستائے ہوئے ہیں۔ تمہیں لوگوں نے بڑی تکلیفیں پہنچائیں' تم گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے' وہاں سے چلے گئے' ان لوگوں نے تمہارا پیچھا کیا' تمہیں میدانِ جنگ میں جانا پڑا۔ میدانِ جنگ میں تم نے جانیں دیں بھی اور دشمن کی جانیں لیں بھی۔ یہ اتنا کچھ کہنے کے بعد کہا کہ لَاُکَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَیِّاٰتِهِمۡ وَ لَاُدۡخِلَنَّهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ

**الثَّـوَابِ** (3:195) یہ سارا کچھ ہے۔ اس میں چھوٹی چھوٹی لغزشیں، کوتاہیاں ہو جاتی ہیں۔ یہ جو تم نے صحیح کام کیے ہیں ان کا وزن اتنا بڑا ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کے Optional Subjects (اختیاری مضامین) میں جو فیل ہوتا ہے وہ صحیح کام اس کو ڈھانپ دیتا ہے۔ یہ ہے وہ پروگرام جس کے ماتحت تم اپنے مقاصد کی سدا بہار جنتوں کے اندر زندگی بسر کرو گے۔ دیکھا تم نے کہ ثواب کہاں آتا ہے۔ اس پروگرام کے لیے جس قدر مصائب اور مشکلات آئیں، ان کا مردانہ وار مقابلہ کرو، وطن تک چھوڑنا پڑے تو چھوڑ دو، میدانِ جنگ میں جان دینی پڑے تو دے دو۔ اس کے بعد یہ کہا کہ یوں ملتا ہے وہ حصہ جو ہم نے پہلے کہا تھا۔ اور کہا کہ یہ بڑا حسین حصہ ہوتا ہے جو ہم دیتے ہیں۔ **فَـاسْتَـجَابَ لَهُمْ** (3:195) ہم نے تمہاری دعائیں قبول کر لیں۔ اور اس کے بعد یہ کہا ہے کہ **اَنِّـیْ لَآ اُضِیْـعُ عَـمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ** (3:195)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب تمہاری کوششیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔

## راستہ بھولے مسافر کی مشکلات بڑی ناگفتہ بہ ہوتی ہیں

عزیزانِ من! جو راستہ بھولا ہوا مسافر ہے غور کیجیے اس کی کوششیں کیسے رائیگاں جاتی ہیں؟ وہ سارا دن چلتا رہتا ہے۔ تھکتا بھی ہے اور قدم قدم کے اوپر ذہنی پریشانی بھی اتنی ہوتی ہے کہ پتہ نہیں صحیح راستے پہ چل رہا ہوں یا نہیں؟ صحیح راستے پر جو کچھ اس قسم کی نشانیاں آتی تھیں وہ تو نہیں آئی ہیں، بتانے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ پھر کہیں اِدھر چل پڑتا ہے، کہیں اُدھر چل پڑتا ہے۔ صحیح راستے کے مقابلے میں شام تک شاید دس گناہ زیادہ مسافت طے لیتا ہے۔ شام کو اس کے حصے میں سوائے تکان کے اور کیا آ سکتا ہے؟ کچھ بھی نہیں **اُولٰٓـئِکَ حَبِطَـتْ اَعْـمَـالُهُمْ** (2:217) یہ وہ ہیں کہ جنہوں نے صحیح راستہ متعین کیے بغیر سفر شروع کر دیا، تو ان کی ساری محنتیں رائیگاں چلی گئیں۔ قرآن کہتا ہے کہ **ذٰلِکَ هُوَ الْـخُسْـرَانُ الْمُبِیْنُ** (22:11) ان کو دہرا نقصان ہوا۔ منزلِ مقصود پہ پہنچا نہیں، تکان پہلے سے زیادہ ہوئی، پریشانی اور ہوئی۔ یہ صرف اس سے ہے کہ جب راستہ معلوم نہیں ہو رہا تھا تو ہم سے نہیں پوچھا تھا کہ صحیح راستہ کون سا ہے۔ قرآن کو Consult (ہدایت کے لیے مشورہ) نہیں کیا تھا۔

## ہزار سال سے ملتِ اسلامیہ اپنے لہولہان پاؤں کے ساتھ خود ساختہ مذہب کے نوکیلے پتھروں پر محوِ سفر ہے

عزیزانِ من! ہزار برس سے پوری کی پوری امت اس لق و دق صحرائے کائنات کے اندر محوِ سفر ہے۔ سوائے تکان کے اس کے حصے میں کچھ نہیں آ رہا، بس چل رہی ہے۔ جہاں تک عمل اور کام کا تعلق ہے، اس گئے گزرے دور میں بھی جو مسلمان امت ہے وہ مدد کے لیے کچھ کم مشقتیں نہیں اٹھا رہی، بڑی محنت کرتی ہے لیکن نتیجہ کیا؟ کچھ بھی نہیں۔ وہ اس کے دل سے پوچھیے، اس کے جگر سے پوچھیے ''آج'' جس کی منزلِ مقصود ''کل'' سے دور ہو۔ ہر قدم اس کو منزلِ مقصود سے دور لیے چلا جا رہا ہے اور کتنی تکان اس سے ہو رہی ہے۔ کیا ہوا؟

جی‘ راستہ گم ہو گیا۔

## سعی لا حاصل کی لذت میں مصروف ملت کی حالتِ زار

راستہ گم کیا ہوا ہے؟ وہ تو اپنے جیسے جو اور راہ گم کردہ ہیں‘ ان سے پوچھ رہے ہیں‘ امریکہ سے پوچھ رہے ہیں‘ روس [1] سے پوچھ رہے ہیں‘ لندن سے پوچھ رہے ہیں‘ ہندو سے پوچھ رہے ہیں۔ نہیں پوچھتے تو خدا سے نہیں پوچھتے۔ ڈر رہے ہیں کہ اگر اس نے سیدھا راستہ بتا دیا تو مصیبت آ جائے گی‘ ’فیرتے پہنچ جاں گے [2]‘‘۔ اور یہ جو اک لذت ہماری سعی لا حاصل میں ہے‘ یہ چلی جائے گی۔ یہ قوم سعی لا حاصل کی لذتوں سے کیف بار ہو رہی ہے۔ یہ ابھی ہمارا رمضان شریف گزرا ہے۔ پوچھیے‘ دیکھیے‘ دنیا کی کوئی قوم اس قسم کی محنت کرتی ہے! دن میں یہ کچھ‘ پھر آدھی آدھی رات تک‘ ہمارے ہاں ذکر کی محفل ہوتی ہے‘ تہجد تک‘ صبح پھر اذان ہو جاتی ہے‘ وہ ذکر والے تو سو جاتے ہیں۔ بیچارے مزدور نے ایک روٹی کھانی ہے اور وہ سارا دن محنت کرتا ہے‘ شام کو روکھی روٹی بھی نہیں ملتی۔ پھر اسی طرح سے شروع ہو جاتا ہے۔ پورا ایک مہینہ یہ کر رہا ہے۔ ابھی ابھی دس بارہ لاکھ کی تعداد میں وہاں وہ عرفات کے میدان میں انہوں نے جمع ہونا ہے۔ زکوٰۃ کے روپے آپ دیکھیے کہ کتنے نکل رہے ہیں‘ صدقہ خیرات بھی ہے اور ابھی قربانیوں میں آنی ہیں۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ انہوں نے بیس ہزار روپے میں ایک بکرا خرید کیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ جس کو عمل کہا جا رہا ہے یہ کتنا زیادہ ہو رہا ہے۔ اور اس کے بعد آج ان کی منزلِ مقصود کل سے دور ہے۔

یہ سب کچھ کرنے کے باوجود کسی مسلمان سے آپ ملیے تو دونوں آپس میں مرثیہ پڑھیں گے‘ اس چیز کے اوپر روئیں گے کہ ہمیں کیا ہو گیا ہے۔ کیا کوئی اس کا حل بھی ہے‘ کیا کوئی اس کا علاج بھی ہے؟ یہ کیا ہوا ہے؟ اس نے کہا تھا کہ ایسے مقام پہ ہم سے پوچھو کہ صحیح راستہ کون سا ہے۔ اس سے نہیں پوچھنا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم کسی کا عمل ضائع نہیں ہونے دیتے‘ کسی کا کام بے نتیجہ نہیں رہنے پاتا! مگر شرط یہ ہے کہ اس نے ہم سے راستہ پوچھ لیا تھا‘ اس قرآن سے راستہ پوچھ لیا تھا۔ قیامت تو یہ ہے کہ آج بھی جو یہ آواز دیتا ہے کہ بابا! وہ صحیح راستہ اس گائیڈ بک [3] کے اندر ہے‘ یہ دیکھو لکھا ہوا ہے‘ یہ پنجے جھاڑ کے اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ انہیں تو صحیح راستے سے بیر ہو گیا ہے۔ میں نے بتایا ہے کہ یہ جو کہا ہے کہ **فَاسْتَجَابَ لَهُمْ** (3:195) تم نے پکارا‘ ہم نے جواب دیا۔ ہم نے جواب میں کیا کہا؟ جواب میں ہم نے یہ کہا کہ ہم کسی کا صحیح کام بے نتیجہ نہیں رہنے دیا کرتے۔

---

[1] یاد رہے یہ بات اکتوبر 1978ء کی 13 تاریخ کو کہی گئی تھی جب ابھی اس کے حصے بخرے نہیں ہوئے تھے۔

[2] پھر تو پہنچ ہی جائیں گے۔

[3] اس گائیڈ بک سے مراد قرآنِ کریم ہے۔

## فرعون کے مقابلے کے لیے حضرت موسیٰؑ کی خدا سے پکار

عزیزانِ من! یہ بات میری اور آپ ہی کی نہیں۔ انبیائے کرامؑ کا معاملہ تو خدا کے ساتھ بالکل الگ ہوتا تھا۔ جہاں تک وحی کا تعلق ہے، نبوت کا تعلق ہے، غیرِ نبی یہ کسی طرح سمجھ بھی نہیں سکتا کہ وہ ہوتا کیسے تھا۔ وہ نبی کی اور خدا کی خصوصیت کبریٰ تھی، وہ انفرادیت تھی، ہم نہیں جان سکتے۔ جہاں تک دعاؤں کا تعلق ہے، آپ اندازہ لگائیے کہ حضرتِ موسیٰؑ کو حکم دیا گیا کہ جاؤ فرعون [1] کی طرف، وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے۔ آج بھی دو اڑھائی ہزار سال کے بعد ذہن میں فرعون کا نام آتا ہے تو استبداد کا مجسمہ سامنے آ جاتا ہے۔ ان سے کہا کہ جاؤ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے، اس کی سرکشی جا کر ختم کرو۔ وہ تھرتھرائے، وہ وہاں سے یعنی مصر سے بھاگے ہوئے تھے، وہ گڈریئے تھے، بھیڑیں چرانے والے تھے:

ذرہ نا چیز و تعمیرِ بیابانے نگر!

قرآن نے کہا کہ حضرت موسیٰؑ نے کچھ مانگا کہ اس کے لیے مدد ہونی چاہیے، کہ میرا بھائی ساتھ ہو جائے، وہاں یہ کچھ ہو جائے، یہاں یہ کچھ ہو جائے۔ **قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا** (10:89)۔ کہا کہ جاؤ، ہم نے تمہاری دعائیں قبول کر لیں۔ میں نے جیسے کہا ہے کہ کیا پھر راوی عیش لکھتا ہے؟ کہا کہ نہیں، ایسا نہیں، خدا اپنے دونبیوں سے کہہ رہا ہے کہ **قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا** (10:89)۔ بالکل یقین کے ساتھ یہ بات کہی کہ ہم نے تمہاری دعائیں قبول کر لیں۔ لفظ وہی آ رہا ہے، وہ اپنے لفظ سے اِدھر اُدھر نہیں ہٹتا تو میں نے کہا ہے کہ اس کے بعد تو یہی ہونا چاہیے تھا کہ موسیٰؑ کہتے کہ آپ کا شکریہ اور اپنی بھڑیں لے کر چل پڑتے کہ وہ بات تو اس نے کہہ دیا ہے کہ ہو ہی گئی ہے۔

## حضرتِ موسیٰؑ کی دعا کی قبولیت کو مشروط کر دیا گیا

اب یہاں ایک لفظ ہے کہ **فَاسْتَقِيْمَا** (10:89) جو پروگرام دیا ہے اس پہ جم کے کھڑے ہو جانا، کہیں اِدھر اُدھر سرکنا نہیں۔ دعائیں قبول ہو گئی ہیں۔ سوچیے کہ اس نے کیا کہا۔ کہا یہ کہ جو تم کہتے ہو کہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ ہمیں کامیابی ہو، فرعون کو شکست ہو، یہ بالکل ٹھیک ہے، ایسے ہی ہو گا، تم سے ہم کہہ رہے ہیں بشرطیکہ اس پروگرام کے اوپر جم کے کھڑے ہو جاؤ۔ خدا کے دو نبی ہیں اور ان کی دعا کے جواب میں ان سے یہ کہا جا رہا ہے **قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا** (10:89)۔ کیا بات ہے! دونبیوں سے کہا جا رہا ہے کہ اتنی سی بات ہی ہے کہ **فَاسْتَقِيْمَا** (10:89) اس پروگرام پر جم کر کھڑے ہو جاؤ۔

---

[1] فرعون کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ بنی اسرائیل، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2004ء، ص 109 کا فٹ نوٹ 1۔

## خدا تعالیٰ کی طرف سے دی گئی رہنمائی کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ہوگا

اور اگلی بات سن لو کہ وَ لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِیۡلَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ (10:89) یہ وہی راستے کی بات ہے کہ اس پہ تو جم کے کھڑے ہو جانا اور راستے میں اگر کوئی بھی تمہیں کسی طرح بہکائے تو کسی کے بہکاوے میں نہ آنا' یہی راستہ صحیح ہے اسی پر چلتے جانا۔ بہت سے کہنے والے آئیں گے کہ نہیں جی' فلاں حضرت صاحب نے یہ فرمایا ہے' اس کے مطابق کرو اور فلاں مولوی صاحب نے یہ کہا ہے۔ آپ کسی کی بات نہ ماننا۔ یہ کچھ نبیوں سے کہا جا رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ دعا قبول ہوگئی اور اس کے بعد یہ کچھ کہا جا رہا ہے۔ یہ تو بڑی اہم بات ہے کہ انبیائے کرامؑ کے ساتھ دعاؤں کا بھی جو معاملہ ہے اس میں خدا کیا کرتا ہے۔ اس کے لیے دو ایک ریفرنس اور دیکھ لیجیے۔ یہاں بھی پہلے وہی ہے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ ہو جائے' یہ ہو جائے۔ ٹھیک ہے: قَالَ قَدۡ اُوۡتِیۡتَ سُؤۡلَکَ یٰمُوۡسٰی (20:36)۔ یہاں ''سؤلک'' آیا ہے۔ اس کے معنی تمہارا سوال تمہاری احتیاج ہوتا ہے۔ ہم نے بات پوری کر دی ہے یعنی جو تم نے مانگا' ہم نے دے دیا' اب اِذۡهَبۡ اَنۡتَ وَ اَخُوۡکَ بِاٰیٰتِیۡ (20:42) تُو اور تیرا بھائی یہ قوانین لے کر فرعون کی طرف جاؤ۔ وہاں یہ کہا ہے کہ ہم نے وہ پورا کر دیا جو تم نے مانگا تھا اور یہ کہا ہے کہ یاد رکھو! وَ لَا تَنِیَا فِیۡ ذِکۡرِیۡ (20:42) اس قانون کے مطابق عمل کرنے میں کہیں سست نہ پڑ جانا۔ نبی سے کہا جا رہا ہے کہ ہم نے تمہاری مانگ پوری کر دی۔ اب تم اس پہ جم کے چلے جانا' کسی دوسرے راستے کے اوپر نہ پڑ جانا' کسی کی بات نہ سننا اور اس پروگرام میں کہیں کوئی سستی نہ دکھا دینا۔

## حضرت نوحؑ کی پکار اور خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب

عزیزانِ من! ایک ریفرنس اور لے لیجیے۔ حضرت نوحؑ کی پوری داستان پیچھے سے چلی آ رہی ہے۔ انہوں نے بھی یہ ساری پریشانیاں' تزاحمات اور تصادمات جو کشمکشیں سامنے آ رہی تھیں' ان کو بیان کیا ہے' اپنی Difficulties (مشکلات) بھی بتائی ہیں۔ وَ لَقَدۡ نَادٰىنَا نُوۡحٌ (37:75)۔ نوحؑ نے پھر ہمیں آواز دی۔ یہاں نداء ہی کا لفظ ہے: فَلَنِعۡمَ الۡمُجِیۡبُوۡنَ (37:75) ہم نے اس کی آواز کا جواب دیا اور ہم سب سے بہتر جواب دینے والے ہیں۔ ٹھیک ہے جواب تو تمہیں کئی طرف سے آئے گا۔ سب سے بہتر جواب دینے والے ہم ہیں۔ اس نے پکارا اور جواب دیا۔ اس سے بڑا اور کیا ہوگا کہ پکارنے والا اس قسم کا پیغمبر ہے' اس نے آواز دی اور کہا کہ ہم نے اس کا جواب دیا' ہم نے دعا قبول کی اور ہم بہترین دعا قبول کرنے والے ہیں' ہم سب سے بہتر جواب دینے والے ہیں۔ تو ٹھیک ہے یہ ہو گیا۔ اطمینان سے اب ان کو بیٹھ جانا چاہیے۔

اب آگے ہونے والا کیا تھا؟ ایک طوفان آنے والا تھا۔ سنیے کہ ادھر سے کیا جواب ملا؟ فَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡهِ اَنِ اصۡنَعِ الۡفُلۡکَ

بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا (23:27) ہم نے اس سے کہا کہ تمہیں خود یہ نہیں آتا کہ سیلاب آئے' پانی آئے تو اس سے کیسے بچنا چاہیے۔ جیسے ہم کہتے ہیں' ہماری وحی کے مطابق' ہماری زیرنگرانی' کشتی بناؤ۔ یہ دعا قبول ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دور وہ تھا کہ ابھی یہ بھی انسان کو نہیں آتا تھا کہ خود کشتی (Boat) کیسے بنائی جائے' یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اتنا بڑا طوفان آیا تو بچیں گے کیسے؟ حل نہیں مل رہا تھا۔ اس نے ہم سے یہ کہا اور ہم نے جواب دیا۔ جواب یہ دیا کہ کشتی بناؤ' تمہیں بنانا نہیں آتا' ہم بتاتے ہیں کہ کیسے بنایا کرتے ہیں۔ بناتے جاؤ کیونکہ پہلی کشتی بن رہی ہے۔ اس کے لیے قرآنِ کریم کے یہ الفاظ ہیں بِاَعْیُنِنَا (23:27)۔ ہم دیکھتے بھی جائیں گے کہیں تم غلطی تو نہیں کر رہے۔ دعا نبی کی قبول ہو رہی ہے اور کہا ہے کہ ہم سب سے بہتر دعا قبول کرنے والے ہیں۔ سب سے بہتر دعائیں قبول کرنے والا جو ہے وہ کہتا ہے کہ کشتی بناؤ۔ جی نہیں آتی۔ کہا کہ ہم بتاتے ہیں۔

عزیزانِ من! یہ ہوتا ہے دعا کے قبول ہونے سے۔ پرابلم کا حل بتا دیا جاتا ہے' راستے کی راہنمائی کر دی جاتی ہے۔ طوفان آ رہا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ کہا: ہم بتاتے ہیں۔ دعا قبول ہو رہی ہے۔ مجھے جلدی آگے بڑھنا چاہیے۔ یہ سارا کچھ تو ہم نے یونہی کر دیا ہے اور اگر کہیں آپ کے ہاں کے معاشرے کا نظام غلط ہو' فضا ہی ساری غیر قرآنی ہو گئی ہو' تو اس میں تو صحیح حل کو چلنے ہی نہیں دیتے۔ قانون تھا جس کے مطابق کچھ کرنے سے وہ کہتا تھا کہ یہ ہو۔ اور جو کوئی قانون ہی پہ چلنے نہ دے۔ عزیزانِ من! یہ ساری مصیبتیں اس دور میں آتی ہیں کہ قانون پہلے تو غلط ہو اور جو قانون کے مطابق چلنا چاہے تو قانون کے مطابق چل نہ سکے۔ قانون کے مطابق کوئی کام ہی نہ ہو۔ مثال یہ لیجیے کہ ٹھیک ہے تشخیص بھی صحیح ہوتی ہے۔

## جس معاشرے میں رہنمائی بھی ملاوٹ والی ہو تو پھر کوئی کیا کرے!!

ڈاکٹر نے نسخہ بھی صحیح لکھا ہے' مگر وہاں سے دوائی ملاوٹ والی مل رہی ہے تو وہاں قانون کیا کرے گا۔ ہر قلب مضطرب ہوتا ہے کہ جب وہ دیکھے کہ سیدھے طریقے سے یہاں کوئی کام ہی نہیں ہو رہا' قدم قدم پہ Flection (خمیدگی) ہوتی ہے' ایسے معاشرے میں جہاں قانون اور ضابطے کے مطابق گاڑی نہ چل سکے' وہاں ان کی موج ہوتی ہے' جو اپنے طریقے پہ' سرکشی پہ' کچھ کریں۔ وہ صحیح راستے کے مطابق نہیں کر سکتے۔ صحیح راستے کے اوپر چلنے والا قدم قدم پہ ناکام ہوتا ہے' ماتھا پکڑ کے رہ جاتا ہے۔ وہاں یہ پوچھتا ہے کہ اب میں اس کا کیا علاج کروں۔ بات تو یہی بتائی گئی تھی کہ قانون کے مطابق کرو تو یہ کچھ ہو گا اور وہ آ کر کہے کہ قانون کے مطابق یہاں کوئی چلنے ہی نہیں دیتا' وہ کاغذ ایک دوسری میز تک نہیں پہنچتا جب تک اس کے نیچے چاندی یا سونے کے پہیے نہ لگائے گئے ہوں۔ جب تک خلافِ قانون نہ کرو' وہاں کوئی چلنے ہی نہیں دیتا۔ قانون والا قدم قدم کے اوپر پٹتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ قرآن نے اس کے متعلق بھی کچھ بتایا

ہے۔ نہ بتانے والا تھا تو فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ (37:75)۔ کیسے کہتا کہ ہم ہیں بہترین راستہ بتانے والے۔ عزیزانِ من! اسی آیت کے اوپر جایئے اور جھوم جایئے۔ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ (27:62)۔ کون ہے جو قلبِ مضطر کی ان پریشانیوں کو سن کر ان کا جواب دیتا ہے اور اس کے بعد ان پریشانیوں کو دور کرتا ہے؟ کہا کہ پھر جب ایسا معاشرہ ہو جائے جس میں قاعدے قانوں اور دیانت و امانت کے مطابق وہ بیچارہ چلنے والا قدم قدم پہ پھٹکار کھائے' تو کہا کہ ہمیں بتاؤ کہ ایسے معاشرے میں کیا کریں۔

## اس قسم کے حالات میں ملک کا اقتدار صحیح ہاتھوں میں دینا ہوگا

عزیزانِ من! دو الفاظ ہیں' ہزار بار آپ نے پڑھے ہوں گے مگر توجہ نہیں گئی۔ وہ الفاظ ہیں: وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ (27:62)۔ ملک کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دو جو قانون کے مطابق چلنے والے ہوں۔ یہ اسے کہنا جچتا ہے جو کہے کہ ہم ہیں بہترین جواب دینے والے۔ وہ مسئلہ جس کا بظاہر حل نظر نہیں آتا تھا' ایک سیکنڈ پہلے یہ بات سامنے نہ آتی' تو ہمارے ذہن میں نہیں آتا تھا کہ اس کا وہاں سے کیا جواب ملے گا۔ کہا کہ یہ جواب اب انفرادی نہیں ہے۔ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ [1] (27:62)۔ اور یہ خلافت کیسی ہوگی' یہ حکومت کیسی ہوگی؟ کہا کہ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ (27:63) جس میں تم یہ کہہ سکو کہ خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں' جس میں اقتدار اس کی کتاب کو ہوگا جس میں تمہاری ہر مشکل کا حل بتا دیا ہوا ہے۔ اس کو تم اپنے ہاں کا قانون بناؤ۔ یہ ہے جو آپ کو حل بتائے گی۔ اس معاشرے کے اندر جو رہنے والے ہیں ان کو بھی یہ ان کی ہر مشکل کا حل بتائے گی۔ اور یہیں نہیں باہر بھی جو آواز دیں گے ان کا حل بھی یہ بتائے گی۔

پہلے میں باہر والوں کی بات کرتا ہوں۔ ہمارے صدرِ اول میں مکے میں جو مصیبتیں آئیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ ہجرت کر کے کچھ حصہ مدینے چلا گیا' وہاں جا کر انہوں نے اپنی مملکت قائم کی' وہی جو خلافت کہا گیا ہے تو اسے وہاں جا کے قائم کیا۔ حالات بھی ناسازگار تھے' مکہ میں کچھ لوگ رہ گئے تھے۔ وہاں مکے کے مخالفین کو جو شکست کھاتے تھے' تو وہ یہاں مکے میں ان لوگوں کو تنگ کرتے تھے۔ کیوں نہ کریں! یہ تو غنیمت ہے کہ ہم ان ہندوؤں کے چنگل سے بچ گئے اور یہاں پاکستان میں آ گئے۔ وہ جو وہاں ہندوستان میں پھنسے ہوئے ہیں' آئے دن ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے' اس کی کچھ خبریں ہم تک آ رہی ہیں۔ وہاں ہو کیا رہا ہے؟ اس کے متعلق بابا کی کتاب پڑھنی تھی جو ہمارے ہاں آ گئی تھی۔ ''وہ آواز جو حلق سے اوپر نہیں ابھرتی'' یہ اس کتاب کا عنوان تھا۔ حلقوں میں اٹکی ہوئی آوازیں۔ وہاں یہ کیفیت گزر

---

[1] اور اس طرح تمہیں حکومت عطا کر دیتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔875)۔

رہی تھی کہ وہ خدا کو مدد کے لیے پکار رہے تھے۔ وہ خدا جو کہتا ہے کہ ہم تمہارے قریب ہیں' سنتے ہیں تمہاری آواز کو' جواب بھی دیتے ہیں۔

## مکے والوں کی مشکلات کے متعلق مدینے والوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے

عزیزانِ من! توجہ سے سنیے گا۔ یہ بڑی اہم چیز ہے کہ کس طرح سے ایسا معاملہ جب آ کے پڑ جائے تو کیا کیا جائے؟ جیسا میں نے ابھی کہا ہے کہ غلط نظام ہو اس کے اندر سے آوازیں دینے والے آوازیں دے رہے ہوں تو کیا کیا جائے؟۔ کہا تھا کہ اپنی مملکت قائم کرو جس میں خدا کا اقتدار ہو۔ مکے والے خدا کو براہِ راست پکار رہے ہیں' انہیں کچھ کہنے کے بجائے خدا مدینے والوں کو یہ کہہ رہا ہے' جن کو کہا تھا کہ ہم نے تمہیں خلافت دے دی۔ یہ مملکت قائم ہوگئی۔ کہا کہ **وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا**(4:75)۔ اومدینے کی مملکت والو! سنتے نہیں ہو کہ مکے کے مظلوم ہمیں پکار رہے ہیں' تم مدد کے لیے اٹھتے کیوں نہیں ہو۔

## انسانوں کی دنیا میں خدا کی حکومت انسانوں کے ہاتھوں ہی تشکیل پاتی ہے

عزیزانِ من! کیا کسی تفسیر کی ضرورت یا کسی تاویل کی ضرورت ہے؟ الفاظ بتا رہے ہیں کہ مکے کے مظلوم ہمیں پکار رہے ہیں' تم سنتے نہیں ہو۔ انسانوں کی دنیا میں خدا براہِ راست آ کر کچھ نہیں کیا کرتا۔ وہ یہاں انسانوں کے ہاتھوں سے ہی اپنی ذمہ داریاں پوری کراتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ان چیزوں کو ہزار بار پڑھیے۔ **یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا** (4:75)۔ وہ مظلوم ہمیں پکار رہے ہیں کہ باری تعالیٰ کچھ ہمارا انتظام کر' کچھ مدد ہماری کر' ہمیں یہاں ان ظالموں کے ہاتھ سے نکال ہی دے۔ وہ مدینے کے اس مملکت والوں سے کہہ رہا ہے کہ سنتے نہیں ہو' وہ ہمیں پکار رہے ہیں۔ کہا کہ **مَا لَكُمْ** (4:75) ''اوئے تہانوں کی ہو گیا اے؟ [1] یعنی او تمہیں کیا ہو گیا ہے' بہرے بن رہے ہو' سنتے نہیں ہو۔ کہہ سکتے تھے کہ صاحب! سنیں کیا وہ ہمیں تو نہیں پکار رہے۔ کہا: سنتے نہیں ہو' وہ ہمیں پکار رہے ہیں' اور تم مست ہو کر بیٹھے ہوئے ہو۔ اٹھتے کیوں نہیں ہو؟ اٹھو اور میدانِ جنگ میں پہنچو' دشمنوں کے ہاتھوں سے ان کی حفاظت کرو' یہاں نکال کر لے آؤ۔ سنتے نہیں ہو وہ ہمیں پکار رہے ہیں۔ سن لیا کہ جو خدا سے دعا کرنے والے ہیں وہ خدا کو پکارتے ہیں ور وہ خدا آگے سے کیا کہتا ہے؟ جب کہیں کا نظام خراب ہو جائے تو اس کا علاج یہ ہے کہ پہلے تو یہ کہا کہ نظام کو بدل کر وہ کرو جس میں اقتدار صرف خدا کے ہاتھ میں ہو اور اس کے بعد پھر دنیا میں کہیں کوئی مظلوم خدا کو پکارے تو تم مدد کو پہنچو کیونکہ تم نے خدا کے نام پہ مملکت حاصل کی ہوئی ہے۔ وہاں یہی نہیں ہے کہ مسلمان پکارے تو اس کی آواز کو پہنچو' وہاں تو الناس کہا ہے۔ کہیں سے مظلوم کی آواز آئے' وہ خدا کو پکارے' خدا ان سے کہے کہ سنتے

---

[1] ابے! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

نہیں ہو، وہ ہمیں پکار رہا ہے۔ اور اس کی تفسیر سننا چاہتے ہو تو ایک لفظ میں سن لو۔

## نبی اکرم ؐ کے دور کی مملکت کی تعمیر حضرت عمرؓ کے عہد میں تکمیل تک جا پہنچی تھی

حضرت عمر (581-644/45AD) جن کے عہد (634-644/45ء) میں یہ خلافت اس نقشے پہ تکمیل تک پہنچی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ابتدا کی تھی، حضرتِ صدیق اکبرؓ (632-634ء) عبوری دور (Interim Period) میں سے گزرے تھے۔ یہاں جب تکمیل پہ پہنچی تو ان ❶ سے پوچھا گیا کہ آپ جو اِس طرح سے خلیفہ بنے ہیں یا مملک کے سربراہ بنے ہیں، آپ کا منصب اور آپ کا فریضہ کیا ہے؟ ڈیوٹی کیا ہے؟

## مملکت اسلامیہ یا قرآنی حکومت میں سربراہِ مملکت کا فریضہ

عزیزانِ من! بڑی توجہ سے سنیے گا۔ جب کہا تھا تو اس زمانے میں ہی انہوں نے پوچھ لیا تھا کہ بات ذرا مشکل سی ہے، سمجھ میں نہیں آئی۔ آج بھی مشکل نظر آئے گی۔ کہا کہ آپ کا فریضہ کیا ہے، ذمہ داری کیا ہے؟ کہنے لگے کہ میرا فریضہ یہ ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک نہ پہنچنے دوں۔ پوچھا نہیں گیا تو خود ہی بتایا کہ کیوں؟ کہا کہ تم اس وقت خدا تک پہنچانے کے لیے دعا کرو گے جب تمہارا کوئی کام یہاں رک جائے گا۔ مجھ تک اگر شکایت پہنچی اور تمہارا کام ہو جائے تو پھر ''خدا نوں تکلیف دین دی کی لوڑ اے تہانوں'' ❷ میرا فریضہ یہ ہے۔ عزیزانِ من! سوچیے کہ جن کی تعلیم خود رسول اللہ صلی الہ اعلیہ وسلم کے دستِ مبارک سے ہوئی تھی وہ ان چیزوں کو کتنا سمجھے تھے۔ میرا فریضہ یہ ہے کہ ''میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک نہ پہنچنے دوں۔''

## ''اور اگر آپ نے خدا سے دعا کی تو یہ خدا کے ہاں میری شکایت ہوگی''

دعا تم اُس وقت کرتے ہو جب تمہارا کوئی کام رک جاتا ہے۔ خدا کو اِس لیے پکارتے ہو کہ یہاں کوئی تمہاری مشکل کا حل کرنے والا نہیں ہے۔ مجھے اُس نے یہاں بٹھا دیا ہے کہ تمہاری ہر شکایت جو مجھ تک پہنچے، میں اُس کا حل کر دوں۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو اور دعا خدا تک پہنچے تو وہ تو میری شکایت ہوگی، پھر مجھے حق نہیں ہے کہ اُس کے نام کے اوپر سربراہِ مملکت بنوں، مجھے اس سے الگ ہو جانا چاہیے۔ وہ تو میری شکایت ہو جائے گی خدا کے حضور کہ جی! میرا یہ کام نہیں ہوا۔ وہ مجھ سے پوچھے گا کہ تمہیں کس کام کے لیے یہاں بٹھایا ہوا ہے۔ عزیزانِ من! ایک فقرہ ہے اور قیامت تک اس فقرے کا جواب نہیں ہے۔ خدا کے نام پہ مملکت قائم کرنے والے جو ہیں اُن کا فریضہ یہ ہے کہ وہ کسی کی دعا کو

---

❶ مراد ہے حضرت عمر فاروقؓ (581-64/45AD ء)

❷ تو پھر خدا کو تمہیں تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے۔

خدا تک نہ پہنچنے دیں۔ یہ یَجۡعَلُکُمۡ خُلَفَآءَ الۡاَرۡضِ (27:62) کی تفسیر ہے۔ عزیزانِ من! اِسے کہتے ہیں نظامِ خداوندی' اِسے کہتے ہیں نظامِ مصطفیٰ کہ کسی کو خدا کے پاس اپنی مصیبت کے حل کے لیے دعا کی ضرورت ہی نہ رہے۔ کہا کہ وہ میری شکایت ہو جائے گی کہ یا اللہ! مجھ پہ یہ مصیبت پڑی ہے اُس کا حل نہیں ملتا۔ تو کیا وہ شکایت وہاں پہنچنے دونگا۔ اور کیسے سمجھے ہوئے تھے اس دور کے لوگ قرآن کو!

## حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں سربراہ مملکت کی ذمہ داریوں کا احساس

آپ شام سے واپس آ رہے تھے تو قاعدہ تھا کہ وہ [1] رات کے وقت دور دور نکل جاتے تھے اور براہِ راست لوگوں کی باتیں سنا کرتے تھے کہ کس کو کیا مصیبت ہے۔ ایک جھگی سی تھی' ٹینٹ میں کوئی عورت تھی: اکیلی بڑھیا سی۔ اُس سے جا کے پوچھا کہ مائی! کیا حال ہے' ٹھیک ہے؟ کہا کہ کوئی تکلیف یا کوئی شکایت ہے۔ کہنے لگی کہ اول تو تمہیں پوچھنے [1] کا حق نہیں ہے اور ہو بھی تو میں تمہیں کیوں بتاؤں جس کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے معاشرے کے ہر فرد کی شکایت کا حل کرے جب اُس نے یہ معلوم نہیں کیا تو میں تمہیں کیوں بتاؤں اور تم کون ہو پوچھنے والے؟

## ہر فردِ مملکت کی خبر گیری اور ذکر کا مفہوم

حضرت عمر فاروقؓ نے کہا کہ مائی! تم نے اپنی شکایت اُس تک پہنچائی۔ مسکرائی اور کہنے لگی کہ اُس خدا کے نام کے اوپر وہ مملکت قائم کرتا ہے' سربراہ بنتا ہے جس نے اپنے آپ کو خبیر کہا ہے' خبر رکھنے والا' اگر یہ سربراہ ہر فردِ مملکت کے حالات کی خبر نہیں رکھتا تو اس کو خدا کے نام پہ مملکت قائم رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اُسے خبیر ہونا چاہیے۔ آپؓ رویا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ مجھے اس نے سمجھایا ہے کہ میری ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اسی لیے شہادت کے وقت یہ کہا تھا کہ اے کاش! عمر خلیفہ ہونے کی بجائے گھاس کا یہ تنکا ہوتا تو وہاں باز پرس تو نہ ہوتی' پتہ نہیں میری کون کون سی چیزیں رہ گئی ہیں۔ یَجۡعَلُکُمۡ خُلَفَآءَ الۡاَرۡضِ (27:62) یہ ہے۔ اب یہ بات جو رہی کہ ہم نے یہی تو پوچھنا ہے۔ قرآن میں اِس کے لیے ذکر کا لفظ کہا ہے کہ بار بار اِس کو سامنے لاؤ۔ ذکر کے معنی ہیں ''کسی چیز کو سامنے لانا' بار بار دہرانا''۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ چیز کہ صحیح راستہ مجھے مل جائے' غلط راستے پہ میں نہ چلوں۔ یہ کیا چیز ہے؟ اقبالؒ (1877-1938) نے بچوں کے لیے وہ نظم کہی ہے' وہ بڑا گہرا فلسفہ ہے:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری [2]

---

[1] اس سے اشارہ حضرت عمر فاروقؓ کی طرف ہے۔

[2] زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری۔ (اقبال)

## انسان کی اپنی تمنا کا نام ہی دعا ہے جس کی قبولیت کا طریق قرآن حکیم بتاتا ہے

دل میں ایک تمنا پیدا ہوتی ہے جب وہ زبان پہ آتی ہے تو اُسے دعا کہتے ہیں۔ دل میں ایک آرزو پیدا ہوتی ہے۔ آپ کی اس آرزو کی جتنی اہمیت ہوتی ہے، اتنی ہی وہ شدت سے پیدا ہوتی ہے۔ اُس کا خیال اُس شدت سے آپ کے ذہن کے اندر بار بار آتا ہے۔ میں نے جیسا کہ اپنی کتاب ''ابلیس و آدم'' [1] میں لکھا ہے کہ جسے آپ دعا کہتے ہیں وہ حقیقت میں شدتِ آرزو کا نام ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ یہ جو آرزوئیں ہوتی ہیں، تمنائیں ہوتی ہیں، ان سے دلوں میں مقاصد ابھرتے ہیں، یہ دراصل مدعا ہوتے ہیں، ہمارے اس دور کی اصطلاح میں اسے نفسیاتی کیفیت [2] یا Psychological Condition کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو اِس کے لیے دل ہی ایک لفظ ہے۔ انہوں نے اِس کے لیے ایک لفظ Psyche وضع کیا ہے۔ یہ نفسیاتی طور پہ تغیر ہوتا ہے۔ اگر کسی چیز کی آرزو کو دل کے اندر Repeat (اعادہ) کرتے چلے جائیں بار بار اس کو دہراتے چلے جائیں، تو اس سے ایک نفسیاتی تغیر پیدا ہوتا ہے، اندر ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ بات ٹھیک ہے۔ اگر کسی کام کی ویسے اہمیت نہ ہو، اور آپ کسی کام کو اپنے سامنے بطور مقصد، بطور نصب العین، رکھ کر بار بار اُسے دہراتے چلے جائیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کے اندر اُس سے ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہے، اس سے ایک قوت بیدار ہوتی ہے۔ اس سے اور قوتیں مجتمع ہوتی ہیں، قرآن کہتا ہے کہ **اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ** (11:13) یہ اصول یاد رکھو کہ ہم کسی قوم کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں کرتے، جب تک وہ آپ خود نہیں کرسکتی۔ کہا یہ ہے کہ ہم بھی اس میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے تاوقتیکہ وہ قوم اپنی نفسیات میں تغیر نہ پیدا کرلے، پہلے وہ اپنے اندر ایک تبدیلی پیدا کرے گی تو اُس کے مطابق باہر کی دنیا کے اندر تغیر واقع ہوگا:

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں دنیا میرا دل ہے
بدل جانے سے اِس کے رنگ ہر ایک چیز کا بدلا [3]

---

[1] پرویزؒ: ابلیس و آدم، ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور، 1983ء، ص ص۔ 285 تا 286

[2] دعا کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: کتاب التقدیر، ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)، لاہور، 1986ء، ص ص۔ 359 تا 390۔

[3] پرویزؒ: کتاب التقدیر، ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)، لاہور، 1986ء، ص۔ 380۔ اسی موضوع پر بیدل یہ کہتا ہے:

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو وسمن درا — تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درا

یعنی: نہ کلی ہے وجہ نظر کشی، نہ کنول کے پھول میں تازگی — فقط ایک دل کی شگفتگی، سببِ نشاطِ بہار ہے

## دل کی آرزو کا رنگ بدلے بغیر باہر کی دنیا کا رنگ بدل ہی نہیں سکتا

تغیرِ نفس سے باہر کی دنیا بدل جاتی ہے‘ اقدار بدل جاتی ہیں‘ چیزوں کی قیمتیں بدل جاتی ہیں‘ انسانوں کے متعلق تصورات بدل جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ قوموں کی حالت کی تبدیلی تغیرِ نفس پہ منحصر ہے۔ اور یہ جس کا نام میں نے کہا ہے‘ اب آپ اسے دعا کہہ لیجیے‘ تو وہ یہ ہے کہ اُس آرزو کا بیدار ہو جانا اور آرزو کا شدت اختیار کرتے چلے جانا۔ اِس سے نفسیاتی تغیر واقع ہوتا ہے۔ اور جب افراد کے اندر یہ چیز پیدا ہو جاتی ہے‘ وہ شدت اختیار کر جاتی ہے تو ان کے اندر بڑی قوتیں آ جاتی ہیں جن کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس چیز کے متعلق اقبالؒ (1877-1938) نے جو کچھ کہا ہے‘ وہ بڑی عظیم چیز ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا دعا سے قضا بدل سکتی ہے یا نہیں؟ یعنی خدا نے جو حکم دیا ہے‘ کیا وہ بدل سکتا ہے یا نہیں؟ جو ہونا ہے کیا وہ بدل سکتا ہے یا نہیں؟ تو وہ کہنے لگے کہ یہ سوال ہی نہیں ہے:

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اِس سے یہ ممکن کہ تُو بدل جائے

## آرزو کا رنگ تو قرآن حکیم قدم قدم پر انسان کو بتاتا ہے

قرآن کہتا ہے کہ جب تُو بدل جائے تو پھر اس کے بعد باہر کی دنیا بدل جاتی ہے۔ شدتِ آرزو یہ ہے۔ اور جب قرآن سے پوچھ لیں کہ میری آرزو کیا ہونی چاہیے‘ تو پہلی چیز یعنی دعا کا پہلا حصہ تو یہ ہو گیا کہ خود وہ آرزو ہی کہیں غلط نہ ہو۔ یہ غلط آرزوؤں کی شدتیں ہیں جو دنیا کے اندر فسادات برپا کر رہی ہیں۔ اگر صحیح آرزوئیں ہوں تو دیکھیے کتنے تعمیری کام ہو جاتے ہیں۔ یہ آرزو کا بدل جانا ہے:

تری دُعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دُعا ہے تری آرزو بدل جائے! [1]

قرآن کریم سے آرزو کا تعین تو کیجیے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ **وما تشآء ون الا ان یشآء اللہ** (81:29)۔ کیا بات ہے مومنوں کے متعلق جو اُس نے کہا ہے! کہیں وقت [2] آئے گا تو بتاؤں گا کہ اِس آیت کے غلط ترجمے نے پتہ نہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ کہا کہ یہ ’’وہ ہیں جو اپنی آرزو اور خواہش کو ہماری مشیّت سے ہم آہنگ کر لیتے ہیں۔‘‘

---

[1] اقبالؒ: ضربِ کلیم‘ نیشنل بک فاؤنڈیشن‘ اسلام آباد‘ 1996ء‘ ص 186۔

[2] اس کی تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 مکمل‘ ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)‘ لاہور‘ 2006‘ ص ص۔ 252 تا 254 نیز ص۔ 252 کا فٹ نوٹ 1۔

## شدت آرزو انسان کی مخفی قوتوں کو بیدار کرنے کا بہترین ذریعہ ہے

آرزو کا تعین پہلے ہونا چاہیے کہ آیا جو اُس نے کہا ہے صحیح ہے۔ اگر وہ صحیح ہے تو پھر اُس کی آرزو پیدا ہو' پھر اُس آرزو میں شدت پیدا کرتے چلے جاؤ' اُس کے بعد تمہاری مخفی قوتیں بیدار ہو جائیں گی۔ اور جھوم جایئے عربوں کی زبان کے اوپر اور اُن کے تصورات پہ بھی!

## شدتِ آرزو کا پیدا ہونا ہی زندگی کا نشان ہے

عزیزانِ من! جنہیں ساری دنیا کہتی ہے کہ وہ قوم اس دور میں پیدا ہوئی جو ساری دنیا میں سب سے زیادہ تاریک ترین دور تھا' وہ قوم جاہل ترین تھی لیکن کیا پوچھتے ہو کہ وہ کیا قوم تھی! میں نے کہا ہے کہ یہ جسے دعا کہا جاتا ہے' یہ مخفی پوشیدہ قوتیں انسان کے اندر ہی رکھی ہوئی ہوتی ہیں' باہر کی بات نہیں ہوتی۔ اگر آرزو پیدا نہ ہو تو ساری قوتیں سو جاتی ہیں۔ پیدا ہوا اور کمزوری سی ہو تو وہ ذرا سی یونہی کروٹ سی لیتی ہیں۔ شدت اختیار کر جائیں تو وہ ساری قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ یہ عرب یہ کیا کرتے تھے۔ دودھ دوہتے تھے۔ پتہ نہیں یہ دودھ دوہنے والے اب بھی ایسا کرتے ہیں یا نہیں۔ یہ دودھ دوہتے تھے' تھوڑا تھوڑا سا دودھ ابھی باقی ہوتا تھا تو چھوڑ دیتے تھے۔ یہ جو تھنوں کے اندر یا اُس کے ہوا[1] نے میں تھوڑا سا دودھ چھوڑا جاتا تھا' وہ اُس میں ذرا ذرا سا کچھ تحرک پیدا کرتا تھا' تلملاہٹ سی ذرا پیدا کرتا تھا۔ وہ ایک مادہ تھا جسے باہر نکلنا تھا وہ اندر رکھا ہوا ہوتا تھا' تو وہ یہ تحرک پیدا کرتا رہتا تھا۔ اور یہ کرنے سے وہ جو اندر دودھ چھپایا ہوا ہوتا تھا وہ ان کے اس کرنے سے نیچے اترتا تھا۔ یہ جو ذرا ذرا سا' خفیف سا' جذبہ ہے اس میں خزانہ پوشیدہ رکھا ہوا ہے' اس کو اِس طرح سے انگیخت کرے کہ وہ دودھ اُترنا شروع ہو جائے تو دعا سے وہ اسے الداعیہ کہتے تھے۔ یعنی یہ ہے تحرک پیدا کرنے والی چیز۔ پھر سن لیجیے کہ صحیح آرزو کا تعین قرآن کی رو سے کیا جائے کہ میری آرزو کیا ہونی چاہیے۔ پھر آرزو کی شدت کے لیے اُس کو دہرانا چاہیے' بار بار سامنے رکھنا چاہیے' اس کی اہمیت سامنے ہونی چاہیے۔ یہ جو شدت ہوگی تو یہ تمہارے ہاں کی جو اندر خفتہ (Dormant) قوتیں ہیں' وہ اُن کو بیدار کر دے گی' اُن میں تحریک پیدا کر دے گی۔ جب اندر یہ تغیر واقع ہوگا تو باہر کی دنیا بدل جائے گی۔

میرے عزیزو! قرآن کی رو سے یہ ہے دعا۔ کیا وہ ساری الجھنیں' وہ سارے اعتراضات جن کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے' تو کیا کوئی بھی اِس کے بعد پیدا ہوتا ہے؟ یہ کیوں ایسا ہوا؟ میں نے اُسے آواز دی کہ یہ ایسا کیوں ہوا؟ اُس نے کہا کہ قرآن کی فلاں آیت دیکھ لیجیے'

---

[1] تھنوں کے اوپر کا وہ حصہ جہاں سے تھن نکلتے ہیں۔

اُس کے اندر یہ بات مل جائے گی۔ وہ مل گئی مسئلہ حل ہو گیا۔ لیکن یاد رکھیے کہ مسئلہ حل ہونے کے لیے ایک بات اور بھی وہ کرتا ہے۔ کہا کہ ایک دعا کی شکل ہم بھی تمہیں بتائیں کہ یہ کیا ہوتی ہے۔ **یدعون من دونه** (13:14) ہم سے یہ راستہ نہیں پوچھتے ''تے حضرت صاحب دے آستانیاں تے' تے مزاراں تے' تے ایناں تے' جا جا کے پوچھدے رہندے ❶ نیں۔'' تو آپ ذرا دعا کرنے والے کو تصور میں لائیے' وہ عام سا منے کھڑا ہے۔ کیا محاکاتی انداز ہے! **اِلَّا کَبَاسِطِ کَفَّیۡهِ اِلَی الۡمَآءِ لِیَبۡلُغَ فَاهُ وَ مَا هُوَ بِبَالِغِه** (13:14)۔ کہنے لگا ذرا تصور میں لائیے' ندی کے کنارے کھڑا ہے' پیاسا بھی ہے' ہاتھ یوں کیے ہوئے ہیں۔ کہے جا رہا ہے'' پانی آ! آ جا' پانی آ! آ جا'' ❷ کہنے لگا کہ وہ یہ کیے جائے ہے پانی ندی سے اُٹھ کر اُس کے منہ میں تو نہیں آئے گا۔ کیا انداز ہے بات کرنے کا! ندی کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ کہتا ہے کہ ہاتھ یوں اٹھائے ہوئے ہیں اور پانی کو کہتا ہے کہ آ جا' آ جا' آ جا'۔ تو اِس سے پانی تو اوپر اٹھ کر اُس کے ہاتھوں میں نہیں آئے گا۔

عزیزانِ من! سورۃ النمل کی آیت 62 تک آ ہم آ گئے۔ 65 ویں آیت آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀❀.....❀❀.....❀❀

---

❶ حضرت صاحب کے آستانوں پہ' مزاروں پہ'' جا کر پوچھتے رہتے ہیں۔

❷ اے پانی! آ جا۔

# آٹھواں باب: سورۃ النمل (آیات 65 تا 68)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۶۵﴾ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۫ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۫ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿۶۷﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1978ء کی 20 تاریخ ہے اور درس قرآن کریم سورۃ النمل کی آیات 60 اور 70 کے درمیان ہی سے ہو رہا ہے اور انہی آیات سے بات چل رہی ہے۔ آیت 60 ہی سے 20 واں پارہ شروع ہوا ہے: اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ [1] (27:60)۔ چونکہ ان آیات کے موضوع میں بڑا گہرا باہمی ربط ہے' اس لیے میں اسے معمول کے مطابق تو کسی خاص آیت سے درسِ قرآن کا آغاز نہیں کہتا کیونکہ یہ ساری آیات مربوط چلی آ رہی ہیں۔ ان آیات میں مرکزی تصور تو یہی ہے کہ وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ [2] (27:60)۔ اس میں مرکزی موضوع یہ ہے' اور اسی کے لیے اُس نے یہ کہا ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ بارش کس طرح برستی ہے' تم دیکھتے ہو کہ یہ مختلف کُرے' جو فضاؤں کے اندر تیر رہے ہیں' کس طرح خاص لگے بندھے قانون کے مطابق مصروفِ حرکت رہتے ہیں۔ پہاڑ' دریا' سمندر' زراعت یہ تمام چیزیں قوانین کی پابند ہیں اور اُس کے مطابق سرگرمِ عمل ہیں اور اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ

---

[1] اس حقیقت کی شہادت کے لیے کہ کائنات میں قانون صرف خدا کا کارفرما ہے' کسی اور کا قانون اس میں شریک نہیں' ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جس نے اس تمام سلسلہ کائنات کو پیدا کیا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 874)۔

[2] اور تمہارے لیے بادلوں سے بارش برساتا ہے۔ پھر اس پانی سے نہایت خوش نما باغات اگاتا ہے۔ تمہارے لیے تو یہ ممکن نہیں تھا کہ خدا کے ان عطیات (زمین' پانی' ہوا' حرارت' روشنی) کے بغیر ان درختوں کو اُگا سکتے۔ اب بتاؤ کہ کیا یہاں قانونِ خداوندی کے اختیار و اقتدار کے علاوہ' کسی اور کا اختیار و اقتدار بھی کارفرما ہے؟ کیا اس کے ساتھ کوئی اور الٰہ بھی ہے؟ (اگر یہ لوگ اس پر خالی الذہن ہو کر غور کریں تو اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو کہ یہ سب کچھ خدا اور صرف خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے' اس لیے کائنات میں کوئی اور ہستی ایسی نہیں جسے الٰہ قرار دیا جا سکے)۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ لوگ سیدھے راستہ پر چلنے کے بجائے' اپنے جذبات کے تابع' ایک طرف کو جھک جاتے ہیں اور یوں کج روی اختیار کر لیتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 874)۔

جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ وَ جَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًا ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ❶ (27:61) اور اس کے بعد اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ (27:62) ہے' پھر قرآن وہ آیت لایا ہے جس کا تعلق دعا سے ہے۔

## قرآنِ حکیم کا ایک ایک لفظ' ایک ایک آیت اور ہر ایک سورۃ باہمی ربط کے زیور سے آراستہ ہے

جیسا میں نے پچھلے درس میں عرض کیا تھا' ان آیات کے بعد ایک اور آیت (27:65) آتی ہے جس کا تعلق علمِ غیب سے ہے۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ جو سطحی طور پر اِس قرآن کو دیکھتے ہیں' پڑھتے ہیں وہ بلا تکلف کہہ دیتے ہیں کہ قرآن میں کوئی ربط نہیں پایا جاتا' یہ بڑا ہی بے ربط سا کلام ہے۔ یہ منکرین نہیں بلکہ ماننے والے علما مفسرینِ قرآن ہیں۔ یہ کہتے ہوئے اِن کو ذرا خیال نہیں آتا کہ یہ کس کے متعلق کہہ رہے ہیں' کس کتاب کے متعلق کہہ رہے ہیں؟ کتاب کی پہلی خوبی تو یہ ہے کہ اس کے اندر ربط ہونا چاہیے۔ بے ربط کلام تو پاگلوں کا ہوتا ہے۔ اِن کی اپنی کسی کتاب کے متعلق کہہ دیا جائے۔ کہ صاحب! آپ نے بڑی بے ربط کتاب لکھی ہے' پھر پوچھیے نہیں کہ اِن کی کیا کیفیت ہوگی لیکن خدا کے متعلق اور اُس کی کتاب کے متعلق کہتے ہیں کہ بے ربط ہے' مبہم ہے' مجمل ہے' یعنی دنیا بھر کے جتنے اسقام' کمزوریاں' خرابیاں کسی کتاب میں ہوسکتی ہیں وہ ساری کی ساری اِس کے بارے میں کہی جائیں گی۔ اور پھر ساتھ یہ بھی کہیں گے کہ سُبْحَانَ اللّٰهِ و تَعَالٰی (28:68) کیا بابرکت ہے وہ ذات جس نے ایسی کتاب نازل کی! کیا کہا جائے!!

محرم نہیں ہے تُو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

میں یہ بات اُن کی اصطلاح میں کہہ رہا ہوں۔ ان نواؤں کے ساتھ تھوڑا سا محرم ہونا پڑتا ہے تو پھر پتہ چلتا ہے کہ سنگیت کی جو سات سریں ہیں ان کے ربط کے معنی کیا ہوا کرتے ہیں۔

## مذہبی پیشوائیت قدم قدم پر دوسروں کی محتاج ہونے کے باوجود اپنی اجارہ داری قائم رکھتی ہے

قرآنِ کریم میں ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ

---

❶ پھر ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جس نے زمین کو (باوجود اس کی اس قدر تیز گردش کے) ایسا بنا دیا جس پر ہر شے نہایت عمدگی سے ٹھہر سکتی ہے' اور اس کے اندر دریا بہا دیئے' اور بلند پہاڑ کھڑے کر دیئے' اور دو دریاؤں کے درمیان گزرنے کا سامان پیدا کر دیا (25:53)۔ اب بتاؤ کہ کیا کوئی اور ہستی بھی ایسی ہے جس کا اقتدار اس تمام نظم و نسق میں شریک ہو؟ جب کوئی اور اس میں شریک نہیں تو خدا کے ساتھ کوئی اور الٰہ کیسے ہوسکتا ہے؟ لیکن یہ لوگ علم و بصیرت سے کام نہیں لیتے (اور محض توہم پرستی اور جہالت کی بنا پر غلط راستے اختیار کر لیتے ہیں)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص۔ 875)۔

بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (9:34)۔اے جماعتِ مومنین! اس سے متنبہ رہو، تمہیں وارننگ دی جاتی ہے کہ اِن علما اور مشائخ، پیر اور مولوی، کی اکثریت کو تم دیکھو گے کہ دوسروں کی کمائی کو ناجائز طریقے سے کھا جائیں گے۔ کہیں گے یہ کہ ہم تمہیں خدا کی طرف جانے والے راستے کی طرف راہنمائی کرتے ہیں اور فی الحقیقت خدا کی طرف جانے والے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ خود ہوتے ہیں۔ یہ دوسروں کی کمائی کس طرح سے کھاتے ہیں؟ کوئی چیز دیتے نہیں ہیں۔ یعنی آپ کچھ بھی کسی کو دیں گے تو اس کے Return، (بدلے)، میں کچھ تو آپ کو اس سے ملے گا لیکن یہاں یہ صورت ہے کہ اُن کا کسی کو دینا تو ایک طرف، وہ تو اپنی ایک وقت کی روٹی کمانے کے بھی اہل نہیں ہوتے۔ وہ تو اُن کو آپ دیتے ہیں تو وہ کھاتے ہیں۔ کیوں یہ لوگ جا جا کر صرف دیتے ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی منتیں بھی کرتے ہیں، پاؤں بھی چومتے ہیں اور ساتھ دیتے بھی چلے جاتے ہیں۔ اِس کا راز کیا ہے؟ راز وہی دوسرے کی کمزوری کو Exploit (استحصال) کرنا ہے۔ یہ کمزوری کیا ہوتی ہے؟ یہ ہے وہ جسے بدقسمت، مصیبت زدہ، ناکام، بے کس، بے بس، مجبور انسان کہتے ہیں، وہ اِن کے پاس جاتا ہے۔ کس لیے جاتا ہے؟ اس لیے کہ حضرت صاحب! ہمارے لیے تقدیر بدلنے کے لیے دعا کیجیے۔ تو آپ نے سمجھا کہ قرآنِ کریم نے اُن آیات میں، خالص قانون کی کارفرمائی پہ زور دیا ہے۔ وہ درمیان میں یہ بات کیوں لایا؟ وہ اِس لیے لایا کہ انسان کی کیفیت یہ ہے کہ مصیبت پڑتی ہے تو بھول جاتا ہے کہ یہاں ہر چیز قانون کے مطابق ہوتی ہے، مجھ سے کچھ قانون کی خلاف ورزی ہوئی ہے جس کی وجہ سے یہ مصیبت آئی ہے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ پھر اُسی کے قانون کی طرف رجوع کیا جائے۔ وہ یہ نہیں کرتا، وہ چاہتا یہ ہے کہ خلافِ قانون کچھ ہو جائے۔

## خدا سے خدا کا قانون بدلوا کر انسانوں کی مصیبتوں کا ازالہ کرانے والے احبار و رہبان

عزیزانِ من! جب وہ اِن سے جا کر کہتا ہے کہ میرے لیے دعا کیجیے کہ یہ ہو جائے تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ قانون کے مطابق ہونا ہے، وہ یوں نہ ہو بلکہ جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ ہو اور وہ اِس لیے ہوگا کہ آپ خدا سے کہہ کر کروا دیں گے۔ یعنی ویسے اگر نہ کہا جائے گا تو وہ تو اُس قاعدے قانون کے مطابق کرے گا کیونکہ اس نے بتا دیا ہے۔ حضرت صاحب! میں تو مارا گیا۔ آپ کچھ کیجیے میرے لیے کہ وہ قاعدے کے خلاف کچھ ہو جائے۔ حضرت صاحب بھی کہتے ہیں، ٹھیک ہے "سٹ پیسے"[1] اس سے میں تمہاری مرضی کے مطابق کام کرا دیتا ہوں۔ آپ نے دیکھا جو اُس نے کہا تھا کہ یہ لوگ، احبار و رہبان، لوگوں کی کمائی کو باطل طریق سے کھا جاتے ہیں اور خدا کی طرف جانے والے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہوتے ہیں۔ راستہ تو یہ تھا کہ انہیں بتایا جائے کہ بھئی! یہ ساری بات قاعدے قانون

---

[1] رقم ادا کرو۔

کے مطابق ہوتی ہے' خدا کے قانون کے خلاف ورزی یہاں ہوئی ہے۔ اُس کا علاج تو اُسی قانون کی طرف رجوع کرنا ہے تو یہ تو خدا کی طرف جانے والے راستے کی طرف راہنمائی ہوگی' اور اگر وہاں یہ کہا جائے کہ نہیں ٹھیک ہے' آپ جو کہتے ہیں اس کے مطابق ہم اللہ میاں سے کرا دیتے ہیں تو اللہ میاں کی طرف جانے والے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تو یہ ہو گئے۔ یہ دوسروں کی مصیبتیں سن کر' دعائیں مانگ کر' قسمت بدلنے والے جن کو کہتے ہیں' تقدیر بدلوانے والے جن کو آپ کہتے ہیں' یہ خدا کی طرف جانے والے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن کر کھڑے ہونے والے ہیں۔ کون جاتا ہے ان سے دعائیں منگوانے کے لیے؟ وہی کہ جس کا کام رکا ہوا ہوتا ہے' جس پہ مصیبت پڑی ہوئی ہوتی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا میں کبھی سنایا کرتا ہوں:

جو نہیں آشنا مصیبت کا' درد و غم کا نہ جو شکار ہوا
جس پہ کبھی نہ وقت پڑا' جو نہ اٹھ اٹھ کے رات کو رویا
وہ نہیں جانتا دعا کیا ہے' اُسے معلوم کیا خدا کیا ہے

لیکن پتے کی بات ہے' سن لو' کہنے والا کیا خوب کہہ گیا ہے:

دکھ میں تو ہر کو بھجیں اور سکھ میں بھجیں نہ کو
جو سکھ میں ہر کو بھجیں تو دکھ کا ہے کو ہو

## قاعدے اور قانون کی خلاف ورزی کے نتیجے کا دوسرا نام بیچارگی ہے

وہ ہر کو بھجیں [1] ہیں جب دکھ کی بات ہوتی ہے۔ جب قاعدے قانون کے مطابق' کچھ ہوتا نہیں ہے تو اِسی کو بیچارگی کہتے ہیں۔ جب بھی آپ کا موٹر' آپ کا انجن صحیح قاعدہ قانون کے مطابق ہو' یعنی پٹرول موبل آئل وغیرہ صحیح ہو تو وہ چلتا جاتا ہے۔ جہاں کہیں اس کے اندر نقص ہوتا ہے تو وہاں وہ موٹر رکتی ہے' وہاں ٹھہرتی ہے۔ پھر آپ لوگوں کو ڈھونڈتے ہیں کہ ذرا دھکا لگوا دیں۔ یہ دعا منگوانے والے دھکا لگواتے ہیں ورنہ جب تک وہ قاعدے کے مطابق سب کچھ ہوتا ہے تو وہ چلتی جاتی ہے' کبھی آپ دھکے والے کو آواز نہیں دیتے۔ تو پہلی چیز تو وہ تھی جو میں نے پچھلے درس میں عرض کیا تھا۔ اُس نے کہا یہ ہے کہ یاد رکھو! دعا نہ منگوانے والی بات کرو۔ ایسے وقت میں جہاں تمہیں صحیح راستہ نہ ملے تو ہمیں آواز دو کہ ہمیں وہ صحیح راستہ بتا دو کہ جس پہ چلنے سے ہم منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔ اور وہ صحیح راستہ ہماری قانون کی کتاب قرآن کے اندر تمہیں مل جائے گا۔ قانون کی خلاف ورزی سے ایک یا ایک انداز کی زندگی سے اگر کوئی مصیبت آئی ہے تو اس کا

---

[1] ہر بھجنا۔ خدا کا نام لینا۔ خدا کی تسبیح پڑھنا۔

حل یہ ہے کہ اُس کے مطابق جو صحیح قوانین یا قاعدہ اُس نے مقرر کیا ہے' اُس طرف لوٹ آؤ۔ وہ جنہیں میں نے شاہکارِ رسالتؐ کہا ہے یعنی حضرت عمر فاروقؓ (581-644/45AD) اُن کے جملوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے اندر نظر آتا ہے کہ وہ لوگ تربیت اور تعلیم نبویؐ سے کس طرح قرآن کی تہ تک پہنچے تھے۔ وہ جب اُس ❶ علاقے میں گئے ہیں' لشکر وہاں تھا' وہ اسے دیکھنے کے لیے گئے تھے۔ وہاں طاعون پھوٹ پڑا تھا۔ تو آپؓ نے حکم دیا کہ یہاں سے فوراً نکل چلو اور فلاں پہاڑی کے اوپر چلے چلو۔ وہاں کسی نے اُن سے کہا کہ کیا آپ خدا کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟

## وقت کی مناسبت سے خدا کے ایک قانون کی جگہ دوسرے قانون کی پیروی کرنا ہوگی

عزیزانِ من! غور سے سنیے کہ قرآن پہ جن کی نگاہ ہے وہ کیا بات کہتے ہیں۔ کہنے لگے کہ میں خدا کی ایک تقدیر سے خدا ہی کی دوسری تقدیر کی طرف بھاگ رہا ہوں۔ اس کی ایک تقدیر یہ ہے کہ جہاں وباء پھوٹ پڑے تو وہاں وہ جراثیم لگ جاتے ہیں' وہاں سے نکل جاؤ محتاط رہو' اور اُس کا ہی قانون یہ ہے کہ جہاں یہ جراثیم نہ پہنچے ہوں' وہاں چلے جاؤ تو محفوظ رہو گے۔ خدا ہی کے ایک قانون سے خدا ہی کے دوسرے قانون کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ وہاں طاعون زدہ علاقے میں بیٹھے ہوئے دعائیں نہیں مانگنے لگ گئے تھے۔ ایک قانون یہ تھا کہ وہاں رہو گے تو جراثیم سے الجھ جاؤ گے اور مرض لگ جائے گا۔ دوسرا قانون یہ تھا کہ اُس علاقے میں چلے جاؤ گے جہاں جراثیم نہیں ہیں' فضا متاثر نہیں ہے تو بچ جاؤ گے۔ یہ تھا مقصود دعا۔

---

❶ 17ھ کے اواخر کی بات ہے کہ فلسطین کے شہر عمواس میں طاعون پھوٹا اور دیکھتے ہی دیکھتے شام سے عراق تک سارے علاقے میں سیلاب کی طرح پھیل گیا۔ یہ وہ علاقے تھے جن میں اس وقت مملکت اسلامیہ کی فوجیں یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ سب اس طوفان کی لپیٹ میں آ گئیں۔ یہ وبا مہینوں تک پھیلی رہی اور (ایک اندازے مطابق) قریب پچیس ہزار مسلمان اس کی نذر ہو گئے۔ ان میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ مثل حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح' معاذ بن جبلؓ' یزید بن ابی سفیانؓ' عقبہ بن سہیلؓ وغیرہ شامل تھے۔ حضرت عمرؓ شام کا نظم ونسق بچشم خویش دیکھنے کی غرض سے اس سے پہلے مدینہ سے روانہ ہو چکے تھے۔ جب آپ تبوک کے قریب پہنچے تو طاعون کی تباہ کاریوں کی خبر ملی۔ وہاں صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ آگے جانا چاہیے یا نہ۔ اور طے یہ پایا کہ آپ کو اپنے ساتھیوں سمیت واپس تشریف لے جانا چاہیے۔ یہی وہ فیصلہ تھا جس کے خلاف حضرت ابوعبیدہؓ نے کہا تھا کہ ''کیا آپ تقدیر الٰہی سے بھاگ رہے ہیں''؟ اور آپ نے جواب میں فرمایا تھا کہ ''ہاں! میں خدا کی ایک تقدیر سے اس کی دوسری تقدیر کی طرف جا رہا ہوں''۔ اور یہی وہ ''مرگ مفاجات'' تھی جس سے بچانے کے لیے آپ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو لکھا تھا کہ آپ ایک ضروری مشقوں کے لیے مدینہ آئیے۔ اور انہوں نے جواب میں عرض کیا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے اس بلا سے محفوظ رہنے کے لیے بلا رہے ہیں لیکن میں اپنے لشکر کا سپہ سالار ہوں اس لیے آپ مجھے تعمیل ارشاد سے معذور رکھیے۔ آپ وہاں سے نہ نکلے اور اپنے رفقا کی معیّت میں' وہیں جان' جان آفرین کے سپرد کر دی۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ. (پرویزؒ۔ شاہکار رسالت' ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور' (1987)' ص ص۔ 55-254)۔

## دین کے بجائے مذہب کی اجارہ داری قائم کرنے والے تاجر دنیا میں ہر جگہ موجود ہیں

خدا نے کہا ہے کہ ایسے وقت میں ہم سے پوچھو کہ اب تمہارا قانون کیا ہے جس کے مطابق میں اب فیصلہ کروں۔ یہ جو درمیان میں دعائیں مانگ کر قسمتیں بدلنے والے آ بیٹھتے ہیں یہ دنیا کے ہر مذہب میں ہوتے ہیں' جب بھی دین مذہب میں تبدیل ہوتا ہے تو یہ دعائیں مانگنے والے آ کر بیٹھ جاتے ہیں: گرجا ہو' مندر ہو' خانقاہ ہو' گردوارہ ہو' آپ کی مسجد ہو' جب بھی قاعدے قانون کے مطابق لوگوں کے کام نہیں ہوتے' مجبور ہوتے ہیں' محتاج ہوتے ہیں' اُن کو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں تو پھر وہ اِس طرح سے ان کے آستانوں پہ جاتے ہیں' انہیں کہتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم کرا دیتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ آؤ تم اور ہم مل کر اس غلط قانون کو بدلوائیں جس کی رو سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ نہیں بلکہ وہ تو بیشک زیادہ سے زیادہ ہوتا چلا جائے تا کہ زیادہ سے زیادہ ہماری آمدنی ہوتی چلی جائے۔ جب بھی خلافِ قاعدہ کوئی نظام' خلافِ قانون کوئی معاشرہ ہوتا ہے تو تمام خلافِ قانون والے جو لوگ ہیں وہ اُن کو Exploit (استحصال) کرتے ہیں۔ اُن کی آمدنی بڑی بڑھ جاتی ہے۔

## تشکیلِ پاکستان کے بعد یہاں خانقاہوں کی اور عرسوں کی بھرمار قابلِ غور ہے

تشکیلِ پاکستان کے وقت جو لوگ موجود تھے' انہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ یہاں کہیں کہیں یہ خانقاہ یا کوئی قبرستان ہوا کرتا تھا۔ اب تو گھروں سے زیادہ تعداد قبروں کی ہے اور قبروں کے اوپر جھنڈے لگے ہوئے ہیں اور چادریں چڑھی ہوئی ہیں اور ہر تیسرے دن کہیں نہ کہیں عرس' ہر تیسرے دن کہیں نہ کہیں میلا لگا ہوتا ہے۔ یہ ایک تانتا بندھا ہوا ہے صاحب! اور یہ خانقاہوں اور سڑکوں پہ بیٹھے ہوئے یہ سارے ملنگ ہیں اور ان کے گرد جھرمٹ لگا رہتا ہے۔ یہ جھرمٹ کیوں اتنا زیادہ ہو گیا ہے؟ اس لیے کہ لوگوں کے کام قانون کے مطابق نہیں ہوتے۔

## تمام خامیوں کی وجہ جواز اور ان کا حل

یہ کیوں اتنے زیادہ ڈاکٹروں کی دکانیں بڑھ گئی ہیں؟ اس لیے کہ قانون کے مطابق صحت کے جو طریقے ہیں وہ یہاں بہم نہیں پہنچ رہے۔ کیوں وکیلوں کے اتنے کارنامے بڑھ گئے ہیں؟ اس لیے کہ قانون کے مطابق کوئی کام ہو نہیں رہا۔ یہ ہے وہ جو اُس نے احبار و رہبان کے متعلق کہا۔ یہ ساری Categories (اقسام) اُس میں آتی ہیں۔ اب آپ نے سمجھا کہ قرآنِ کریم نے قوانین کی یہ ساری باتیں کہہ کر' جن میں کسی کو انکار نہیں کہ بارش قانون کے مطابق ہوتی ہے' ہوائیں قانون کے مطابق چلتی ہیں' یہ سارا نظم و نسق قانون کے مطابق چلتا ہے' دریا یوں بہتے ہیں' سمندر میں جوار بھاٹا یوں آتا ہے' اُس کے درمیان وہ یہ چیز کیوں لایا تھا؟ وہ اِس لیے لایا تھا کہ یہاں یہ

سارا کچھ ہمارے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ تو کیا انسانی زندگی ایسی ہے جہاں لاقانونیت ہوگی اور اِس کے لیے تم اِن کے پاس جاؤ گے کہ حضرت صاحب! کام بگڑا ہوا ہے' قانون کے خلاف کچھ کرا دیجیے؟ ادھر حضرت صاحب کے مزار پہ دیگیں پکائیں اور وہاں جا کر رشوت دی تو بات تو ایک ہی ہے۔ ہم آپ کو یہ دیتے ہیں تو اللہ میاں سے کرا دیجیے۔ وہاں وکیل کے ایجنٹ کو دیا کہ صاحب! مجسٹریٹ سے یہ کرا دیجیے۔ قوانین آگے ہے پیچھے وہ آ رہے ہیں۔ اُس کے لیے بتایا کہ جب نظامِ اجتماعی بگڑ جائے اور قانون کچھ نہ کر رہا ہو تو **یجعلکم خلفآء الارض** (27:62) تو نظامِ خلافت بدلو' پھر یہ ساری چیز ٹھیک ہو جائے گی۔ ایک کیٹگری تو یہ ہے جو باطل کی طرح کھاتے ہیں۔

## ہماری بدحالی کا باعث بننے والی ایک دوسری کیٹیگری

دوسری کیٹیگری وہ ہے جو قسمت کا حال بتانے والے ہوتے ہیں۔ قسمت کی باتیں زیادہ خواتین' میری بیٹیاں معاف رکھیں' پوچھنے جاتی ہیں۔ یہی زیادہ بدقسمت ہوتی ہیں بیچاریاں۔ یہ یہاں سے وہاں تک بھاٹی گیٹ سے باہر دریائے راوی کے کنارے وہ فٹ پاتھ پہ دیکھیے۔ وہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ کوئی پنجہ لیے ہوئے ہے' کوئی طوطا لیے ہوئے ہے۔ یعنی انسان کی قسمت طوطا بتا رہا ہے۔ اندازہ لگائیے اُس کے گرد جھرمٹ کتنا ہوتا ہے' اور اِن میں سے بھی وہ بیچاریاں برقعہ والی جو ہیں وہ زیادہ مظلوم ہوتی ہیں۔ یعنی اُن کے گرد جھرمٹ ہوتا ہے۔ وہ دعائیں مانگنے والے نہیں ہوتے بلکہ وہ قسمت کا حال بتانے والے ہوتے ہیں۔ اور آگے قرآن انہیں آیات کے اندر بڑھا ہے۔ بتاتا آ رہا ہے کہ ہر چیز قاعدے کے مطابق ہوتی ہے' اور اُس کے بعد وہ کہہ رہا ہے کہ **قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ** [1] (27:65)۔ تم اِن کے پاس جا کر قسمت کا حال پوچھتے ہو۔

## غیب کا علم خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا

''قسمت'' کے معنی یہی ہیں کہ غیب کا علم ہو' ہونے والی جو بات ہے' اُس کے متعلق کچھ علم ہو۔ یاد رکھو! یہ غیب کا جو علم ہے' یہ خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس لیے ان کے پاس مت جاؤ۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اِس قرآن میں کتنا ربط ہے۔ یہ دوسری چیز شروع سے چلی آ رہی ہے یعنی اس وقت سے جب سے بھی انسان میں مذہب کی دنیا کا تصور پیدا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ چیز چلی آئی ہے کہ خلافِ قاعدہ کسی طرح سے منتر جنتر سے' دعائیں کرا کے' کچھ کام کرا لیا جائے یا قسمت کا حال معلوم کیا جائے۔ ان کا یہ مذہب پرست طبقہ اُس کا

---

[1] (ان لوگوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ یہ زندہ انسانوں کو تو ایک طرف' مُردوں تک کو کاروبارِ خداوندی میں شریک سمجھتے ہیں)۔ ان سے کہو کہ کائنات کے پستیوں اور بلندیوں میں جو امور پردہ اخفا میں ہیں' (اور ان کا تعلق عالمِ محسوسات سے نہیں)' ان کا علم' خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔876)۔

مرکز ہوتا ہے۔ اور یہی اُس کی کمائی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ قرآن نے ان دونوں مراکز کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ کہتا ہے کہ تم قسمت کا حال معلوم کرنے کے لیے اِن کے پاس جاتے ہو اور درمیان میں ایک بات کہی کہ **قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ** (27:64) ان سے جب بات کرو اور یہ اس چیز کا دعویٰ کریں تو اِن سے کہیے کہ صاحب! دلیل لائیے اس بات کے لیے جو تم کہتے ہو۔

## کسی سے کوئی بات منوانے کے لیے دلیل کا ہونا ضروری ہوتا ہے

عزیزانِ من! دلیل تو قانون اور قاعدے کے مطابق لائی جاتی ہے۔ جو کام آپ نے بلا قاعدہ کرانا ہو اُس کے لیے دلیل کیا' وہ تو بلا دلیل ہوتا ہے۔ قرآن دلیل مانگتا ہے۔ کہتا ہے کہ **اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ** (27:64) اگر تم سچے ہو تو۔ جب اُن سے ہم دلیل مانگتے ہیں تو اپنی سچائی کے لیے بھی تو ہمیں دلیل دینی پڑے گی۔ یہ کہ ہمارے کہنے سے خدا یوں کر دیتا ہے اِس کے لیے دلیل نہیں دی جا سکتی۔ کہتا ہے کہ دلیل لاؤ۔ خارجی کائنات کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے وہ قاعدہ قانون ہے۔ آپ کو سائنس کے انکشافات بتائیں گے۔ انسانی دنیا کے اندر اگر تم اِس قسم کی چیز چاہتے ہو تو اُس سے پوچھو کہ اِس کے لیے دلیل لاؤ کہ کیسے یہ کچھ ہو سکتا ہے۔ کہا کہ یہ کوئی دلیل نہیں لا سکیں گے: **لَا بُرْهَانَ لَهٗ** (23:117) یہ اُس کے لیے دلیل کوئی نہیں دے سکیں گے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح یہ انسانوں کو انسانوں کے اقتدار سے نکالتا ہوا لے جاتا ہے۔ کس طرح صحیح قاعدے اور قانون کی زندگی بتاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ کہا کہ **لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ** (27:65)۔ غیب وہ ہوتا ہے جو ابھی واقع نہ ہوا ہو' ابھی ہونے والا ہو۔ اُس کے متعلق تو قرآنِ کریم میں بے شمار آیات ہیں۔ بڑی بنیادی چیز ہے۔ **اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ** (10:20)۔ یہ بہت سے مقامات پر اُس نے کہا ہے کہ **عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ** (6:73)۔ غیب اور شہادت کی دو اصطلاحات قرآن میں ایک دوسرے کے بالمقابل آئی ہیں۔ شہادت تو وہ چیز ہوتی ہے جو مشہود چیز سامنے آجائے۔ شہید کہتے ہی اُس کو ہیں جو کسی چیز پہ نگران ہو' جس کے سامنے ہو' وہ یہ چیز کہے۔

## خدا کی راہ میں جان دینے والوں کے لیے لفظ شہید کا استعمال؟

ضمناً میں یہ عرض کر دوں کہ جو خدا کی راہ میں جان دے دیتے ہیں ہیں اُنہیں شہید کہا جاتا ہے۔ قرآن کی یہ اصطلاح نہیں ہے۔ قرآن اُن کو مقتول فی سبیل اللہ ہی کہتا ہے' اللہ کی راہ میں قتل ہو جانے والے' جان دینے والے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ شہادت کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ قرآن کی رو سے بھی اور آپ کا یہ Evidence (شہادت) کا جو Act (قانون) ہوتا ہے اُس میں بھی۔ جو بات کسی نے آنکھ سے دیکھی ہو اُسی کی شہادت قابلِ قبول ہوتی ہے۔ اگر وہاں جا کر کہا جائے کہ میں نے دیکھا تو نہیں بلکہ میں نے یہ سنا ہے تو اُسی وقت اُس کو کمرے سے نکال دیتے ہیں کہ یہ شہادت شہادت ہی نہیں ہے۔ تو شہید ہوتا ہے جس کی آنکھوں کے سامنے کوئی چیز ہو اور غیب وہ جو اس طرح سے مشہود طور پہ سامنے نہیں آیا' اُس کا علم نہیں ہوا۔ کہا کہ اُس کا علم کسی انسان کو نہیں ہو سکتا۔

## خدا تعالیٰ کی ذات کے متعلق لفظ علمِ غیب کی وضاحت

اب خدا کے لیے یہ جو چیز غیب اور شہادت کہی ہے' تو اس کے لیے یہ بات ذرا سمجھ لینے کی ہے۔ اگر چہ یہ تھوڑا سا فلسفیانہ نکتہ ہے۔ خدا کے لیے تو کوئی چیز نہ غیب ہو سکتی ہے نہ یوں شہید ہو سکتی ہے اس لیے کہ اُس نے کہا کہ **اَنَّـــهٗ عَـلٰــی کُـلِّ شَــیۡءٍ شَهِیۡدٌ** (41:53)۔ جب اُس نے کہا ہے کہ ہر چیز اُس کے سامنے ہے تو پھر یہ غیب کیا ہوا۔ یہ ہمارے نقطۂ نظر سے ہے کہ جو تمہاری نگاہوں کے اندر غیب ہے وہ اُس کے لیے غیب نہیں ہے۔ وہ تو ازلی ابدی طور پر اِس قسم کا علم رکھنے والا ہے۔ یہ جو زمان (Time) کے متعلق فلسفہ ہے' یہ بڑی پیچیدہ سی باتیں ہیں' اِس درس میں بتانے والی نہیں ہیں لیکن خدا کے لیے اُن کے ہاں ایک اصطلاح ہے کہ خدا کے نزدیک Past,Present & Future (ماضی' حال اور مستقبل) کچھ نہیں ہے' اُس کے سامنے ہر چیز موجود ہے' حاضر (Present) ہے۔ وہ اسے Eternal Now کہتے ہیں یعنی حاضر (Present) ہے' اُس کا اُسے علم ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جسے سمجھانے کے لیے یہ مثال ہے کہ جیسے اگر آپ پہاڑ کے دامن میں کھڑے ہوں تو پہاڑ کے دوسری طرف کی چیز آپ کے لیے غیب ہے' اور جو پہاڑ کی چوٹی پہ کھڑا ہے اُس کے لیے وہ بھی شہادت ہے۔ تو خدا تو اُن بلندیوں کے اوپر ہے کہ جہاں کوئی چیز بھی اُس کی نگاہوں سے غیب نہیں ہے' سامنے ہے۔ اُس نے عالم الغیب کہا ہے تو وہ تمہارے نقطۂ نگاہ سے کہا ہے۔ تمہارے پیمانوں کے مطابق جو چیز ابھی واقع میں نہیں آئی' آنے والی ہے' اُسے تم غیب کہتے ہو۔ جو آ چکی ہے' اُسے تم شہادت کہتے ہو۔ اُس کے لیے تو ہر چیز مشہود ہے' نگاہوں کے سامنے ہے لیکن جو چیز بھی تمہارے سامنے مشہود نہیں ہے' ہونے والا جو واقعہ ہے' اُس کا علم تمہیں نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے وہ جسے اس نے وحی کہا ہے۔ عام انسان تو ایک طرف رہے' نبیوں کو بھی از خود اِس کا علم نہیں ہوتا تھا۔ خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے اور انبیائے کرامؑ کے متعلق بھی ہے' ہر نبی کے متعلق یہ ایک ہی چیز ہوتی ہے۔

حضور ﷺ کے متعلق انہوں نے کہا کہ یہ فوق البشر ہے' انسان نہیں ہے۔ آپؐ نے کہا کہ یہ غلط بات ہے۔ میں بھی تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ میں یہ سب کچھ اس لیے کر دکھاتا ہوں کہ میں اُس کے قانون کے عین مطابق سب کچھ کرتا جاتا ہوں۔ اِس لیے اُس کے یہ نتائج نکلتے چلے جاتے ہیں اور اگر تم اپنے تصور میں یہ چیز رکھے ہوئے ہو کہ نہیں یہ تو ولی اللہ ہے' خدا کا مقرب ہے اور یا پھر یہ تو خدا کا رسول ہے' خدا کا نبی ہے' اس لیے اِس کو اس قسم کی چیزیں حاصل ہونی چاہئیں جو فوق الفطرت ہیں' Super Natural ہیں' Super Human ہیں۔ کہا کہ یہ سب غلط ہے۔ **وَ لَآ اَقُوۡلُ لَـکُـمۡ عِـنۡـدِیۡ خَزَآئِنُ اللّٰهِ** (11:31) میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے بڑے بڑے خزانے موجود ہیں' میں لٹا دونگا اور تمہیں دے دوں گا' بالکل نہیں۔ میں بھی تمہاری طرح اپنی روٹی کماؤں

گا‘ تو کھاؤں گا۔ وَ لَآ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ (11:31) میں بھی غیب کا علم نہیں جانتا۔ اس لیے میرے پاس مت آؤ کہ ہمیں قسمت کا حال بتایئے۔ میں تو اپنے متعلق بھی نہیں جانتا کہ کل کیا کروں گا‘ دوسرے کے متعلق کیا بتا سکتا ہوں!! تو آپ سوچیے کہ وہ گرامی قدر ہستی علیہ الصلوٰۃ والسلام کہ جو علمِ انسانی کے معراجِ کبریٰ پر واقع ہے‘ وہ بھی یہ اعتراف کرتی ہے اور قرآن میں اِس کے متعلق بتا دیا گیا ہے کہ میں بھی غیب نہیں جانتا تو آپ سوچیے کہ کیا کوئی اور انسان ایسا ہوسکتا ہے جو کہے کہ میں کل کی بات تمہیں بتاتا ہوں‘ قسمت کا حال تمہیں بتاتا ہوں؟ نہیں‘ بالکل نہیں۔

## پیش گوئی غیب کے علم کا ہی دوسرا نام ہے جس کی کوئی سند قرآن حکیم میں نہیں

جسے آپ پیش گوئیاں کہتے ہیں وہ تو ساری بات ہی یہ ہوتی ہے۔ پیش گوئی کے معنی ہی یہ ہیں کہ اُس واقعہ کے صادر ہونے سے پہلے بتا دیا جائے۔ اِسی کو تو غیب کا علم کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں بھی نہیں جانتا اور دوسرے مقام پہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ یہ جو باتیں آپ سے کہتا ہے‘ وہ کچھ ماضی کی باتیں ہیں جو تم نہیں جانتے اور کچھ آنے والے واقعات کے متعلق ہیں‘ تو یہ خود غیب کا علم نہیں جانتا بلکہ ہم اسے وحی کے ذریعے سے یہ بتاتے ہیں تو یہ تمہیں بتاتا ہے ورنہ از خود یہ بالکل غیب کا علم نہیں جانتا۔ جب رسول اللہ ﷺ یہ نہیں جانتے تو یہ جو اُس کے بعد ہمارے ہاں پیش گوئیاں کرنے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے‘ یہ تمام جتنے بھی آپ ولی اللہ‘ صوفیائے کرام بتا رہے ہیں‘ اُن کے لیے ایک ہی سند ہوتی ہے کہ وہ پیش گوئیاں کرتے ہیں۔ ’’حضرت صاحب تے پہلے ہی دس دیندے ہیگے نہیں کہ کی ہون والا ہیگا اے [1]‘‘۔ اور پھر چلتے چلتے آپ وہاں تک پہنچ رہے ہیں۔

## پیش گوئیوں کے متعلق مرزا صاحب قادیانی کا دعویٰ

یہ جو ہمارے ہاں کا وہ قادیانی مرزا صاحب [2] مدعیِ نبوت ہے یعنی اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ صاحب! دیکھ لیجیے میری ہر پیش گوئی پوری ہوتی ہے‘ اس لیے میں نبی کیوں نہیں ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ میں بھی غیب کی بات نہیں جانتا‘ میں بھی پیش گوئی نہیں کرسکتا‘ مگر وہ [2] اپنے دعویٰ نبوت کے ثبوت میں یہ چیز پیش کرتا ہے کہ میں آپ کو پیش گوئیاں کر کے بتاتا ہوں۔ اُس کے متعلق ساری پیش گوئیاں بھری پڑی ہیں۔ یوں پوری نہیں ہوتیں تو پھر معتقدین اُس میں تاویلیں کرتے ہیں۔ بہرحال یہ دعویٰ کرنا کہ میں پیش گوئی کرسکتا ہوں یا یہ کہنا کہ یہ پیشین گوئی کرسکتے ہیں‘ عزیزانِ من! باقی دنیا جو کچھ کہے سو کہے لیکن قرآن کو ماننے والا‘ خدا پر ایمان رکھنے والا تو یہ قطعاً نہیں کہہ سکتا جب اُس نے کہا ہے کہ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ اُس نے تو واضح الفاظ میں یہ کہہ دیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ

---

[1] حضرت صاحب تو پہلے ہی بتا دیتے ہیں کہ جناب کیا ہونے والا ہے۔

[2] مرزا غلام احمد قادیانی (1835-1908ء) کی طرف اشارہ ہے۔

عِنۡدَهٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الۡغَيۡثَ وَ يَعۡلَمُ مَا فِى الۡاَرۡحَامِ وَ مَا تَدۡرِىۡ نَفۡسٌ مَّاذَا تَكۡسِبُ غَدًا وَ مَا تَدۡرِىۡ نَفۡسٌۢ بِاَىِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ خَبِيۡرٌ ❶ (31:34) الساعۃ کا علم خدا کو ہے۔ وہ الساعۃ جسے آنے والی قیامت کہتے ہیں' وہ یا اِس دنیا کے اندر جو انقلابات آتے ہیں' وہ انقلابات آئیں' ان کے متعلق بھی پہلے سے نہیں کہا جا سکتا۔ میں ابھی عرض کروں گا کہ پہلے سے کیوں نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں کہا ہے کہ يُنَزِّلُ الۡغَيۡثَ وَ يَعۡلَمُ مَا فِى الۡاَرۡحَامِ (31:34) وہ بارش کے متعلق جانتا ہے' وہ جانتا ہے کہ رحمِ مادر کے اندر جو بچہ ہے اُس کی کیا کیفیت ہے۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک علم کی روشنی میں کسی چیز کا بتانا دوسری بات ہے

عام طور پہ کہا یہ جاتا ہے کہ دیکھیے صاحب! خدا نے کہا ہے کہ اِس کا علم بھی کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ اب تو یہ موسم کی پیش گوئیاں روز ہوتی ہیں۔ ان کی جو Calculation (حساب شمار) ہیں تو وہ تو بتا دیتے ہیں' اور یہ جو رحمِ مادر کے اندر کی بات ہے تو آج تو آئینے کی طرح وہ چیزیں سامنے آ رہی ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ تم علم کے ذریعے سے ان باتوں کو نہیں جان سکتے۔ اُس نے یہ تو نہیں کہا۔ یہی تو چیز ہے جہاں رکنا ہوتا ہے کہ قرآن کے الفاظ کیا کہتے ہیں۔ ہم بھی جانتے ہیں اور جو اس علم کے مطابق تم میں سے کوئی کوشش کرے گا وہ بھی جان لے گا۔ جو نہیں جان سکتے' وہ یہ ہے کہ کوئی نفس یہ Definitely (قطعی طور پر) نہیں کہہ سکتا کہ میں کل یہ کروں گا' وہ نہیں کہہ سکتا کہ میری موت کہاں واقع ہوگی۔ وہ کہتا ہے کہ تم یہ نہیں جان سکتے۔ کسی دوسرے کے متعلق یہ کہنا کہ تم کل کیا کرو گے یا کل کیا ہوگا' اس کا تو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ کل کے معنی یہی نہیں ہیں جسے ہم Tomorrow کہتے ہیں۔

## قرآنی لفظ غداً کا مفہوم

یہ جو عربی زبان میں غداً کا لفظ ہے' یہ جس معنی میں ہم Future کہتے ہیں' جسے ہم فردا کہتے ہیں' یہ اُس معنی میں آتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ وَلۡتَنۡظُرۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ لِغَدٍ (59:18) ہر شخص کو اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ میں ''کل'' کے لیے کیا بھیج رہا ہوں۔

---

❶ یہ ظہور نتائج کی گھڑی کب آئے گی' اس کا علم خدا ہی کو ہو سکتا ہے اگرچہ اعمال کے نتائج مرتب ہونے کا علم ہر وقت جاری رہتا ہے۔ جس طرح بارش برستی تو ایک وقت پر جا کر ہے' لیکن وہ بننی شروع ہو گئی ہوتی ہے ایک مدت پہلے سے۔ یا جس طرح بچہ پیدا تو ہوتا ہے ایک وقت خاص پر جا کر لیکن وہ رحم مادر میں بہت پہلے سے مختلف مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ خدا کو ان تمام مراحل کا علم ہوتا ہے۔ ان امور (یعنی بارش یا جنین کے مختلف مراحل میں سے گزرنے کا علم) تو تم بھی حاصل کر سکتے ہو لیکن خدا وہ کچھ بھی جانتا ہے جو تم نہیں جان سکتے۔ (مثلاً) کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل (مستقبل میں) کیا کرے گا۔ اور نہ ہی یہ بتا سکتا ہے کہ اس کی موت کس جگہ واقع ہوگی۔ خدا سب کچھ جاننے والا اور ہر بات سے باخبر ہے (اس لیے خدا کو اس بات کا علم ہے کہ ظہور نتائج کی گھڑی کب آئے گی۔ تمہیں اس کا یقین رکھنا چاہیے کہ وہ آ کر ضرور رہے گی (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 954)۔

''کل'' کے معنی یہ نہیں کہ آج مثلاً جمعہ ہے تو ہفتے کے لیے میں کیا بھیج رہا ہوں۔ اس کے معنی Future (مستقبل) ہوتا ہے۔ یہ فردا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کل کو یعنی فردا میں کیا کرونگا۔ کیا بات ہے یہ! ٹھیک ہے اپنے متعلق تو انسان کہے کہ کیوں میں آج فیصلہ کرتا ہوں اور اُس فیصلے کے اوپر میں پابند رہوں گا اور کر کے دکھاؤں گا لیکن اِس میں آج نہیں اور جو آنے والا بھی فردا ہے بہت سے Elements' بہت سے عناصر' بہت سے اسباب' ایسے آتے ہیں جس پر اس ایک فرد کو بھی کنٹرول نہیں ہوتا۔ رات ہی کو زلزلہ آجائے تو کیا کرلے گا۔ گاڑی میں جا رہا ہے اور ٹکر ہو جائے' اُسے تو کہتے ہی Accident ہیں' اتفاقیہ جو چیز ہو جاتی ہے۔ بڑے عناصر ایسے شامل ہوتے ہیں' جن کے متعلق انسان خود بھی یہ نہیں کہہ سکتا۔ Definitely (قطعیّت سے) وہ کہے کہ میرا ارادہ یہ کرنے کا ہے۔ میری اسکیم یہ ہے بشرطیکہ All these elements' یہ تمام مختلف عناصر جو درمیان میں آتے ہیں' وہ بھی اُس کے مطابق ہوں تو پھر یہ ہوگا' اور ضروری نہیں کہ ہر ایک کو اِس کا کنٹرول ہو۔ ابھی ابھی میں نے جو کہا ہے کہ رات کو سوتے سوتے ہی ہارٹ فیل ہو جاتا ہے اور اُس کو ایک منٹ پہلے بھی پتہ نہیں ہوتا کہ ابھی میرا ہارٹ فیل ہو جانا ہے۔

## انسان کو اپنی موت کے وقت اور جگہ کا علم نہ ہونا خدا کی رحمت ہے

انسان کے کسی کام کرنے کے لیے یہ جو چیزیں ہیں اُس میں اُس کا اپنا فیصلہ ہی قولِ آخر یا قولِ فیصل نہیں ہوتا' اُس کے ساتھ بہت سے اور دیگر عناصر بھی شامل ہوتے ہیں اس لیے کہا کہ وہ نہیں کہہ سکتا' نہ ہی قبل از وقت یہ بتا سکتا ہے کہ میں کب مروں گا اور کہاں مروں گا' اور یہ تو اُس کی رحمت ہے جو انسان کو اُس نے اِس کا علم نہیں دیا کہ تمہاری موت کب ہوگی۔ میرے اللہ! یہ اگر کسی کو پتہ ہو کہ میں نے اگلے سال اُس مہینے میں مرجانا ہے تو آج ہی سے اُس کے اوپر موت شروع ہو جائے' سانس لینا اُس کے اوپر حرام ہو جائے۔ ایک ایک دن جو گزرتا چلا جائے تو وہ' گھر والے' دوست یار سارے آنا جانا شروع ہو جائیں۔ وہ تو موت کے متعلق عدمِ علم ہے جس بنا پہ ہم یوں زندہ رہتے ہیں اور آرزوئیں اور مقاصد جو ہیں وہ تعمیر کرتے رہتے ہیں۔ [1] وہ اُس نے ٹھیک کہا تھا:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

یہ علم اِس کو نہیں دیا گیا۔ یہ اِس کے لیے بہت بڑی چیز ہے لیکن بہرحال یہ ایک وہ چیز ہے جسے غیب کہا جا سکتا ہے۔ اِس کا علم نہیں ہو سکتا۔

---

[1] یہ اشارہ مرزا اسدُ اللہ خان غالب (1797-1869) کی طرف ہے۔

## علمی ذریعے کے تحت غیب کے علم کی نوعیت

یہ جو اُس نے کہا ہے کہ تم جو دوسروں سے پوچھنے جاتے ہو تو وہ تمہیں کیا بتائیں گے' یہاں سے ایک بہت بڑی بات سامنے آئی۔ عزیزانِ من! وہ بات تو اتنی سی ہی نظر آتی ہے کہ غیب کا علم صرف خدا ہی کو ہے۔ کھڑے ہو کر اِس کی گہرائی میں جا کر سوچیے کہ وہ کیا بات کہہ گیا ہے۔ یہ جو علم الافلاک کے ماہر ہیں یہ ہزار سال پہلے بتا سکتے ہیں' بتا دیتے ہیں کہ سورج کو گہن (Eclipse) کس تاریخ کو لگے گا' کس وقت لگے گا' کتنا لگے گا' کتنے وقت تک رہے گا اور اگر اُن کی Calculation (حساب شمار) صحیح ہے تو یہ کبھی غلط نہیں ہوا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ انہیں ہم نے صاحبِ ارادہ و اختیار نہیں بنایا۔ وہ قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے چلے جا رہے ہیں **وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا** (45:13) انہیں ہم نے قانون کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ قانون سے واقفیت حاصل کر لو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ اگر کسی کو پتہ ہے کہ جو ریل کی پٹڑی ہے وہ ادھر جاتی ہے اور اُس نے صحیح کانٹا موڑ لیا تو وہ بتا سکتا ہے کہ وہاں پہنچنے کے بعد یہ انجن ادھر مڑ جائے گا۔ وہ اُدھر کو ضرور مڑ جائے گا۔ اُس نے پٹڑی پہ جانا ہے اور پٹڑی کا علم تمہیں معلوم ہے۔ انجن صاحب اختیار و ارادہ نہیں ہے' قاعدے قانون کی پٹڑیوں میں وہ مسخر ہے' کائنات کی کوئی شے بھی کچھ تھوڑا سا' ذرا سا' صاحب اختیار و ارادہ نہیں ہوتی۔

## دنیا کا کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مکھی اب اڑ کر کہاں بیٹھے گی

جسے کچھ تھوڑا سا اختیار کہتے ہیں یہ جو کچھ پرندوں میں لائف کی ارتقائی شکل ہے یا جس کو زندگی کہتے ہیں' اُس میں یہ ذرا سا ہوتا ہے۔ وہ تو معلوم نہیں ہے کہ وہ فیصلے کیسے کرتے ہیں لیکن آپ اُن کے متعلق Prediction یا پیش گوئی نہیں کر سکتے۔ سلیوان [1] نے Limitations of Science کے اندر لکھا ہے' وہ بڑی اچھی کتاب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آنے والے ہزار سال میں جو حادثات ہونے والے ہیں' اُن کے متعلق تو سائنسدان Calculation (حساب شمار) کر کے بتا سکتے ہیں کہ سورج کو کب گہن لگے گا۔ وہ کہنے لگا کہ اگر میز کے اوپر دس سائنٹسٹ بیٹھے ہوئے ہوں اُس میز کے اوپر اگر ایک مکھی آ بیٹھے تو وہ دس چھوڑ کر سو بھی بیٹھے ہوئے ہوں تو وہ یہ نہیں بتا سکیں گے کہ یہاں سے اڑ کر یہ کہاں بیٹھے گی۔ بڑی عمدہ مثال ہے۔ سورج کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ وہ نکلنے کے بعد پوری روشنی دے گا' آدھی روشنی دے گا' روشنی نہیں دے گا۔ اُس کو یہ اختیار ہی نہیں ہے۔ لیکن اِس مکھی کو اتنا سا اختیار ہے کہ یہ اڑ کر جہاں جی چاہے بیٹھے۔ اُس نے کہا کہ جس کی یہ صورت ہو اُس کے متعلق پہلے سے کچھ کہنا' Predict کرنا' پیشین گوئی کرنا' بڑا غلط ہے۔ کتنی برجستہ

---

[1] Prof.W.N.Sullivan کی کتاب ہے Limitations of Science

مثال ہے! سامنے جو میز پہ بیٹھی ہوئی مکھی ہے تو اُس کے متعلق یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ اڑ کر کہاں بیٹھے گی۔ یہ اس لیے کہ اسے ذرا سا' تھوڑا سا اختیار ہے کہ اڑ کر جہاں جی چاہے جا بیٹھے' سورج کو بالکل نہیں ہے۔

## خارجی کائنات میں خدا کی مشیت اور انسانی دنیا میں انسان کی مشیت

عزیزانِ من! انسان کو صاحبِ اختیار وارادہ بنا دیا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ** (41:40) ہماری مشیت خارجی کائنات میں چلتی ہے' تمہاری دنیا میں تمہاری مشیت چلتی ہے' تم اُس کے مطابق جو جی میں آئے کر سکتے ہو۔ اِس قسم کے صاحبِ اختیار وارادہ کے متعلق کسی کا یہ کہنا کہ کل وہ یہ کرے گا' کہا کہ ارے! مکھی کے متعلق تو تم بتا نہیں سکتے کہ یہ اڑ کر کہاں بیٹھے گی' انسان کے متعلق تم کیا کہہ سکتے ہو!!! یہ حساب دان اور خاص طور پہ یہ جو منجم ہوتے ہیں انسانوں کی تقدیر' قسمت کیا بتا سکتے ہیں؟ کچھ بھی نہیں۔ منجم نجم سے ہے۔ اس کے معنی ستارہ ہے۔ ہوا یہ کہ وہ کہیں سے ایک خیال یونان کے حکما میں در آیا۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ انسانوں کی تقدیریں ستاروں کے تابع ہوتی ہیں۔ اور وہ جو ستاروں کا علم جانتے ہیں وہ انسانوں کی تقدیر بھی بتاتے ہیں۔ پھر گردش کا لفظ بھی اسی طرح سے آیا ہے۔

## انسانوں کی قسمتیں بتانے والے منجم کا کردار

اس سے وہ سارا کچھ گردشِ افلاک آ گیا۔ یہ وہی پرانا توہماتی تصور ہے کہ انسان کا مستقبل' اس کی قسمت' ان ستاروں کے تابع ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ان ستاروں کے تابع تم سمجھتے ہو ورنہ قرآن میں آیا ہے کہ **سَخَّرَ لَكُمْ** (45:13) یہ تمہارے تابع ہیں۔ اور یہ تو اتنے مجبور ہیں کہ اُس قانون سے ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتے۔ اور یہی وہ قرآن کی بات ہے جو ہمارے دور کے قرآن سمجھنے والے مفکر [1] نے بڑے صحیح اندازوں میں کہی:

تیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تُو تابعِ ستارہ نہیں

خاکِ زندہ' ستارہ کے تابع کیسے ہو سکتا ہے۔ ستارہ میں تو لائف ہی نہیں ہے۔ خاکِ زندہ کے معنی صاحبِ ارادہ ہے' اور جب انسان کی یہ صورت ہے تو یہ جو تصور ہے' یہ جو آپ جا کر کسی سے قسمت کا حال پوچھتے ہیں' اور وہ کہتے ہیں کہ اچھا! ہم ذرا دیکھ کر بتاتے ہیں تو وہ کیا دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ جو ہر ایک چیز کی تقدیر ہے وہ لوح پر قلم کے ساتھ عرش کے اوپر لکھی ہوئی ہے تو وہ ہم ذرا وہاں سے رات کو

---

[1] یہ اشارہ مفکر قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

جا کے ریکارڈ نکال کے دیکھ آئیں گے۔ ''پتہ نہیں چوری چوری دیکھنا ہوندا اے ❶۔'' دن کا کبھی نہیں کہتے' کہتے ہیں کہ رات کو دیکھیں گے کہ وہاں سے دیکھ آئیں گے اور پھر آ کے بتا دیں گے۔ تو گویا یہ جو تصور ہے کہ انسان کے متعلق جو کچھ اُس نے کرنا ہے سارے کا سارا پہلے سے لکھا ہوا ہے' جسے تقدیر یا قسمت کہتے ہیں' یہ بالکل باطل تصور ہے۔ صاحبِ اختیار و ارادہ کی پہلے سے لکھی ہوئی تقدیر ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر وہ پہلے سے لکھی ہوئی موجود ہے تو یہ صاحبِ اختیار نہیں ہے۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

ان کے متعلق تو یہ ہے کہ سورج نے اِس طرح فلاں وقت پہ چڑھنا ہے۔ روز آپ کے ہاں ٹی وی پہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ کل اتنے بجے طلوع ہوگا' اتنے بجے غروب ہوگا۔ سورج کو اِس کا اختیار ہی نہیں کہ ایک سیکنڈ کا بھی اُس میں فرق پیدا کر سکے لیکن میرے متعلق تو ہزار ٹی وی بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ اتنے بجے بستر سے اٹھے گا۔ آنکھ کھل بھی جائے گی تو نہیں اٹھونگا۔

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

## لاقانونیت انسان کو توہم پرستی کی گہری کھائی میں دھکیل دیتی ہے

انسان قاعدوں کا پابند ہوتا ہے تو اُس قاعدہ کے مطابق ایک مقام پہ رکتا ہے۔ جب بے قاعدگی کی طرف جاتا ہے پھر اِس کی توہم پرستی کی انتہا نہیں ہوتی۔ پھر وہ زندہ حضرت صاحب کے پاس ہی نہیں جاتا' پھر وہ حضرت صاحب کے قبر کے پتھروں کے پاس جاتا ہے۔ یعنی حضرت صاحب کی بے بسی کا یہ عالم کہ وہ فوت ہوئے ہیں تو آپ کا جی چاہے سردی کے موسم میں یخ بستہ پانی سے اُن کو نہلا دیں تو وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ صاحب! کیا کر رہے ہو' کھولتا ہوا پانی اُن کے اوپر ڈال دیں تو وہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ننگے دفن کر دیں' کوئی کپڑا دیں' نہ دیں' وہ تو بے بس ہیں۔ مردہ بدست زندہ۔ لیکن جونہی آپ نے اُن کو گڑھا کھود کر اُس کے اوپر ہزار من مٹی ڈالی' اُس کے اوپر کوئی لاکھوں من کے پتھر رکھ دیئے تو وہ ایسے صاحبِ اختیار و ارادہ بنے کہ تمہاری قسمتیں بدل سکتے ہیں۔ ''آپ تے کروٹ لے نئیں سکدے ہیگے ❷۔'' یاد رکھیے! عقلِ انسان کی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ اُس کے آگے نہیں جا سکتی لیکن بے عقلی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔

---

❶ کیا معلوم کہ وہ چوری چھپے دیکھنا ہوتا ہے۔

❷ آپ تو کروٹ بھی نہیں بدل سکتے۔

## بے عقلی کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی

عزیزانِ من! یہ قرآن کی روشنی کا صدقہ ہے جو یہ چیزیں آ جاتی ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس توہم پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ متعدد مقامات میں اُس نے مُردوں کے متعلق یہ کچھ کہا کہ بابا! کن کو جا کر تم سناتے ہو؟ کیسی دلیل وہ لاتا ہے کہ جب یہ مُردے ابھی تمہارے پاس ہوتے ہیں، وہ نہ کچھ سنتے ہیں، نہ تمہیں کچھ سناتے ہیں، تمہارے سامنے یہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ ارے سوچو تو سہی کہ جب اُنہیں تم دبا دیتے ہو تو اُن کے متعلق یہ ہے کہ تمہاری سن بھی رہے ہیں اور دعا بھی کر رہے ہیں، تمہاری قسمتیں بھی بدل رہے ہیں۔ او کیا کر رہے ہو تم؟ کیا سوچتے ہو تم؟ یہیں جو اُس نے کہا کہ **قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ** (27:65) خدا کے سوائی کوئی غیب نہیں جانتا۔ کہا کہ اے انسان! تم جو اِن کے پاس جاتے ہو تو اِن کی تو کیفیت یہ ہے کہ **وَ مَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ** (27:65) اُن کو تو اپنے متعلق بھی یہ پتہ نہیں ہے کہ ہم کب زندہ کیے جائیں گے، تم جو زندہ ہو، وہ تمہارے متعلق کیا بتا سکیں گے! کیا بات ہے: **هاتوا برهانكم** (27:64) دلیل لاؤ۔ واضح انداز میں بہت سی آیات ہیں۔ میری کتاب ''جہانِ فردا'' میں آپ یہ کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے مردوں کے متعلق قرآن کی آیات جمع کی ہیں **قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَ مَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ** [1] (27:65)۔ وہ یہ چیز کہتا ہے۔

عزیزانِ من! میں پھر اُدھر آ جاؤں۔ انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنانے کے معنی یہ ہیں کہ نہ اِس کے Future (مستقبل) کے متعلق کوئی کچھ کہہ سکتا ہے کیونکہ پہلے سے اِس کا Future مقدر ہے ہی نہیں، نہ اِس کے لیے خدا سے کچھ کہہ کر بدلوا سکتا ہے کیونکہ وہ قانون کو بدلتا نہیں ہے۔ تمہارے ہاں لاقانونیت جتنی جی چاہے پھیل جائے لیکن اُس کے ہاں لاقانونیت نہیں پھیلتی۔ ہمارے ہاں تو پھر روز یہ کہانیاں آتی ہیں:

## قسمت کی ایک تختی پر دو متضاد تحریریں

اُن لوگوں نے، اُن بیچاروں نے، خود کہا ہو یا نہ کہا ہو مگر یہ جن کی روٹی کا سہارا اُن کی قبریں ہوتا ہے بس وہ پھر حضرت صاحب کے

---

[1] (ان لوگوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ یہ زندہ انسان تو ایک طرف، مردوں تک کو کاروبارِ خداوندی میں شریک سمجھتے ہیں)۔ ان سے کہو کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو امور پردۂ خفا میں ہیں۔ (اور ان کا تعلق عالمِ محسوسات سے نہیں) ان کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ اور مُردے تو خود اپنے متعلق بھی اتنا نہیں جانتے کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے (چہ جائیکہ وہ علمِ خداوندی میں شریک ہوں۔ 16:22)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 876)

متعلق مشہور کرتے ہیں کہ جی اُن کے پاس وہ مائی آئی تھی اور اُس نے کہا کہ جی! فلاں پیر صاحب کے ہاں گئی ہوں، بہت منت سماجت کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ تمہارے ہاں تو اولاد نہیں ہوسکتی۔ حضرت صاحب نے کہا کہ نہیں، جاؤ تمہارے ہاں لڑکا پیدا ہوگا۔ وہ پھر اُن کے ہاں گئی اور اُنہوں نے کہا کہ میں تمہاری وہ تختی دیکھ کر آیا ہوں، تو اس میں اولاد ہے نہیں۔ وہ آئی اور کہنے لگی کہ جی، وہ تو یہ کہتے ہیں۔ اب وہ بھی وہاں جانے والے ہیں اور یہ بھی وہیں جانے والے ہیں۔ تختی وہی ایک ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں بھی دیکھ کر آیا ہوں۔ انہوں نے کہا ہے کہ میں اِس میں شبہ نہیں کرتا کہ وہ دیکھ کر نہیں آئے۔ ''اسی تے جوٹی یار ہیگے آں، اسی تے کٹھے جانے ہونے ہیگے ایں [1]۔'' (معاذ اللہ)

اللہ میاں کو تو اِنہوں نے ایسا ہی بنا رکھا ہے جیسے واقعی جوٹی وال ہوتے ہیں۔ چلو ٹھیک ہے، وہ دیکھ آئے ہوں گے۔ کہنے لگے کہ جب وہ دیکھ آئے ہیں کہ میرے مقدر میں کچھ نہیں ہے تو پھر؟ کہنے لگے کہ میں نے جو کہہ دیا ہے کہ تمہارے ہاں لڑکا ہوگا اور اُس کے ہاں لڑکا پیدا ہوگیا۔ وہ وہاں گئی اور کہا کہ حضرت صاحب! آپ نے تو یہ کہا تھا کہ میں دیکھ کر آیا ہوں کہ کچھ نہیں ہوگا اور یہ ہوگیا ہے۔ کہنے لگے کہ اب اِس کا کیا علاج ہے کہ وہ اُس کو بدل کے وہاں لکھ آیا تھا تو میں کیا کروں۔ ''اوجا کے لکھ آیا سی''۔ [2] کیا تماشے ہو رہے ہیں!!! اُن تختوں پہ جا کر یہ لکھنا ہی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ حضرت صاحب! ڈاکٹر کہتے ہیں، طبیب کہتے ہیں کہ میری قسمت میں تو اولاد نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کوئی بات نہیں ہے، ہم نے جو کہہ دیا ہے کہ ہم اِس کا بندوبست کریں گے۔ ذرا سا، تھوڑا سا، اُس میں فرق رکھ لیتے ہیں۔ وہ یہ کہ کہتے ہیں کہ ہم خدا سے کہہ کے کروائیں گے۔ یعنی یہ نہیں کہہ دیتے کہ میں خود ہی کرآؤں گا۔ بہرحال یہ اُس سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ یعنی خود چوری چھپے کرآئے تو پھر یہ ہوا کہ اُسے تو علم نہیں۔ کہتے ہیں کہ اُس سے جا کر کروا آؤں گا۔ ''یعنی اووی ایناں نے ایناں مجسٹریٹاں وچوں ایک مجسٹریٹ سمجھیا ہویا ہیگا کہ جا کے کروا آئی دا جو مرضی۔'' [3] پتہ ہے کہ یہ مقدمہ سننے کے بعد، آخر میں یہ سب کچھ فیصلہ ہونے کے بعد، وہ کہتے ہیں کہ فیصلہ انہوں نے محفوظ رکھا ہے۔ ''اے محفوظ کاہدے لئی رکھیا ہویا ہُندا اے؟ ایس لئی کہ جا کے کیہڑا کچھ کروا اوندا اے۔'' [4]

## روٹی کے اس چکر نے انسانوں کو بیوقوف بنا رکھا ہے

عزیزانِ من! اُس کے ہاں کوئی فیصلہ محفوظ نہیں ہوتا، اُس کے ہاں ہر چیز اُس کے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ انسان تو ایک طرف رہا، وہ خود کہتا ہے کہ **لَا تَبۡدِيۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ** (10:64) اور **لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ** (6:34) کوئی اُسے تبدیل نہیں کرسکتا

---

[1] ہم تو ہم نوالہ ہم پیالہ ہیں، ہم تو اکٹھے ہی جاتے ہیں۔

[2] وہ جا کر لکھ آیا تھا۔

[3] یعنی وہ بھی انہوں نے انہیں مجسٹریٹوں میں سے ایک مجسٹریٹ سمجھا ہوا ہے کہ جا کر جو مرضی ہو کروا آتے ہیں۔

[4] یہ کاہے کے لیے انہوں نے محفوظ رکھا ہوتا ہے؟ اس لیے کہ جا کر کون کیا کروا آتا ہے۔

لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً (35:43) ہم خود بھی اُسے تبدیل نہیں کرتے۔ عزیزانِ من! احبار و رہبان کی کمائی کا ذریعہ اس نے کاٹ کر رکھ دیا۔ اور آپ کے سروں سے ان تواہم پرستیوں کی جو بوجھ کی سلیں تھیں، وہ اٹھا دیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے متعلق قرآن نے یہی کہا ہے کہ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (7:157) انسانیت کے سروں کے اوپر تواہم پرستیوں کی جو سلیں رکھی ہوئی ہیں، یہ اُن کو اتار پھینکے گا۔ احبار و رہبان نے جو اِن کو اپنی زنجیروں کے اندر جکڑ رکھا ہے وہ اِن زنجیروں کو توڑ دے گا۔ انسان آزاد پیدا کیا گیا ہے، نبی ﷺ اسے آزاد رکھے گا۔ کسی گورنر نے ❶ نے اپنے دروازے کے سامنے چوکیدار، نگران بٹھا دیئے تھے۔ بابِ خلافت سے حضرتِ عمرؓ کا حکم چلا گیا کہ کیا کر رہے ہو؟ خدا نے انسانوں کو آزاد پیدا کیا ہے تم اُن کو محکوم بنانا چاہتے ہو۔ یہ ہے تحفظ انسان کی آزادی کا جو قرآن دیتا ہے۔

## انسان کے من کی تبدیلی ہی باہر کی تبدیلی کا مظہر ہوتی ہے

کسی کی دعا سے قضا نہیں بدلتی، غیب کا علم کوئی نہیں جانتا۔ ان کے دروازوں کے اوپر مت جاؤ: نہ دعائیں منگوانے کے لیے، نہ قسمت کا حال معلوم کرنے کے لیے۔ دعا مانگنی ہے تو اپنے اندر کی تبدیلی کی دعائیں مانگو، صحیح راستے معلوم کرنے کی پکار اُس سے کرو، صحیح قانون معلوم کرنے کے متعلق کوشش کرو۔ یہ ہے دعا۔ غیب کے متعلق جاننا چاہتے ہو کہ ''کل'' (Future) کیا ہوگا تو جو چیزیں قانون کے مطابق ہوتی ہیں، وہ قانون معلوم کرلو۔ اور قانون کی صورت یہ ہے کہ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (2:31) کائنات کے ہر Phenomenon (مظہر) کے متعلق ہم نے انسان کے اندر صلاحیت رکھ دی ہے کہ وہ اُس کے قانون کو معلوم کر سکے۔ باقی رہے تم تو تم تو صاحب اختیار و ارادہ ہو۔ صاحبِ اختیار کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کل (Future) کو کیا کرے گا۔ اس لیے ان کی ان فریب کاریوں کے اندر مت آؤ۔ نہ کوئی حضرت صاحب دعا مانگ کر قسمت بدلا سکتے ہیں، نہ کوئی پیر ہی تمہارے متعلق بتا سکتا ہے کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ علم کی طرف آؤ۔ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ❷ (27:66)۔ یہ بڑی چیز ہے۔ اس سے پہلے کہا تھا کہ

---

❶ یہ مصر کے ایک حاکم عیاض بن غنم تھے۔ ان کے متعلق شکایت پہنچی تھی کہ وہ باریک کپڑے پہنتے ہیں اور انہوں نے دروازے پر دربان مقرر کر رکھا ہے۔ حضرت عمرؓ (581-644/45) نے انہیں ان کے عہدے سے معزول کر دیا۔ مدینے بلا لیا۔ اور ان سے کہا کہ اپنی قمیض اتار کر جبہ پہنو۔ بکریوں کا گلہ لے کر جنگل کی طرف جاؤ۔ وہاں بکریاں چراؤ اور ہر راہگزر کو پانی پلاؤ، اس سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ راعی کے فرائض کیا ہیں اور رعیّت کے حقوق کیا۔ (پرویزؒ: شاہکارِ رسالت، ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)، لاہور (1987) ص۔224)۔

❷ جہاں تک آخرت کی زندگی کا تعلق ہے اس کے متعلق نوعِ انسان کو (وحی کے ذریعے) مسلسل اور پیہم علم حاصل ہوتا رہا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔876)۔

وَ مَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ (27:65) یہ مردے تو خود اپنے متعلق بھی نہیں جانتے کہ ہم کب اٹھائے جائیں گے تو یہ تمہارے متعلق کیا بتا سکیں گے۔

## آخر ظالم کی یہ کھیتی پنپتی کیوں ہے؟

قرآن کریم کہتا ہے کہ بَلِ ادّٰرَکَ عِلْمُهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْهَا بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ o وَ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّ اٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ o لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (27:66-68) جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ ہر عمل کا نتیجہ ہمارے مقرر کیے ہوئے قانونِ مکافات کے مطابق نکلے گا' تو یہ کہتے ہیں کہ قانونِ مکافات یہ ہے کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی اور یہاں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ تو دن بدن پنپتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ہے وہ مقام جہاں قرآن پہ ایمان کی بات آتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ساری بات یہ ہے کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ زندگی یہی Physical Life یعنی یہی طبعی زندگی ہے' اِسی دنیا کی زندگی ہے' یہیں نتائج برآمد ہونے ہیں' اِس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ جو تمدنی قوانین ہیں ان کی خلاف ورزی سے کوئی سزا وغیرہ ملتی ہے' یہ قانون ہے کہ جس کی سزا کچھ ہوتی ہے۔ Keep to the left[1] قانون ہے۔ دائیں طرف آپ چلیں گے تو سپاہی دیکھ لے گا اور گرفتار کر کے جرمانہ کر دے گا تو سزا ہوئی۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر چوراہے پہ سپاہی ہو ہی نہیں تو بچ گئے' اگر ہو اور آپ کی جیب میں اٹھنی [2] ہو تو بچ گئے' اِس سے آگے کچھ نہیں۔

## دل میں گزرنے والے خیالات کی گرفت کا احساس سیکولر نظریات میں نہیں ہوتا

اُس سارے نظام میں یہ چیز ہے کہ خدا کہتا ہے کہ تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات بھی اپنا نتیجہ پیدا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خیالات کے اوپر تو گرفت ہی نہیں ہوتی۔ یہ آپ کے ہاں کے جو Laws (قوانین) ہیں جو ملکی قوانین ہیں' یہ سیکولر Laws (قوانین) ہیں۔ اور اُن کی گرفت سے بچنے کے لیے ہزار طریقے موجود ہیں' تو پھر سزا کیسے مل سکتی ہے۔ یہ تو آپ کے ہاں کے جو موجودہ حکومتوں کے قوانین ہیں' اُن سے بچنے کی بات ہے۔

---

[1] بائیں طرف چلو

[2] آٹھ آنے۔ یہ اس وقت یعنی 1978-10-20 کو کہا گیا تھا جب 16 آنے کا ایک روپیہ ہوتا تھا۔

## فقہ کے تحت چوری کی سزا سے بچنے کا طریق

شاید آپ کو معلوم نہ ہو اور یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ آپ کے ہاں جو فقہ ہے یعنی وہ جنہیں شرعی قوانین کہتے ہیں' فقہ کی کتاب کے اندر وہ قوانین لکھے ہوتے ہیں۔ اُس کے آگے ایک باب کتاب الحیل ہے۔ اُس میں لکھا ہوتا ہے کہ اِن قوانین سے Avoid (احتراز) کرنے کا' ان سے بچنے کا طریقہ کیا ہے؟ کہ جی! اُن سے بچنے کا بھی طریقہ ہے۔ آپ کو کچھ تعجب سا ہوا ہے کہ یہ اُس میں کس قسم کا طریقہ ہے؟ وہ کیا حیلے ہیں جن سے وہ بچ سکتا ہے؟ اس کی ایک مختصر سی مثال لیجیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ چوری کی سزا ہے۔ چور کی سزا تو بڑی بھیانک ہے یعنی ہاتھ کاٹنے کی۔ انہوں نے کہا کہ بات ہی کچھ نہیں۔ چوری کے لیے Definition (تعریف) یہ ہے کہ جو مالِ محفوظ ہے اُس کو جو شخص مالک کی مرضی کے بغیر لے جاتا ہے تو یہ چوری ہے۔ ہوا یہ کہ باپ بیٹا دونوں گئے۔ باپ نے نقب لگائی اور الگ ہٹ گیا' بیٹے نے اندر جا کر مال کی گٹھڑی اٹھائی اور باپ کے سپرد کر دی اور لے آئے۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ جو سرقہ یا چوری ہے اِس کا ارتکاب ہوا ہی نہیں ہے۔ چوری کی Definition (تعریف) یہ ہے کہ مالِ محفوظ ہو۔ جب اُس نے نقب لگا دی تو مال محفوظ نہ رہا' غیر محفوظ ہو گیا۔ اس بیٹے نے غیر محفوظ مال اٹھایا ہے۔ باپ نے جو لیا ہے وہ اُس نے اٹھایا بھی نہیں ہے یعنی اُس نے تو بیٹے سے لیا ہے۔ چوری کی سزا مل ہی نہیں سکتی۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ جو قوانین انسانوں کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں اُن قوانین سے بچنے کی تو ہزار راہیں ہوتی ہیں۔ یہ اُس کا قانون ہے۔ لیکن وہ تو اُسی صورت میں ہے اگر زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے تو پھر تو یہ سوال ہی نہیں ہے کہ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہوگا یا سزا ملے گی۔ انسان بچ سکتا ہے۔

## خدا پر ایمان کے معنی اُخروی زندگی کے سلسلہ میں مکافاتِ عمل کو تسلیم کرنے میں ہے

یہاں قرآن کہتا ہے کہ یہ ہے بنیادی چیز' جسے ایمان کہتے ہیں۔ اصل میں خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اِس چیز پہ ایمان کہ زندگی اِسی دنیا کی طبعی جسمانی زندگی نہیں ہے بلکہ زندگی آگے بھی چلتی ہے۔ انسان کا جو عمل ہے' جو کام ہے' جو فعل ہے' جو جرم ہے' جس کا ارتکاب کرتا ہے' یہ اِس کا جسم نہیں کرتا' اِس کے اندر ایک چیز ہے جو فیصلہ کرتی ہے کہ یہ چیز اٹھا لے۔ ہاتھ تو اُس فیصلے کی پابندی کر کے اٹھا لیتا ہے' یہ ذمہ دار نہیں ہے' اِس کو سزا نہیں مل سکتی۔ وہ جو اس کے اندر کہنے والا ہے کہ اٹھا لے' وہ ہے ذمہ دار۔ اور اگر زندگی اِسی دنیا کی زندگی ہے تو وہ تو انسان کے مر جانے کے بعد وہ سب کچھ ہی ختم ہو گیا ہے۔ وہ کہنے والا کس کے قابو آئے گا۔ اس پہ قرآن شروع سے آخر تک زور دیتا ہے کہ یہ انسان کے جسم کے مرنے کے ساتھ' وہ جو انسان کے اندر کہنے والا ہے کہ یہ ''اٹھا لے'' وہ نہیں مرتا' وہ آگے جاتا ہے' اپنے ان تمام اعمال کا بوجھ اپنے اوپر لیے ہوئے' ان کے نقوش اپنے اوپر لیے ہوئے' ان کے نتائج اپنے ساتھ

لیے ہوئے، وہ آگے جاتا ہے اور زندگی آگے چلتی ہے۔ اور یہ نتائج اُس کے سامنے آنے ہیں۔ یہاں اگر نہیں آتے تو اِس کے بعد جسم کے مرنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود

ایں مئے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود

## انسانی ذات عمر رسیدہ بھی نہیں ہوگی

وہ کہتا ہے کہ ذاتِ انسانی پہ تو بڑھاپا بھی طاری نہیں ہوتا۔ زمانے کا اور ٹائم کا اِس پہ اثر نہیں پڑتا۔ وہ جو حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ جنت میں سب جوان ہی جوان ہوں گے، بوڑھا کوئی نہیں ہوگا، وہ یہی بات ہے کہ بڑھاپا تو جسم پہ طاری ہوتا ہے، ذات پہ تو بڑھاپا طاری ہی نہیں ہوتا۔ یہ شراب جتنی پرانی ہوتی ہے زیادہ تیز ہوتی جاتی ہے۔

## سارے یورپ کی تباہی انسان کی اس ذات یا خودی یا Personality (شخصیت) کی حقیقت کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے ہے

عزیزانِ من! یہ ہے نکتہ اصل جس کو ایمان کہتے ہیں۔ یہ جو شے ہے اِسے ''میں'' کہتے ہیں، اسے نفس کہتے ہیں، اسے خودی کہتے ہیں، اسے انسانی ذات کہتے ہیں، اسے انسانی Personality کہتے ہیں۔ یہ Personality نہیں کہ سوٹ ذرا اچھا ہے۔ پرسنلٹی وہ ہے جو اندر میں [1] کہنے والی ہے۔ کہا کہ وہ انسان کی موت کے ساتھ مرتی نہیں۔ یہ جو پہلا تصور ہے جسے Materialism (مادّیت) کہتے ہیں، سارا یورپ اِس کے اندر کھو گیا اور یہ ساری تباہی اُس کی وجہ سے آ گئی۔ لیکن انہیں بھی اب ہوش آ رہا ہے۔ اور آپ حیران ہوں گے کہ اِس دور میں انسان اس تصور کو چھوڑ کر جس جہنم میں گرفتار ہوا ہے اور دنیا کی ہر قوم اُس جہنم میں گرفتار ہے، اُس سے متاثر ہو کر وہاں کے سائیکولوجسٹ ہی نہیں اُن کا تو تعلق ہی علم النفس سے ہے بلکہ وہاں کے سائنٹسٹ بھی اب یہ چیز کہنے لگ گئے ہیں کہ یہ بات ٹھیک ہے کہ یہ انسان کے اندر جو فیصلہ کرنے والی چیز ہے، وہ انسان کی طبعی موت سے مرتی نہیں ہے۔ اِس وقت تو وقت نہیں ہے۔ وقت ہو تو میں آپ سے عرض کروں۔ میرے پاس اس پہ بہت Material (مواد) ہے۔ ایمان ہے ہی یہ۔ عزیزانِ من! اگر یہ ہو کہ انسان جسم کی موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے تو پھر کسی اور چیز کے ماننے کی، نہ جزا و سزا کے ماننے کی کچھ ضرورت ہے۔ اس شے کو اگر مان لیا جائے کہ میں

---

[1] I - am- ness

جسم کی موت کے ساتھ نہیں مروں گا' میں آگے چلوں گا' اور میرے سارے اعمال میرے ساتھ چلیں گے اور اُس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا تو یہ ہے اصلِ ایمان۔ اسی لیے اُس نے یہ کہا ہے کہ

شاخِ نہالِ سدرۂ خار و خسِ چمن مشو

تُو تو وہ جو سدرۃ الکبریٰ ہے' اُس درخت کی ایک شاخ ہے' تم اپنے آپ کو اس مادی زندگی کے چمن کا خار و خس کیوں سمجھ رہے ہو۔ اگلا مصرعہ یہ ہے:

منکرِ اُو اگر شدی' منکرِ خویشتن مشو [1]

اگر تو خدا کا بھی منکر ہو گیا ہے تو کوئی بات نہیں' اپنی ''میں'' کا منکر نہ ہو جانا۔ یہاں ساری بات بگڑے گی۔ عزیزانِ من! قرآن اس ''میں'' کے ایمان کو ایمان بالآخرت کہتا ہے۔

## یورپ کے ایک نیوروسرجن پی ایچ ڈی رابرٹ وائٹ کی فکر انگیز پکار

میں نے کہا ہے کہ اب تو یورپ کے جتنے یہ بڑے بڑے سائنٹسٹ ہیں' وہ بھی اِس طرف آ رہے ہیں۔ ابھی اسی مہینے یعنی اکتوبر (1978ء) کے Readers Digest میں ایک چیز میرے سامنے آئی ہے۔ پچھلے سے پچھلے درس [2] میں تو میں نے آپ کو فرانس کے ایک سائنٹسٹ کی کتاب [3] بتائی تھی۔ اُس کتاب کے متعلق بتایا تھا کہ وہ کس طرح سے سائنس کے انکشافات کے بعد پکار کر کہتا ہے کہ او انسانوں! چودہ سو سال پیشتر کوئی انسانی فکر یہ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اون رکھو سائنسدانوں! یہ قرآن انسان کی کتاب نہیں ہو سکتی۔ ریڈرز ڈائجسٹ [4] میں یہ ایک مضمون آیا ہے۔ اس کا مصنف رابرٹ وائٹ ہے۔ وہ پی ایچ ڈی ہے' نیوروسرجری کا پروفیسر ہے' انٹرنیشنل فیم (عالمگیر شہرت) کا آدمی ہے۔ نیوروسرجری' دماغ کی سرجری (جراحت) کو کہتے ہیں۔ اُس کی ساری عمر اِس میں گزر گئی۔ وہ کہتا ہے کہ دماغ کا ایک ایک ذرہ' ایک ایک خلیہ میرے علم میں ہے۔ میری سرجری ہے ہی یہ کہ ایک ایک خلیے (Cell) کے متعلق میں جانتا ہوں کہ یہ کیا کرتا ہے' یہاں کیا نقص ہو گیا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ ساری عمر یہ کچھ کرنے کے بعد ایک چیز ہے جس تک نہ میری دسترس ہے' نہ کسی اور سائنسدان کی دسترس ہے' جو شاید سائنس کی دسترس سے ہی باہر ہے۔ یہ دماغ نام تو انہی Cells (خلیات) کا ہے' یہ Physical (جسمانی) ہیں لیکن اِن

---

[1] پرویزؒ: شرح مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1997' ص۔ 159

[2] اکتوبر 1978ء کی 6 تاریخ کا درس۔ اس کتاب کا ''چھٹا باب''۔

[3] Bucaille, Maurice (1998). The Bible, The Quran and Science. Lahore: Islamic Book Service.

[4] ماہ اکتوبر 1978۔

میں کہیں کوئی چیز ہے' جسے ہمارے ہاں والے Mind (مائنڈ) کہتے ہیں۔ وہ بھی کسی کو پتہ نہیں کہ وہ کیا ہے۔ اُن کے ہاں یہ ایک لفظ ہے' اِس کے اور بھی نام ہو سکتے ہیں۔

میں نے عرض کیا ہے کہ اُن کے ہاں کا یہ Mind (مائنڈ) ایک ایسا لفظ ہے کہ اِس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا' تصور بھی نہیں ہے کہ Mind (مائنڈ) کیا ہے۔ یہ وہی ہے' جو ہم اپنے ہاں ''میں''[1] کہتے ہیں۔ ''میں'' کا تصور نہیں ہو سکتا۔ یہ وہی ہے جسے ذات یا خودی یا انا بھی کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اِس کے اندر وہ چیز ہے کہ اِس Physical Brain (طبعی دماغ) کا اور اُس Mind (مائنڈ) کا جو اِس Brain (دماغ) کو حکم دینے والا ہے' باہمی ربط کیا ہے۔ یہ ہم بالکل نہیں بتا سکتے لیکن یہ Physical Brain (طبعی دماغ) نہیں ہے جو یہ کچھ کرتا ہے' جس میں حافظہ (Memory) ہے' جو حافظے (Memory) کو واپس لاتا ہے' جو پھر تمہیں بتاتا ہے کہ بیس سال پہلے جو واقعہ ہوا' وہ واقعہ کی یادداشت ہی نہیں لاتا بلکہ اُس واقعہ سے آپ کے اوپر جو اثر ہوا تھا کسی کے خلاف غصے کا' کسی کے متعلق خوشی کے جو وہ تاثرات ہوئے تھے' یہ وہ بھی واپس لاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دماغ کے جو طبعی خلیے ہیں' یہ اُن کا کام نہیں ہے۔ وہ کچھ اور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دماغ (Brain) اُس دوسری چیز کا Container (کنستر یا ظرف) ہے۔ اُس کے لیے وہ ایک لفظ ہے' جسے ہم Mind کہتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ ہے کیا لیکن میں ساری عمر کے تجربے کے بعد کہہ سکتا ہوں کہ یہ جو Brain (دماغ) کے مادی خلیے ہیں' Cells ہیں' یہ اُن کا کام نہیں ہے۔ اِس میں کچھ اور شے ہے جس کا یہ کام ہے۔ اُس کے بعد وہ یہ کہتا ہے:

I also find it unreasonable to suppose that as brain those powerful entities of intelligence, personality and memory simply cease to exist.

یعنی اِس دماغ (Brain) کی موت کے ساتھ وہ جو شے ہے جو حافظہ (Memory) رکھتی ہے' تاثر رکھتی ہے' احساسات رکھتی ہے' جو نتائج کے نقوش اپنے اوپر رکھتی ہے' وہ بھی مر جائے گی۔ یہ بالکل بکواس ہے' یہ بالکل غلط ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی ہستی ختم نہیں ہو سکتی۔ اس کے فوراً بعد وہ کہتا ہے کہ

Far more reasonable is to believe that the essence of us escapes from a container, the brain, which no longer is stable of supporting us and finds supported in a new dimension.

---

[1] I-am-ness

عزیزانِ من! Essence کا ترجمہ بھی نہیں ہوسکتا۔ وہ کہتا ہے کہ وہ جو ''ہم'' ہیں' جو ''میں'' ہے' جو ہماری اصل ''ذات'' ہے' ہماری Essence ہے' Brain (دماغ) کی موت سے وہ Essence جو اِس نے اپنے اندر سنبھال کے رکھی ہوئی تھی' وہ Brain اُسے آگے منتقل کر دیتا ہے۔ آگے اِس کو سنبھالنے والا کوئی اور ہے جو اس Brain (دماغ) سے زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے۔ وہ اُس کو سنبھال لیتا ہے' اور اِس طرح سے وہ آگے چلتا ہے۔ Brain (دماغ) کے اِن خلیات (Cells) کے تباہ ہو جانے سے میری جو Essence ہے' اُس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ عزیزانِ من! یہ West (مغرب) کا سرجن ہے جو یہ کچھ لکھ رہا ہے۔ یہ ہے جس کو آپ حیاتِ جاوداں یا آگے چلنے والی زندگی کہتے ہیں۔ اب تک یہی صورت تھی۔ برگسان (1859-1941) کی کتاب (1929ء) Matter & Memory ہے۔ یہ بڑی عجیب و غریب مگر فلسفے کی بڑی اہم کتاب ہے۔ اُس نے بھی کہا تھا کہ جو Memory (میموری) ہے یعنی جو حافظہ ہے' یہ Material Cells (مادی خلیات) کا نتیجہ نہیں ہے۔ رابرٹ وائٹ جس کا ابھی ابھی میں نے تذکرہ کیا ہے' ایک سرجن ہے۔ یہ دماغ (Brain) کے ایک ایک خلیے سے واقف ہے اور وہ عمر بھر کے تجربے کے بعد کہہ رہا ہے کہ یہ جو Essence of us ہے' جسے قرآن نے ''نفس'' کہہ کر پکارا ہے' اُس رابرٹ وائٹ نے بھی یہ چیز کہی ہے۔ اِس نے کہا ہے کہ انسان کا Intelligence (ذہانت) انسان کا شعور' انسان کی فکر' یہ ہے جو اصلِ Essence ہے۔ قرآن نے بھی یہ بتایا ہے کہ اس Essence کے ساتھ' جسے قرآن نفس کہہ کر پکارتا ہے کیا ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! بہت اہم اور عظیم آیت ہے۔ فلاسفرز اور سائیکولوجسٹ اِس آیت کو دیکھتے ہیں تو سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ آیت یہ ہے کہ **اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا** [1] (39:42)۔ شعورِ انسانی' Essence of us وہ اصل ذات' اصل انسان ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ہماری زبان میں الفاظ مکمل نہیں ہوتے ہیں۔ اِسے قرآن نفس کہتا ہے۔ شعور' فکر' Intelligence (ذہانت)' Memory (حافظہ) وہ سارا اُس کا ہے۔

## نیند کی حالت کی طرح' موت کی حالت میں' انسانی شعور کو روک لیا جاتا ہے

قرآن کہتا ہے کہ انسان کی دو حالتیں ہوتی ہیں: (1) نیند کی حالت میں بھی شعور کارفرما نہیں ہوتا اور (2) موت کی حالت میں بھی شعور کارفرما نہیں ہوتا۔ جب انسان نیند سے بیدار ہوتا ہے تو اُس کا Brain (دماغ) کام کرنے لگتا ہے' ساتھ ہی وہ (شعور) بھی کارفرما ہو جاتا

---

[1] (لیکن اختیار و ارادہ بھی تو اُسی کا روبہ عمل آ سکتا ہے جو اپنے شعور سے کام لے۔ شعور کے معطل یا سلب ہو جانے کی حالت میں' انسان اپنے اختیار و ارادہ سے کام ہی نہیں لے سکتا۔ اس کا مشاہدہ تم اپنے عملی زندگی میں ہر روز کرتے ہو۔ (مثلاً) نیند کی حالت میں یا موت کی صورت میں انسانی شعور باقی نہیں رہتا۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1079)۔

ہے۔قرآن کے الفاظ میں یہ ہے کہ ہم اُسے واپس دیدیتے ہیں۔موت کی حالت میں انسان کا یہ جسم یہاں رہتا ہے' وہ کہتا ہے کہ وہ جو شے ہے' اُسے ہم اپنے ہاں روک لیتے ہیں۔قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ❶ (39:42)۔بیداری کی حالت میں ایک وقتِ معینہ کے لیے جب تک اِس نے زندہ رہنا ہے اُسے ہم واپس بھیج دیتے ہیں۔اور موت کی حالت میں اُسے اپنے پاس رکھتے ہیں اور وہاں جو بیداری کی حالت ہے تو وہ اُسے وہاں دیدی جائے گی۔لیکن اُس کا جو Container (کنستر' ظرف) ہے' وہ اِس Container (کنستر' ظرف) سے مختلف ہوگا۔عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے نہ کوئی اُس زمانے میں دماغ کے متعلق جانتا تھا' نہ اُس کی Working (عمل) کے متعلق' نہ Essence کے متعلق' نہ اِس چیز کے متعلق کہ اندر کوئی Container (کنستر' ظرف) اور ہے۔یہ حالت ہوتی ہے کہ نیند میں معطل ہوتا ہے۔موت میں اُس کو ہم ادھر واپس نہیں بھیجتے' وہاں Container (کنستر' ظرف) میں رکھتے ہیں اور وہ Container (کنستر' ظرف) اس سے مختلف ہوتا ہے۔کہا کہ جو بات ہم نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ❷ (39:42)

جو قوم غور وفکر سے کام لے گی تو اُسے پتہ چلے گا کہ ہم کیا کہہ گئے ہیں۔یہ بات تو سر جن رابرٹ وائٹ جیسے ہی کہہ سکتے ہیں۔کہا کہ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا (27:67) اور اس کا انکار کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّ اٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ (27:67) جب ہم اور ہمارے آباؤ اجداد مر جائیں گے' مٹی ہو جائیں گے' سڑ جائیں گے' ہڈیاں گل جائیں گی تو یہ پھر بھی کہہ رہے ہیں کہ پھر بھی زندگی آگے چلے گی۔کہا کہ کیا ان کو یہ علم ہے؟ اِن کی نگاہ اِس محسوس جسم کے اوپر ہے۔کہا کہ یہ تو ٹھیک ہے' یہ ایسے ہی ہو جائے گا مگر وہ جو Container (کنستر' ظرف) ہے اس Container (کنستر' ظرف) کے اندر' اُن کی نگاہ نہیں ہے۔وہ ہے چیز۔

## غور وفکر کرنے والوں کے لیے اس میں بڑی نشانیاں ہیں

قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ لوگ طنزاً کہتے ہیں کہ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ

---

❶ نیند کے بعد' جب انسان بیدار ہوتا ہے تو اس کا شعور واپس آ جاتا ہے (اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا شعور کچھ وقت کے لیے معطل ہو گیا تھا)۔لیکن موت کی صورت میں' وہ شعور' اُس کے طبعی جسم کی طرف لوٹ کر نہیں آتا۔(یعنی جہاں تک اُس کی اس دنیا کی زندگی کا تعلق ہے' وہ سلب ہو جاتا ہے)۔ان دونوں حالتوں میں' جب شعور کارفرما نہیں ہوتا' انسان اپنے اختیار وارادہ کو کام میں نہیں لا سکتا۔(پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1079)۔یہی شکل انسان کی اخلاقی دنیا میں بھی ہے۔جب اس پر اس کے جذبات غالب آ جائیں یا اس نے اندھی تقلید کی روش اختیار کر رکھی ہو' تو اس کا شعور بیکار ہو جاتا ہے۔اس صورت میں اگر وہ ضد اور تعصب سے کام نہیں لیتا' تو اس کے شعور کے کارفرما ہونے کا امکان ہوتا ہے جس سے وہ صحیح راستہ اختیار کر لیتا ہے لیکن اگر وہ ضد اور تعصب میں آگے ہی آگے بڑھتا جائے' تو اس کی شعوری صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں اور ان کی بازیابی کا امکان ہی نہیں رہتا۔یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں۔(2:7)۔(پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1080)۔

❷ ان حقائق میں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر سے کام لیں حقیقت تک پہنچنے کی واضح نشانیاں ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1080)۔

**الْاَوَّلِیْنَ** (27:68) ہمیں بھی ایسا ہی کہا جا رہا ہے اور جی ہمارے بڑوں کے متعلق بھی کہتے رہے کہ ہاں زندہ ہوں گے وہ تو قبروں میں ہیں۔ یہ یونہی اساطیر الاولین ہیں اگلے لوگوں کی کہانی ہے۔ تو کہا کہ یہ اگلے لوگوں کی کہانیاں نہیں ہیں۔ بات ساری یہی ہے کہ جو فکر اور غور سے کام لیں گے اُن کی سمجھ میں یہ بات آئے گی۔ نہ تو اُن کی سمجھ میں بات آئے گی جو جھٹک کر کہہ دیں گے کہ زندگی یہی زندگی ہے۔ ان کے قول کے مطابق زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب ہے۔❶ چکبست انڈیا کا بہت بڑا کمیونسٹ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب ہے کچھ Elements (عناصر) ہیں۔ ان میں خاص Proportion (تناسب) سے ایک ربط پیدا ہوا لائف (زندگی) وجود میں آ گئی۔ موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا۔ یہ اجزا پریشاں ہو گئے تو موت واقع ہو گئی اور معاملہ ختم ہو گیا۔

## انسان کے اندر حافظے کی قوت مادّیت کی رہین منت نہیں ہے

قرآن کہتا ہے کہ اِن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی۔ یہ فکری بات ہے۔ صرف ظاہری قسم کے اوپر اُن کی نگاہ ہے۔ جو کچھ اندر کارفرما ہے جو فیصلے کرنے والی اندر قوت ہے جو حافظے (Memory) کی قوت ہے جو Intelligence (ذہانت) کی قوت ہے انہوں نے اُس کو بھی مادی دماغ (Material Brain) کی ہی کارفرمائی سمجھ لیا ہے۔ یہ بات غلط ہے۔ یہ اُن کی سمجھ میں نہیں آئے گا جو اپنے ہاں صرف ایک روایتی ایمان کے طور پہ اسے مانتے چلے آ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے ایمان تو یہی ہونا چاہیے لیکن ایمان تو وہ ہے کہ جب اُس سے دلیل مانگی جائے تو دلیل سے اُس کا ثبوت پیش کیا جائے۔ ایمان اُسے کہتے ہیں۔ یہ ان میں نہیں ہے۔

## ایسا ایمان جو ٹھوس دلیل کے اوپر مبنی نہ ہو وہ ایمان ہی نہیں کہلاتا

دلیل تو یہ بھی نہیں دے سکتے۔ وہاں تو یہ چیز ایمان سے ہے۔ اللہ تعالیٰ مارے گا مار کے زندہ کرے گا ٹھیک ہے قرآن کی آیت ہے۔ لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ ایمان وہ ہے جو دلائل پہ علم و بصیرت پہ مبنی ہو اور آپ اُس کے لیے دلیل دے سکیں۔ عزیزانِ من! دلیل سر جن رابرٹ وائٹ دے سکتا ہے ہم کیا دلیل دیں گے۔ جن کے ہاں دلیل اور قیاس ہے اُس کو کہا جاتا ہے کہ یہ ابلیس کا کام ہے۔ **اول من قاس فھو ابلیس** جس نے سب سے پہلے قیاس کیا وہ ابلیس ہے۔ قرآن تو دلیل پیش کرتا ہے۔ اور اُس کے بعد آگے ایک اور بات کہتا ہے کہ ٹھیک ہے یہ چیز تم کہتے ہو۔ وہاں کی بات تو اہلِ فکر جانیں گے کہہ دو گے کہ وہاں جا کر دیکھیں گے۔ اب تو آرام سے گزرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے۔ خدا ہی نہیں جانے تم بھی جان سکتے ہو۔ اُس نے کہا ہے کہ **یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ**

---

❶ زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا

الْاَرْضِ (3:191) وہ کائنات کی تخلیقی ترکیب (اندازِ پیدائش) پر غور وفکر کرتے رہتے ہیں۔ قرآن میں یہ ہے۔

## تاریخی طور پر قوموں کی بدعنوانیوں کے نتائج ان کے سامنے ہیں

جسے یہ کہتے ہیں کہ یہ میٹا فزکس ہے' یہ ماوراء الفکر ہے' قرآن کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ حیاتِ دنیا اور حیاتِ آخرت' اِن دونوں کے اوپر جو فکر کرنے والے ہیں وہ مومن ہیں۔ یہ محسوس نہیں ہے کہ وہ یوں سامنے نظر آ جائے فکری طور پہ بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ یہ بات رابرٹ وائٹ کے سمجھ میں آئی ہے۔ کہتا ہے کہ یہی چیز ادھر تمہیں دکھا دیں گے۔ آپ کو اتنا لمبا انتظار ہی نہیں کرنا پڑے گا کہ وہاں جا کر یہ دیکھیں۔ یہاں تمہیں قومیں نظر آئیں گی جنہوں نے یہ ہر قسم کا انتظام کر لیا ہے کہ ہماری جتنی بھی ''حرامیاں'' ہیں' معاف رکھیے گا یہ پنجابی کا لفظ درمیان میں آ گیا' ہے ان کے لیے یہ Corruption بڑا جامع لفظ ہے' خرابیاں ہیں' بدعنوانیاں ہیں' یہ سب اکٹھی کر لیجیے تو ''ایہدے وچ آ جاندا اے''[1]۔ انہوں نے انتظام اِس قسم کا کر لیا ہے کہ ہم جو کچھ بھی کریں' بدعنوانیاں کریں' گرفت میں نہ آسکیں' نہ اِس کا نتیجہ بھگت سکیں۔ کہا کہ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ[2] (27:69)۔ قوموں کی تاریخ پہ نگاہ ڈالیے کہ کتنے کتنے انتظامات انہوں نے کر لیے تھے اور اُن کے باوجود پھر تباہیاں اُن مقامات سے آئیں مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ (16:45) جو اِن کے شعور میں بھی نہیں تھا کہ کہاں سے آیا کرتی ہیں۔ یہ بھی تو خدا کا ایک قانون ہے جو یہاں کارفرما ہے۔

عزیزانِ من! آج درس کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ آئندہ سورۃ النمل کی آیت 69 لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀❀.....❀❀.....❀❀

---

[1] وہ سب اس ایک لفظ ''حرامیاں'' میں آ جاتا ہے۔

[2] (اسی بنا پر یہ خدا کے قانونِ مکافات سے بھی انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جو ہم سے کہا جا رہا ہے کہ ہماری غلط روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا' یہ بھی یونہی دھمکی ہے)۔ ان سے کہو کہ دنیا میں چلو پھرو اور (اقوام گزشتہ کے کھنڈرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بتاؤ کہ) جن اقوام نے انسانیت کے خلاف جرائم کی روش اختیار کر رکھی تھی ان کا انجام کیا ہوا؟ (کیا وہ کامیاب و کامران رہیں یا تباہ و برباد ہو گئیں؟)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص: 877)۔

# نواں باب: سورۃ النمل (آیات 69تا81)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٦٩﴾ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿٧٠﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٧١﴾ قُلْ عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿٧٢﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٧٣﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٤﴾ وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٧٥﴾ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿٧٦﴾ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٧﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿٧٨﴾ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿٧٩﴾ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿٨٠﴾ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿٨١﴾

عزیزانِ من! آج نومبر 1978ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ النمل کی آیت 69 سے ہو رہا ہے: (27:69)۔

## سطحی نگاہوں کو قرآنِ حکیم کے اندر کہیں ربط نظر نہیں آتا

سابقہ آیات میں یہ کہا گیا تھا کہ یہ لوگ اس چیز پہ تعجب کرتے ہیں کہ جب ہم مر مرا جائیں گے، ہمارا جسم گل سڑ جائے گا، ہڈیاں راکھ ہو جائیں گی، تو کیا اس کے بعد ہمیں پھر زندہ ہونا ہوگا؟ یہ بات پچھلے درس میں آ گئی تھی۔ تو گویا یہ جسے ہم اخروی زندگی یا حیاتِ آخرت یا ایمانِ بال آخرت کہتے ہیں اس سے انکار ہے۔

اس سے اگلی آیت ہے کہ **قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ** (27:69)۔ ان سے کہو کہ ذرا دنیا میں چل پھر کر دیکھیں، اقوامِ سابقہ کی کھلی ہوئی بستیوں پر نگاہ ڈالیں، ان کے کھنڈرات کی اینٹوں پر لکھی ہوئی ان کی داستانیں پڑھیں۔ یہ وہ قومیں تھیں جو دوسروں کے پھلوں کو کاٹ کر اپنے گھروں میں لے جاتی تھیں۔ آپ ان کی یہ داستانیں، پڑھیں اور دیکھیں کہ

ان کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔ نظر بظاہر ان دو آیات میں یا جو کچھ پہلے کہا گیا ہے اسے دیکھیں کہ وہ کیا کرتے ہیں' اس میں اور اِس آیت میں انہیں ربط نظر نہیں آتا کہ وہ حیاتِ آخرت سے انکار کر رہے ہیں' انہیں اس پر اعتراض ہے۔ اور اگلی آیت میں بجائے اس کے کہ اس کے متعلق کوئی دلیل دی جائے کہ نہیں یہ یوں ہوسکتا ہے' اس دنیا میں اقوامِ سابقہ جو تباہ اور برباد ہوئیں' کے انجام کی طرف توجہ مبذول کرائی جا رہی ہے کہ ذرا دیکھو تو سہی کہ ان کا انجام کیا ہوا۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ ان میں کوئی جوڑ نہیں ہے لیکن جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن تو الحمد سے والناس تک ایک مربوط کتاب ہے۔ ان کے اندر بڑا گہرا ربط ہے۔

## حیاتِ آخرت یا اخروی زندگی کا بنیادی مفہوم اور خدا کو ماننے اور نہ ماننے کا تصور

یہ جسے ہم حیاتِ آخرت یا اخروی زندگی پر ایمان کہتے ہیں' کیا ہے؟ ایک شخص مانتا ہے کہ ہاں صاحب! مرنے کے بعد پھر بھی زندہ ہوں گے۔ دوسرا کہتا ہے کہ نہیں صاحب! یہ بات غلط ہے' ہم مرنے کے بعد زندہ نہیں ہوں گے۔ تو ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ اول تو یہ جو ماننا ہے یہی لفظ بڑا مغالطہ انگیز ہے۔ میں اللہ کو مانتا ہوں جی۔ پھر مانتے ہو تو کیا ہوا؟ یا نہیں مانتا تو کیا ہوا؟ ماننے کا لفظ ہی نہیں آنا چاہیے۔ ایک کہتا ہے کہ حیاتِ آخرت کو میں مانتا ہوں' دوسرا کہتا ہے کہ نہیں مانتا ہوں۔ یہ ہے کیا بات؟ یہ اتنی اہم بات ہے کہ دین کا سارا مدار آخرت کے ایمان پر ہے۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ حیاتِ آخرت پر ایمان درحقیقت خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان ہے۔

## اگر قانونِ مکافات کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر خدا پر ایمان کوئی معنی نہیں رکھتا

خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی' کیا بات ہے! یہ قانون سمجھ لیا جائے تو پھر پتہ چلتا ہے کہ حیاتِ آخرت پر کس کا ایمان ہوتا ہے۔ ہم جو سب زبان سے اقرار کرتے ہیں اور اب تو ہماری اگلی نسل کی اکثریت وہ ہے جو زبان سے بھی انکار کرتی ہے' یعنی ان کو اقرار کا موقع ہی نہیں آتا۔ ہم پرانے لوگوں کو تو موقع آتا تھا تو اسے کلمہ پڑھاتے تھے' وہ ایمان کی ہمارے ہاں ایک رسم تھی اسے دہرایا کرتے تھے۔ اب تو اس کا موقع بھی کم ہی آتا ہے۔ بہرحال جو مانتے بھی ہیں تو وہ یہی مانتے ہیں کہ ہم آخرت پر ایمان کو مانتے ہیں۔ یہ ایمان بالآخرت کیا ہے؟ اس سے ہماری دنیاوی زندگی میں ہوتا کیا ہے؟ کسی کی چیز چرانا جرم ہے۔ یہ کس نے جرم قرار دیا ہے؟ آپ کی سوسائٹی نے' آپ کی حکومت نے؟ حکومت نے ایک قانون بنایا کہ کسی کی چیز چرانا جرم ہے' جو اس جرم کا ارتکاب کرے گا وہ پکڑا جائے گا۔ عدالت میں اگر جرم ثابت ہو گیا تو اس کو سزا ملے گی۔

## انسانوں کے بنائے ہوئے قانون میں جرم کی نوعیت اور انتظامی امور کا نتیجہ

پہلی چیز تو یہ ہے جسے کہتے ہیں کہ حکومت نے قانون بنایا ہے۔ وہ قانون کیا بنتا ہے؟ کسی کی جیب کاٹ لینا' جسے جیب تراشی کہتے

ہیں' دس روپے اس کی جیب میں سے لے جانا جرم ہے مگر ایک روپے کی چیز کے کسی سے دس روپے لے لینا جرم نہیں ہے کیونکہ قانون نے اسے جرم قرار نہیں دیا۔ سو پہلی چیز یہ ہے۔ یہ تو خود قانون کی بات ہوگئی کہ قانون جس چیز کو جرم قرار دے وہ جرم ہوتا ہے۔ کسی محنت کش سے دن بھر کام لینا' محنت کرانا' اس نے اگر کارخانے میں سو روپے کی چیز پیدا کر کے دی ہے اور اسے آپ بیس روپے دیہاڑی (Wages) مقرر کی ہوئی دے دیتے ہیں' باقی اسی روپے آپ کے لیے شیرِ مادر کی طرح حلال ہیں' یہ جرم نہیں ہے کیونکہ قانون نے اسے جرم نہیں قرار دیا۔ پہلی چیز تو یہ ہوگئی۔ پھر یہ جو چیز جرم ہے کہ کسی کی چیز چرا لینا یا گرہ کاٹ لینا' اگر تو وہاں کوئی دیکھنے والا موجود ہے تو آدمی گرفت میں آ سکتا ہے' اگر دیکھنے والا موجود نہیں ہے تو گرفت میں نہیں آ سکتا۔ اگر گرفت میں بھی آتا ہے اور فرض کرو کہ وہاں کوئی سپاہی موجود ہے' سو روپے کی چیز آپ نے چرائی ہے اور دس روپے اس کے ہاتھ میں تھما دیجیے تو مواخذہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں سے یہ بات آگے بڑھتی ہے' عدالتوں تک جاتی ہے۔ ہم عدالتوں کا بھی روز رونا روتے ہیں۔ سپاہی دس روپے میں راضی ہوتا ہے' وہاں سو روپیہ دینا پڑتا ہے۔ ہاں دے دیجیے تو جرم کی کوئی سزا نہیں ملے گی۔ سوسائٹی کے قانون کی رو سے یہ کیفیت ہمارے سامنے ہوئی۔ قانون ناقص ہے تو بیسیوں ایسی چیزیں ہیں جو نظر بظاہر فی الحقیقت چوری ہے' ڈاکا ہے' مگر قانون ان کو جرم قرار نہیں دیتا لیکن وہ ہیں جرم۔ اگر اس کو کوئی دیکھنے والا نہیں ہے' گرفت کرنے والا کوئی موجود نہیں ہے تو وہ صاف بچ نکلتا ہے' اگر گرفت ہو چکی ہے تو وہ رشوت دیتا ہے' عدالت میں جاتا ہے تو وہاں سفارش پہنچ جاتی ہے یا رشوت دے دی جاتی ہے اور جرم ختم ہو جاتا ہے۔ کتنے جرائم ہیں جو روز اس طرح سے ہوتے ہیں اور ان کی سزا ملے بغیر وہ چیزیں عام ہوتی رہتی ہیں۔ جو شخص یہ مانتا ہے کہ ٹھیک ہے انسان کی زندگی تو یہی طبعی زندگی (Physical Life) ہے تو وہ ان طریقوں سے بچاؤ حاصل کر لیتا ہے۔ وہ جو چور ہے جس کو کسی نے دیکھا نہیں ہے' لاکھ روپے کی چیز بھی لے کر چلا جاتا ہے' بڑے مزے سے زندگی گزارتا ہے۔ اس کی گرفت ہی کوئی نہیں ہے' سزا ہی کوئی نہیں ہے۔ یہ ہے ہمارے ہاں سوسائٹی کے قانون۔

## سوسائٹی کے قوانین کے برعکس خدا تعالیٰ کی پیش کردہ اقدار اور مکافاتِ عمل کی اہمیت

ایک اور قانون بھی ہے جسے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ جس چیز کو اس نے جرم قرار دیا ہے' اس کا دیکھنے والا ہو یا نہ ہو' پکڑنے والا ہو یا نہ ہو' یہاں اس کی گرفت ہو یا نہ ہو' یہاں سزا ملے یا نہ ملے مگر اس جرم کا اِرتکاب ہے' اس کی سزا مل کر رہتی ہے خواہ ان میں سے کوئی بھی نہ ہو۔ اتنا ہی نہیں کہ جرم کا ارتکاب کیا جائے تو اس کے بعد سزا ملتی ہے' میں جو عام طور پر مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک شخص آ کر آپ کے سامنے بیٹھا ہے' میز پہ کوئی گھڑی رکھی ہے' اچھا سا پین رکھا ہے' ذہن میں یہ آتا ہے کہ اگر کسی

طرح اس کی آنکھ ادھر ہو جائے یا یہ اٹھ کر چلا جائے تو میں اس کو کسی طرح اڑا لوں۔ وہ بیٹھا ہوا ہے اور اس انتظار میں ہے اور سارا وقت یہی سوچ رہا ہے۔ وہ اس کی بدقسمتی اور اس کی خوش قسمتی ہے کہ وہ اٹھ کر اندر جاتا نہیں ہے۔ یہ چلا آتا ہے۔ سوسائٹی کے کسی قانون کی رو سے یہ جرم نہیں ہے۔ قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے یہ بھی جرم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کی نگاہ' دل کے ارادوں اور آنکھ کی خیانت پر بھی ہوتی ہے۔ آپ سزا اور جزا کو تو چھوڑ دیجیے' کسی انسان کا کوئی عمل نتیجہ پیدا کیے بغیر نہیں رہتا۔ یہ جنہیں ہم نے سوسائٹی کے قانون کہا ہے' وہاں اس کے لیے قانون کا لفظ نہ لائیے۔ ان کو Values یا اقدار کہا جاتا ہے۔ کسی کی چیز کو بغیر اس کی رضامندی کے نہ لینا' یہ ایک Value (قدر) ہے۔ کسی کی محنت کو Exploit (استحصال) نہ کرنا' یہ ایک Value (قدر) ہے۔ اس کے مطابق اگر زندگی چلے گی تو کسی کی کوئی چیز اس کی رضامندی کے بغیر نہیں لی جائے گی' کسی کی محنت کو Exploit (استحصال) نہیں کیا جائے گا۔ یہ ایک عمل ہے اس کا بھی نتیجہ نکلتا ہے۔

## سوسائٹی کے قانون کی پاسداری پر نیک نامی کے بالمقابل مکافاتِ عمل انسانی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے

سوسائٹی کے قانون میں اگر ساری عمر کوئی شخص چوری نہیں کرتا تو اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا' وہ صرف مواخذے سے بچ جاتا ہے۔ یہ صرف Negative aspect of Life (زندگی کا منفی رخ) ہے۔ یہ کوئی مثبت بات نہ ہوئی۔ بڑا پرامن شہری ہے اور اس سے زیادہ پرامن تو نہیں ہو سکتا جو اپنی جگہ کھڑا ہوا ہے لیکن جب قانونِ مکافات' عمل آئے گا تو یہ چیزیں جو وہاں اقدارِ خداوندی کی رو سے غلط قرار دی گئی ہیں' ان سے بچنا ہے۔ یہ بجائے خویش ایک عمل ہو جاتا ہے۔ اس کا بھی نتیجہ ہوتا ہے جس طرح سے اس جرم کے ارتکاب کا ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ خارجی دنیا میں آپ کو اس کی سزا ملے یا نہ ملے وہ سوسائٹی کا انتظام ہے لیکن یہ جو خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے' اس کا جو نتیجہ مرتب ہوتا ہے' وہ نتیجہ انسان کی اپنی ذات پر مرتب ہو جاتا ہے اور ذات کے ساتھ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگر یہ جرم نہیں کیا ہے' تو اس کا بھی ایک نمبر Plus (جمع) ہو کر مل گیا ہے۔ اگر یہ جرم کیا ہے تو اس کا ایک نمبر Minus (منفی) میں مل گیا ہے۔ یہ کچھ ساتھ کے ساتھ ہوتا چلا جاتا ہے۔

## قرآن حکیم میں مکافاتِ عمل کے لیے نتیجہ کے بجائے جزا کا لفظ استعمال ہوا ہے

قرآنِ حکیم نے دو لفظوں میں اس بات کو بڑی عمدگی سے بیان کر دیا ہے۔ وہ تو دو ہی لفظوں میں بڑی بڑی حقیقتوں کو سمو دیتا ہے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (46:14) جو کچھ تم کرتے ہو وہی چیز اس کی جزا ہوتی ہے' عمل خود جزا ہوتا ہے' عمل کے اندر اس کی جزا مضمر ہوتی ہے' پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ کہیں باہر سے نہیں ملتی۔ اس کے

برعکس یا سزا باہر سے ملتی ہے یا اس کی جزا باہر سے ملتی ہے۔ جیسے میں کہا کرتا ہوں کہ آپ صبح سویرے سیر کرنے کے لیے جاتے ہیں' گھنٹہ بھر سیر کر کے آ جاتے ہیں۔ اگر آپ کسی قلی کو' مزدور کو' ملازم کو کسی جگہ بھیجیں کہ یہ میری چھٹی فلاں دوست کو دے آؤ' اور وہ وہاں دو میل چل کر آئے تو اسے آپ کہتے ہیں کہ ایک روپیہ تمہیں دیں گے۔ وہ جو چل کر گیا ہے اور آیا ہے' یہ اس کا نتیجہ نہیں ہے' یہ جو آپ کا کام ہے اس کا نتیجہ ایک روپیہ آپ نے دیا ہے' یہ باہر سے ملا ہے۔ اور وہ جو آپ سیر کر کے آتے ہیں تو آپ کو تو ایک پیسہ بھی کہیں سے نہیں ملتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سیر کرنے سے آپ کی صحت ٹھیک ہوئی ہے۔ یہ اس کا نتیجہ ہے۔ یہ اس سیر کے اندر مضمر ہے' باہر سے کچھ نہیں ملا۔ باہر سے' خارج سے' کام کی Wages (اجرت) ملتی ہیں۔ وہ کام کی اجرت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (46:14) جو تم کرتے ہو' وہی تو جزا ہوتی ہے۔ سیر کر کے آتے ہو تو خود سیر کرنے کے اندر جو صحت کا اچھا ہو جانا ہے' یہ اس سیر کرنے کے عمل کی جزا ہے۔ ''یونہی کرتے'' ہو کہ لیٹے رہتے ہو تو صحت خراب ہو جاتی ہے۔ تو یہ اس ''یونہی کرنے'' کی جزا ہے۔

## کسی کے عمل کا نتیجہ دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا

قرآن نے اسی جزا کے لیے الگ الگ کوئی لفظ ہی نہیں رکھا۔ وہ تو عمل میں ہی نتیجہ چاہتا ہے۔ اور جب نتیجے کی بات ہوتی ہے تو پھر جو میں کہا کرتا ہوں کہ قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے آپ سیر کر کے آتے ہیں' تو آپ کی اس سیر کا نتیجہ نکلتا ہے: صحت اچھی ہو جاتی ہے۔ آپ کا بھائی یا بیٹا جس سے آپ کو ڈھیر ساری محبت ہے وہ اس دوران میں لیٹا رہتا ہے' سویا رہتا ہے تو اس کی صحت خراب ہو رہی ہے۔ آپ لاکھ کوشش کریں کہ آپ کی سیر کا جو نتیجہ آپ پہ مرتب ہوا ہے' آپ کی صحت اچھی ہوئی ہے' اسے آپ بھائی یا بیٹے کی طرف منتقل کر دیں تو یہ ناممکن ہے۔ کسی کے عمل کا نتیجہ دوسرے کی طرف منتقل ہی نہیں ہو سکتا۔ چوری کا مال تو لا کر جس کو جی چاہے آپ دے دیں۔ سوچیے کہ زندگی میں منتقل نہیں ہوتا تو یہ جو مرنے کے بعد' جو ثواب بھیجتے ہیں' تو وہ کیسے پہنچ سکتا ہے۔ جب عمل خود اپنی جزا رکھتا ہو تو وہ منتقل نہیں ہو سکتا۔ عمل کی جزا (Reward) باہر سے مل رہی ہو تو وہ کوئی محسوس شے ہو گی تو اسے آپ کسی دوسرے کو دے سکتے ہیں۔ قانونِ مکافاتِ عمل اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ وہ کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا۔ جو چیزیں قرآن نے اقدار کہی ہیں یا جن کو جرم قرار دیا ہے' وہ فرد بھی کرتا ہے اور قوم بھی یہ کچھ کرتی ہے۔

## قوموں کا عروج و زوال تو ان کے قائم کردہ نظام کے مطابق ہی ظہور پذیر ہوتا ہے

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ جس چیز کو یہ قوم' مملکت' حکومت' جرم قرار دے گی اسی کا وہ مواخذہ کرے گی اور اگر وہ حکومت' وہ قوم' وہ معاشرہ' ان چیزوں کو جرم ہی قرار نہ دے تو وہ جرم نہیں ہو گا لیکن اگر وہ قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے' جنہیں ہم اقدار کہتے ہیں' وہ

چیزیں ان کے خلاف ہوں جو وہ کر رہی ہے تو اس کا نتیجہ تو مرتب ہوگا۔ اگر وہ قوم یہ قانون بنا لیتی ہے کہ ٹھیک ہے مزدور کو Wages (اجرت) ملیں گی' یہ نہیں ہوگا کہ وہ جتنا کام کر کے دیتے ہیں' جو کچھ پیدا کر کے دیتے ہیں' وہ اس کے مالک ہیں' حالانکہ ان کی محنت کا نتیجہ ان کو ملنا چاہیے۔ اگر وہ قوم' وہ حکومت' وہ مملکت' وہ معاشرہ' قانون یہ بناتا ہے کہ نہیں' ان کو تو صرف بیس روپے روز کے ملیں گے' اگر وہ سو روپے کا کام کر کے دیتا ہے تو باقی جو اسی روپے ہیں' وہ کارخانے کے مالک کو ملیں گے۔ اسی طرح مزارع جو زمین پہ ہل چلا کے محنت کر کے جو کچھ پیدا کرتا ہے اس پیداوار میں آدھا بٹائی کا اس زمین کے مالک کو ملے گا اور باقی آدھا اسے۔ اگر کوئی مملکت' کوئی حکومت یہ قانون بنا دیتی ہے کہ ایسا ہوگا تو ایسا کرنا اس قانون کی رو سے جرم نہیں ہوگا۔ اور اگر وہ اس کی خلاف ورزی کرے گا تو جرم ہوگا۔

## قانونِ مکافات کے مطابق کوئی شخص کسی دوسرے کی محنت کا استحصال نہیں کر سکتا

وہ جو خدا کی مقرر کی ہوئی قدر ہے جسے Value کہا جاتا ہے اس میں قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے یہ ہے کہ کسی کی محنت کو دوسرا Exploit (سلب) نہیں کر سکتا۔ اس کی رو سے تو یہ جرم ہوگا۔ اور اس جرم کا جسے نتیجہ کہتے ہیں' وہ تو مرتب ہوتا چلا جائے گا۔ وہ جو اس نے **اَللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ** (40:17) کہا ہے' ساتھ کے ساتھ حساب کرتا چلا جاتا ہے۔ یاد رکھیے جسے آپ جزا کہتے ہیں' وہ انسان کے ہر سانس کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے' کہیں باہر نہیں بنتی۔ وہ تو ایک ایک سانس کے بعد بنتی چلی جاتی ہے۔ تو ایک قوم جو اس قسم کے قوانین اپنے ہاں مرتب کرے اور ان چیزوں کو جو اقدارِ خداوندی کے خلاف ہیں' ان کو جرم قرار نہ دے تو چونکہ اس نے جرم قرار نہیں دیا' اُس قوم پہ مواخذہ تو نہیں ہوگا لیکن وہ جو قانونِ مکافاتِ عمل ہے' اس کی رو سے یہ چیزیں اپنا نتیجہ مرتب کرتی چلی جائیں گی۔ اقدار کے مطابق اور موافق جو کام ہوگا اس کا نتیجہ تعمیری ہوگا۔ اس قسم کے حصے میں خوشحالیاں آئیں گی' ان کا مستقبل خوشگوار ہوگا' اس میں امن ہوگا' اس میں سکون ہوگا۔ اور اگر یہ ان کے خلاف ہوگا تو قوم کا استحکام ختم ہو جائے گا' ان کا Future (مستقبل) تباہ ہو جائے گا' وہاں بے چینیاں پھیل جائیں گی' بدامنیاں پھیل جائیں گی۔ آپ نے اس کو جرم قرار نہیں دیا لیکن قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے چونکہ وہ جرم تھا' اس لیے اس کا نتیجہ مرتب ہوتا چلا جائے گا خواہ آپ اس کو جرم ہی قرار نہ دیں۔

## نتیجہ زود یا بدیر ہمیشہ مکافاتِ عمل کے مطابق نکلتا ہے

جب اقوام اس قسم کا نظام اپنے ہاں قائم کر لیں کہ

دانہ ایں می کارد آں حاصل بُرد

بوتا یہ ہے اور کاٹتا وہ ہے:

امّتے بر امتے دیگر چرد

کھیتی اس کی ہے اور چرتا وہ ہے۔ ''بوتا یہ ہے' کاٹتا وہ ہے''۔ آپ نے اپنے اس ملک کے نظام میں اس چیز کو جرم قرار نہیں دیا لیکن خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے یہ جرم ہے اور اس جرم کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اتنی تیزی سے جرائم کرتے چلے جائیں کہ کچھ وقت کے بعد اسی دنیا کے اندر ان کے تباہیوں اور بدحالیوں کے جو نتائج ہیں وہ مرتب ہو کر سامنے آ جائیں۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ کہا کہ ایک فرد یہ کچھ کرے اور اس کے بعد جلدی سے مر جائے تو اگر زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے تو وہ تو بچ گیا لیکن جو قانونِ مکافاتِ عمل ہے اس کی بنیاد اِس پہ ہے کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں ہے' یہ مرنے کے بعد بھی آگے چلتی ہے۔ وہ اس کے نتائج سے نہیں بچ سکتا۔

## آخرت پر ایمان مکافاتِ عمل پر ایمان کے بغیر قابلِ قبول ہی نہیں ہوتا

اس لیے جو کچھ تم نے کسی کے خلاف یہاں کیا ہے تمہاری موت سے اس کا مواخذہ ختم نہیں ہوسکتا۔ یہاں کوئی ملزم مفرور نہیں ہو سکتا۔ اس مملکت کے حیطہ اقتدار سے باہر کوئی جا ہی نہیں سکتا۔ اس دنیا سے بھی چلے جاؤ گے تو خدا کی Jurisdiction (حدِ مملکت) سے باہر نہیں جا سکو گے۔ وہ موت کے بعد بھی برقرار رہے گی۔ اسے حیات بالآخرت یعنی اخروی زندگی پر ایمان کہتے ہیں۔ یہ اسی قانونِ مکافاتِ عمل کی ہی بڑھتی ہوئی شکل ہے' کوئی الگ بات نہیں ہے۔ جو یہاں یہ مانتا ہے اور مانتا کے معنی ہیں کہ یہی کچھ کرتا ہے کہ اس کے اقدار کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے' سو وہ کہتا ہے کہ گرفت میں نہیں آتا' چھوٹ جاتا ہے' بچ جاتا ہے' ہزار طریقے ہوتے ہیں گرفت میں نہ آنے کے' اور پھر جو Party in Power (حزبِ اقتدار) ہے وہ جو کچھ کرتی ہے' جب تک وہ ان پاور (اقتدار میں) ہوتی ہے اس وقت تو ''سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا''[1] تو کبھی خیال ہی نہیں آتا کہ گرفت میں آ جائیں گے۔ پھر ان کے بعد جو آتے ہیں وہ ان کا احتساب کرتے ہیں۔ یہ کیفیت یوں ہوتی ہے۔ تو یہ جو چیز ہے کہ اگر ایسا ہے کہ مانتا ہے کہ آخرت کی زندگی پر ایمان ہے لیکن قانونِ مکافات پر ایمان نہیں ہے تو آخرت پر اس کا ایمان ہی نہیں ہوسکتا۔

عزیزانِ من! یہ جو کچھ ہم کرتے ہیں' وہ جو کچھ ہمارا معاشرہ کرتا ہے' آپ زبان سے کہتے بھی ہو کہ ہم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن کوئی بھی آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ عزیزانِ من! جو اس قانونِ مکافاتِ عمل پہ ایمان نہیں رکھتا ہے' وہ جرم کا ارتکاب کرنا تو ایک طرف' جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے' وہ دل میں اس کا خیال تک بھی نہیں لا سکتا۔ کسی خاتون کی آبروریزی تو ایک طرف رہی'

---

[1] سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا۔ (مثل) جس کا رشتہ دار یا واقف کار حاکم ہو' اسے قانون کا ڈر نہیں ہوتا۔

وہ نگاہ بھر کے اس کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ بھی خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے جرم ہے۔ کسی کی محنت کو Exploit (سلب) کر ہی نہیں سکتا کیونکہ یہ اقدار کے خلاف ہے۔ وہ کسی دوسرے کی چیز کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

## علامہ پرویزؒ کی زندگی کا ایک ذاتی واقعہ: ایک سکہ کی کہانی ان کی اپنی زبانی

عزیزانِ من! ایک ذاتی سی بات درمیان میں آ گئی لیکن چونکہ اس کا میری زندگی پہ بڑا اثر ہوا ہے اس لیے اسے بیان کر رہا ہوں۔ میں یہ بھی عرض کروں گا کہ ہمارے پرانے گھرانوں میں قانون کے ساتھ تربیت کیسی ہوا کرتی تھی۔ میرے دادا [1] جان مرحوم بہت بڑے جیّد عالم تھے' طبیب بھی تھے۔ ضمناً میں عرض کر دوں کہ انہوں نے ان میں سے کسی چیز کو بھی اپنے معاش کا ذریعہ نہیں بنایا تھا کیونکہ وہ کہتے تھے کہ خدمتِ خلق خواہ اخلاق کی ہو یا بدن کی ہو' اس کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے۔ یہ ان کا ایمان تھا۔ تعلیم یہ تھی کہ جو اپنی چیز نہ ہو' اسے وہ نہیں کھایا کرتے تھے۔ واقعہ میں عرض کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ کوئی (10-8) سال کی عمر ہوگی۔ ایک جگہ سے آ رہا تھا' شہر میں ایک مقام تھا۔ میں بٹالہ ضلع گرداس پور' کا رہنے والوں ہوں' جواب مشرقی پنجاب میں چلا گیا ہے۔ بعض چیزوں کی غیر شعوری طور پر کتنی نسبت ہوتی ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ مشرقی پاکستان کی محبت آج بھی دل سے نہیں جاتی۔ ہاں تو میں وہاں چلا آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس چوک میں ایک پیسا پڑا ہوا تھا۔ شاید ہمارے آج کے بچے تو سمجھ ہی نہ سکیں کہ پیسا ہوتا کیا ہے' اس کی قیمت کیا ہے؟

آج سے قریباً ساٹھ پینسٹھ [2] سال پہلے کی بات ہے۔ آپ کو پتہ نہیں کہ ''ایک پیسے'' میں ''چار پائیاں'' ہوتی تھیں' ایک ''پائی'' کے ''گنڈے'' ہوتے تھے۔ ''اک گنڈے دا بہت کچھ آ جاندا سی۔'' [3] تو وہ ایک پیسا مجھے پایا۔ پایا نہیں بلکہ لبھیا کیونکہ ''لبھیا اچ جیہڑی گل بنڑوی اے نا او پایا اچ نہیں بنڑوی'' [4] پیسا اٹھایا اور بچے کو جو خوشی ہو سکتی ہے وہ بیان کی محتاج نہیں کہ ایک تو پیسا اور اس کے بعد پھر وہ لبھیا پیسا۔ ''تے لبھی چیز تے خدا دی' نہ دھیلے دی نہ سوا دی''۔ [5] وہ پیسا ہاتھ میں لیے ہوئے میں بھاگا ہوا چلا آ رہا تھا' اب تک یاد ہے وہاں آ گئے' بڑا

---

[1] مولوی' چودھری' حکیم' رحیم بخش حنفی مسلک کے ایک جید عالم' اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے کے ممتاز بزرگ تھے (پرویزؒ: تصوف کی حقیقت' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1992' ص۔ع)۔

[2] یعنی کوئی 1913 تا 1918 کے لگ بھگ۔

[3] ایک گنڈے کا بہت کچھ آ جاتا تھا۔

[4] بلکہ اچانک ملا کیونکہ ''اچانک ملا'' میں جو بات بنتی ہے وہ ''پایا'' میں نہیں بنتی۔

[5] اچانک ملی چیز نعمتِ خداوندی ہے اس کی کوئی قیمت ہی نہیں لگائی جا سکتی۔

خوش تھا۔ اتفاق سے' میری بدقسمتی کہ دادا جان مرحوم گھر میں موجود تھے۔ میں نے سب کو بتایا کہ ''پیسا لبھا پیسا لبھا''۔ وہ بڑی مشقت سے تربیت دیتے تھے۔ کہا کہ کہاں سے لبھا بیٹا! میں نے کہا کہ جی! وہ فلاں جگہ پڑا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا چلو' مجھے دکھاؤ تو سہی وہ جگہ۔ اب یہ آدھی خوشی اسی میں رہ گئی کہ گھر میں تو ہماری خوشی پوری نہیں ہوئی' باہر نکل رہے ہیں کہ چلو دکھاؤ۔ خیر ذہن میں یہ تھا کہ شاید جگہ دیکھنی ہوگی۔

کہنے لگے بیٹا! یہ پیسا تمہارا تھا جو تم نے اٹھایا ہے؟ میں نے کہا کہ ''جی نہیں'' میں تے لبھیا اے''۔ کہنے لگے کہ نہیں بیٹا! جو میں پوچھ رہا ہوں اس کا صحیح جواب دو' کچھ اور نہیں۔ کیا یہ پیسا تمہارا تھا؟ دو تین دفعہ کہا تو بات پکی ہوگئی کہ جی! وہ میرا تو نہیں تھا۔ اب اتنے میں وہ چوک قریب آ گیا تھا۔ کہنے لگے کہ بیٹا! جب تیرا نہیں تھا تو تُو نے پھر اٹھایا کیسے؟ ''کہ جی' میں تے لبھیا سی جی''۔ کہنے لگے کہ ''نہیں بیٹا! تیرا تے نہیں سی ناں''۔ تے بیٹا جیہڑی تیری چیز نہ ہووے تینوں تاں اونوں رکھن دا حق نہیں پہنچدا ناں''۔ [1] اب وہ ہماری خوشیاں چلی گئیں۔

## جہاں سے اٹھایا تھا اسی جگہ رکھ دو کیونکہ وہ تیرا تھا ہی نہیں

مجھے کہا کہ بیٹا! کہاں سے اٹھایا تھا؟ میں نے کہا: یہاں سے۔ کہنے لگے: بیٹا! یہاں رکھ دو' یہ تمہارا نہیں تھا۔ میں نے کہا جی! یہاں سے تو کوئی اور لے جائے گا۔ تو کہنے لگے کہ بیٹا! پھر ہم تم سے تو نہیں پوچھیں گے۔ اب وہ دہرائے جا رہے ہیں کہ بیٹا! جو تیرا نہیں تھا تو تُو نے اس کو اٹھانے کی جرأت کیوں کی؟ تیرا حق نہیں پہنچتا کہ تُو اس کو اٹھائے۔ جو تیری چیز نہیں ہے تو وہ تیری نہیں ہے۔ تُو اپنی چیز تو لے سکتا ہے' جو تیری نہیں ہے تجھے اس سے واسطہ نہیں ہے کہ وہ کس کی ہے' جو تیری نہیں ہے تُو اسے نہیں اٹھا سکتا۔ بیٹا! تیری نہیں ہے تُو نہیں اٹھا سکتا۔ اس واقعہ کا ذرا ذرا جزوی طور پر میرے ذہن میں ہے۔ وہ جگہ موجود ہے' میں آج پیسے کی تصویر کھینچ سکتا ہوں اور اس کی بھی جو کچھ انہوں نے کہا ہے۔

عزیزانِ من! آج تک یہ چیز دماغ میں گونج رہی ہے کہ جو تیری چیز نہیں ہے تُو اس کو نہیں اٹھا سکتا۔ کہا کہ یہ خدا کی قدر ہے۔ قانون کی رو سے تو کوئی جرم نہیں تھا کہ پڑی ہوئی چیز ہے جو تو نے اٹھالی ہے۔ قانون' بیٹا! انسانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے۔ انسان اپنے مفاد کے لیے قانون بناتے ہیں۔ یہ سب دوسروں کی ان چیزوں کو اٹھا کے لیے جائیں گے' جو بھی ان کو ملے گی۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ جو تیری چیز نہیں ہے تُو اسے نہیں اٹھا سکتا۔

---

[1] نہیں' بیٹا! وہ تمہارا تو نہیں تھا تو بیٹا! جو چیز تمہاری نہ ہو' اسے رکھنے کا تمہیں حق نہیں پہنچتا۔

عزیزانِ من! یہ ایک قدر ہے۔کوئی دیکھنے والا ہے یا نہیں' مالک موجود ہے یا نہیں' پتہ بھی ہے یا نہیں کہ کون اس کا مالک ہے' پتہ لینا تیرا کام نہیں ہے۔تُو نے یہ دیکھنا ہے کہ جو تیری نہیں ہے تُو اس کو نہیں اٹھا سکتا۔اسے کہتے ہیں خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان۔ سوال ہی نہیں کہ آپ کی حکومت کا' مملکت کا' معاشرے کا' قانون کیا ہے۔دیکھنے والا ہے یا نہیں ہے' گرفت ہوسکتی ہے یا نہیں' مالک بھی کوئی موجود ہے یا نہیں۔تیری اگر وہ چیز نہیں ہے تو تُو نہیں اٹھا سکتا۔یہ قدر ہے' یہ Value ہے' یہ قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ اگر وہ اٹھالی ہے تو یہ اپنا نتیجہ مرتب کرے گا۔اگر ایک قوم اس قسم کا نظام بنالیتی ہے کہ سرمایہ دوسروں کی محنت کو کھینچ سکتا ہے' آپ کی حکومت اس کو جرم قرار دے یا نہ دے' خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل اس کو سنگین جرم قرر دیتا ہے۔

## خدا تعالیٰ کی اقدار حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور فرعون کا نظامِ مملکت

حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا کہ جاؤ' فرعون نے تباہیاں مچادی ہوئی ہیں۔کیا کہا تھا؟ کیا جرم ہے؟ کہا کہ وہاں دوسروں کی محنت کو Exploit (سلب) کیا جاتا ہے۔جاؤ' جا کے ایسا نظام قائم کرو کہ ہر شخص کو اس کی محنت کا معاوضہ ملے۔یہ انقلاب برپا کیا جارہا تھا۔یہ قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔فرد یہ کرتا ہے تو اس فرد تک اس کا نتیجہ محدود رہتا ہے۔یہاں اگر اس کو ملتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ زندگی تو جوئے رواں ہے' یہ بچ کے کہیں نہیں جاسکتا۔

## آخرت پر ایمان انسان کی سوچ کا رخ بدل دیتا ہے

عزیزانِ من! جس کا حیاتِ آخرت کے اوپر ایمان ہے' وہ کبھی تصور بھی نہیں کرسکتا کہ سپاہی دیکھتا ہے یا نہیں دیکھتا۔ وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ کوئی بات نہیں ہے کل کو تو میں مرجاؤں گا اس کے بعد چھوٹ جاؤں گا۔وہ تو ایسی گرفت میں ہے کہ اس کے تو ایک ایک سانس کے اندر سپاہی کھڑا ہوا ہے۔وہ جو بچپن میں تعلیم دیتے تھے تو وہ باتیں سمجھانے کا بڑا اچھا طریقہ تھا۔اگر ایک ایک شخص کے ساتھ ایک ایک سپاہی لگا ہوا ہو تو کبھی جرم کا ارتکاب ہی نہیں ہوسکتا۔خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پہ ایمان ہو کہ میرے ساتھ ہر وقت دن رات ایک سپاہی لگا ہوا ہے' وہ میرے دل کے اندر بھی جھانکتا ہے' میری نگاہوں کے پردے اٹھا کر بھی وہ دیکھ لیتا ہے۔لکھتا چلا جاتا ہے' اس کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا چلا جاتا ہے' مرنے کے بعد بھی نہیں چھوٹ سکتا۔قرآنِ کریم کے الفاظ یہ ہیں کہ آج وہ تمہاری گردن میں لپٹا ہوا ہے' وہاں اسے کھول دیا جائے گا۔اور پھر یہ نہیں ہوگا کہ کوئی آ کر تمہاری فردِ جرم پڑھے گا۔کہا جائے گا کہ اِقْرَاْ کِتٰبَکَ (17:14) لے اپنی کتاب آپ پڑھ۔اور آگے یہ ہے کہ پھر یہ بھی نہیں کہ کوئی اور اس کا حساب کرے گا۔کہا کہ خود اپنا حساب آپ کر کے بتادے کہ کتنی سزا ہے۔عزیزانِ من! یہ ہے قانونِ مکافاتِ عمل اور اس پہ ایمان کے معنی ہیں اخروی حیات پر ایمان۔

اب آیئے (27:68-69) دو آیتوں کی طرف جو میں نے کہا تھا کہ دیکھیے ربط کتنا ہے! کہا کہ تم یہ کہہ رہے ہو کہ مرنے کے بعد کی زندگی کچھ نہیں ہے۔ کہنے لگے کہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم اسی زندگی کو زندگی سمجھتے ہو اور جو یہ سمجھتے ہو کہ جو جی میں آئے ہم جس قسم کا نظام بنا لیں' جو جی میں آئے ہم یہاں مار دھاڑ کرتے چلے جائیں' کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ تمہیں معلوم کرنا چاہیے کہ ایک اور پولیس بھی ہے' ایک اور قانون بھی ہے' اور عدالت بھی ہے جو تمہاری نگاہوں سے مخفی ہے۔ اس کی رو سے جو سزا ملتی ہے ہر عمل کا جو نتیجہ مرتب ہوتا ہے' تمہارا نظام اگر باطل ہے تو اس کا نتیجہ تباہی ہے اور اگر وہ شدت تک پہنچا ہوا ہے تو بہت جلدی وہ قوم تباہ ہو کے رہ جائے گی۔ کہا کہ دیکھو' جاؤ! پچھلی قوموں کی اجڑی ہوئی بستیوں کو دیکھو کہ کس طرح تباہ ہوئی ہیں۔ دیکھ رہے ہیں کہ ان دونوں آیتوں کے اندر کس طرح ربط آ گیا ہے۔ کہا کہ اس کا بھی انتظار نہ کرو کہ مرنے کے بعد یہ ہوگا۔ انفرادی زندگی میں اتنا وقفہ مل سکتا ہے کہ زندگی میں یہ کچھ نہ ہو اور مرنے کے بعد ہو۔ اجتماعی زندگی کے اندر تو اس کے بھرپور نتائج بہت جلد ظہور میں آ جاتے ہیں۔

## سب سے بڑی تباہی قوموں کے خود ساختہ نظاموں کی وجہ سے ہی وارد ہوتی ہے جو پھر نہ مندر دیکھتی ہے' نہ مسجد

قرآن نے افراد کے لیے ہی قانون نہیں دیئے قوموں کے لیے بھی دیئے ہیں۔ قوموں کے اعمال کے لیے بھی نظام صحیح ہو۔ اور سب سے بڑی تباہی جو آتی ہے وہ تو قوموں کے باطل نظام کی وجہ سے آتی ہے۔ اس باطل نظام میں جس میں افراد کی یہ جسے آپ جنتی نیکیاں کہتے ہیں' وہ بھی کام نہیں دیتیں۔ سیلاب آتا ہے' طوفان آتا ہے تو وہ مندر اور مسجد دونوں کو بہا کر لے جاتا ہے۔ عزیزانِ من! غلط نظام تو یہ ہوتا ہے۔ اب دیکھیے جو کہا۔ کہا یہ ہے کہ زندگی تو آگے چلے گی۔ اور یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! آگے کیا چلے گی! مرمرا جائیں گے' ہڈیاں ختم ہو جائیں' راکھ ہو جائیں گے' جسم گل سڑ جائے گا۔ تم سمجھتے ہو کہ ہم اپنی سوسائٹی کے نظام کے رو سے ان اعمال کے نتائج سے بچ سکتے ہیں' ادھر کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ کہنے لگے کہ وہ ذرا سامنے دیکھو اور ان کا انجام دیکھو جنہوں نے غلط نظام بنایا اور پھر دیکھو کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ قرآن کہتا ہے کہ ایسا بھی نہیں ہوتا کہ کوئی باہر سے آتا ہے اور ان کو تباہ کر آتا ہے بلکہ وہاں تو

مری بنیاد میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

اس نظامِ باطل کی بنیاد میں تباہی ہوتی ہے' وہ عمارت اپنے زور سے آپ آ گرتی ہے۔ کہا کہ **قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ** (27:69)۔ آپ نے دیکھا کہ اس کے اندر کتنا بڑا ربط ہے! اب آپ نے دیکھا کہ جسے ہم حیاتِ آخرت پر ایمان کہتے ہیں' اس زندگی میں اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ عزیزانِ من! بڑی کوششیں ہو رہی ہیں' سرگرمیاں ہو رہی ہیں' اقدار بگڑے ہوئے ہیں' سنورتے نہیں ہیں۔ کیا صورت پیدا کی جائے؟ وہ کہتے ہیں کہ سزائیں زیادہ سخت کی جائیں'

قانون بنائے جائیں۔

## تباہی سے بچنے کے لیے قانونِ مکافاتِ عمل کی اہمیت کو واضح تر انداز میں عام کرنا ہوگا

عزیزانِ من! سزائیں زیادہ سخت کرنے اور قانون بنانے کا سوال ہی نہیں ہے۔ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کو عام کیا جائے جس کے بغیر ایک شخص مسلمان نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ ایک چیز پیدا کر دی جائے تو کسی پولیس کی ضرورت نہیں' کسی عدالت کی ضرورت نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے دورِ خلافت (1632-634AD) میں ایک محکمہ قائم کر دیا۔ حضرت عمرؓ (581-644/45AD) کو اس کا حج بنا دیا۔ سال بھر کے بعد وہ آ گئے اور کہنے لگے کہ خوامخواہ کے لیے مجھے پابند کر دیا۔ کہنے لگے کہ کیوں؟ کہنے لگے کہ سال بھر کوئی مقدمہ ہی نہیں آیا۔ آئے گا کہاں جب خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان ہوگا؟ سوال ہی نہیں ہے کہ اس کے بعد مقدمہ آئے۔ پہلا جرم تو یہی ہے کہ زبان سے ہم یہ چیز کہتے ہیں۔ اس کے بعد ہمارے دل کے اندر یہ ایمان نہیں ہے۔ کس کے دل کے اندر یہ ایمان ہے کہ جب کوئی دیکھنے والا نہیں ہے تو پھر بھی وہ دیکھنے والا ہے؟ کس کے دل میں یہ ایمان ہے کہ خدا کی قدر کے بغیر حکومت نے بھی یہ قانون بنا دیا اور اس کو جرم قرار نہیں دیا' پھر بھی وہ جرم ہے' اس کا ارتکاب کرنے سے بھی مجھے سزا ملے گا؟ کون ہے جس کا یہ ایمان ہے؟

## اپنے آپ کو بدلے بغیر' دل کو بدلے بغیر' آرزو کو بدلے بغیر' انقلاب کی امید لاحاصل ہے

ایمان کے معنی ہیں کہ دل و نگاہ کے زاویئے بدل جاتے ہیں' سوچ بدل جاتی ہے اور جب تک سوچ نہیں بدلتی' دل و نگاہ کے زاویئے نہیں بدلتے۔ باہر سے سپاہی کھڑے ہوئے تو کچھ نہیں کر سکتے۔ ہماری گرفت تو سپاہی کر لے گا' سپاہی کی گرفت کون کرے گا؟ چلتے جایئے اوپر تک' کسی گرفت کرنے والے کو دیکھ لیجیے' وہاں سے آسانی سے بچا جا سکتا ہے۔ وہ معاشرے کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ یہ جو جرائم کی سزائیں سوسائٹی کی طرف سے ہوتی ہیں وہ تو جیسے پاگل ہو جاتا ہے تو اسے پاگل خانے میں بھیج دیتے ہیں۔ یہ وہ کیفیت ہے۔ اگر سارا معاشرہ ہی پاگل خانے میں بھیج دیں گے تو پھر سوسائٹی کا کیا ہوگا۔ ایک چیز ہے جسے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان کہتے ہیں اور یہ ہے ایمان بالآخرت کے معنی۔ اور یہ ہے جس کا نتیجہ قوموں کی زندگی میں سامنے آ جاتا ہے۔ کہا کہ **قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ** (27:69)۔ یہاں نظر آتا ہے کہ کتنی سختی سے ایک چیز کہی گئی ہے کہ تباہ اور برباد ہو کے رہ جاتے ہیں۔ اب آیئے اس کی طرف جو اصلاح کرنے والا ہے۔

## اصلاح کرنے والوں کی قرآنی خطوط پر قلبی اور ذہنی کیفیت

قرآن کی رو سے اصلاح کرنے والوں کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ یہ کچھ بتایا ہے کہ تباہ و برباد ہو جاؤ گے اس نظام پہ چل رہے ہو' بار

بار رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا جا رہا تھا۔ براہِ راست تو خدا نہیں کہہ رہا تھا۔ آپ رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو ہیں وہ ان کو کہہ رہے ہیں کہ تباہ ہو جاؤ گے' برباد ہو جاؤ گے۔ عزیزانِ من! قرآن کی رو سے مصلح کی کیفیت ایسی نہیں ہوتی کہ وہ یوں کہے کہ تمہاری ایسی کی تیسی تم غلط نظام قائم کیے ہوئے ہو' تباہ ہو جاؤ گے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جا رہا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ اس نظام کا نتیجہ یہ ہے کہ تم برباد ہو جاؤ گے' تباہ ہو جاؤ گے۔ اے رسول! تُو ان لوگوں تک صحیح بات پہنچائے جا اور وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ (27:70) اس سے افسردہ خاطر مت ہو۔ اے رسول! کیوں اپنی جان گھلا رہے ہو۔ یہ کہنے والا رسول جان گھلا رہا ہے۔ کہا کہ غم نہیں کھایا کرتے۔ ایک مقام پہ نہیں بلکہ متعدد مقامات پہ یہ آیا ہے کہ جہاں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا ہے کہ تباہ ہو جاؤ گے' برباد ہو جاؤ گے' ایسا نہ کرو۔ نظر آتا ہے کہ تباہی اور بربادی کے متعلق کہہ رہے ہیں۔ سختی سے بھی کہنا پڑتا ہے۔ یہ کہا ہے کہ تم تو اپنی جان گھلا لو گے کہ یہ صحیح نظام کیوں نہیں قائم کرتے' صحیح راستے پر کیوں نہیں آتے۔

عزیزانِ من! بڑی اہم بات ہے کہ قرانی Reformer (مصلح) کو کیسا ہونا چاہیے۔ اب تو ہمارے ہاں غلط نظام نے ایسی صورت پیدا کر دی ہے کہ جو طبیب ہے' ڈاکٹر ہے' ان کی بھی صورت یہ ہے کہ وہ بھی فیس کی خاطر' معاوضے کی خاطر' یہ کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ایسے بھی نظر آتے ہیں جو غریب کے ساتھ بڑی ہمدردیاں رکھتے ہیں۔ قرآن کا جو Reformer (مصلح) ہے اس کی پوزیشن ایک طبیب مشفق کی سی بتاتا ہے کہ مریض بد پرہیزی کرتا ہے تو ڈانٹنا ضروری ہے لیکن اس کے بعد اپنے دل میں اس کا غم بھی کھاتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ تُو تباہ ہو جائے گا' کیوں ایسا کرتا ہے' کیوں دوائی نہیں پیتا' کیوں بد پرہیزی کرتا ہے؟ وہ اس کی خاطر اپنی جان گھلا لیتا ہے۔ کہا ہے کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (26:3) ایسا نظر آتا ہے کہ رسول تُو تو ان کے پیچھے اپنی جان دے گا کہ یہ کیوں سیدھے راستے پہ نہیں آ جاتے۔ یہ ہیں ریفارمر (مصلح)۔ تکلیف ان کو ہو رہی ہے اور اس کا دکھ اسؐ کے دل میں پیدا ہو رہا ہے کہ یہ کیوں نہیں ایسا کرتے۔ تُو تو اپنی جان گھلا لے گا۔ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (18:6) تباہ وہ ہو رہے ہیں اور اس کا تاسف اور صدمہ تمہیں ہو رہا ہے۔ کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مریض کے مرنے سے پہلے شاید یہ جو طبیب ہے' اپنی جان گھلا کے نہ مر جائے کہیں۔ ارے بھئی! اس کے اوپر اتنا صدمہ نہ کرو۔ صحیح بات ان کو پہنچائے جاؤ' یقین کیے جاؤ' تاکید کیے جاؤ لیکن اپنی جان تو مت گھلاؤ۔

## قرآنِ حکیم کی روشنی میں نبی اکرمؐ کے اسوہ حسنہ کے خطوط

آپ دیکھ رہے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو قرآن نے کہا ہے کہ یہ تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ

وسلم کی زندگی قیامت تک کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ باقیوں کو تو چھوڑ دیجیے لیکن جو اپنی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرتا ہے اس کے لیے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بہترین نمونہ ہونا چاہیے۔ وہ بہترین نمونہ یہ بھی ہے کہ جو جرم کا ارتکاب کر رہا ہے' غلط راستے پہ چل رہا ہے' وہ تاکید کیے جا رہے ہیں' یہ مانتا نہیں ہے۔ میدانِ جنگ تک میں اتر آتا ہے۔ یہ طبیب مشفق ہیں کہ اس کی خاطر اپنی جان گھلا رہے ہیں۔ یہ ہے وہ اسوہء حسنہ۔ یوں ذرا اصلاح کے لیے قدم اٹھا کے چلیے تو آپ دیکھیے کہ کتنی جلدی اصلاح ہوتی ہے۔ کوئی پاگل ہی باقی رہ جائے گا جو اس چیز پہ ضد کرے کہ میں یہ کروں گا۔

## ایسی نصیحت جو شفقت' ہمدردی اور درد کی لذت سے نا آشنا ہو' کبھی کارگر نہیں ہو سکتی

شفقت کے ساتھ' محبت کے ساتھ' دوسرے کا درد خود محسوس کرنے کے ساتھ' جو نصیحت کی جاتی ہے وہ بڑی ہی مؤثر ہوتی ہے۔ اس مرحلے پر آپ ان کے جذبات دیکھیے کہ دوسری طرف سے تکالیف دے رہے ہیں' بدلے لینے والے ہیں۔ انسان تنگ آ جاتا ہے' چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم اپنی جان مت گھلاؤ۔ انہیں اپنی اس تباہی پر موت کا اتنا تاسف نہیں ہوگا جتنا اس طبیب کو تاسف ہو رہا ہے کہ یہ کیوں اس قسم کی بدپرہیزی کر کے اپنے آپ کی تباہی مول لے رہے ہیں۔ کہا کہ **فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ** (35:8)۔ یہاں بھی وہی بات ہے کہ ان کے اوپر اپنی جان کیوں گھلا رہا ہے۔ حسرت تمہیں آ رہی ہے' افسوس آ رہا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ کچھ آیا ہے۔

## خدا تعالیٰ کی اپنی ''حساس خیالی'' کا اظہار

خود سورۃ یٰسین میں خدا کے متعلق ہے کہ ان کے اس قسم کے غلط اقدامات' غلط نظام کی بنا پہ تباہی آ رہی ہے اور تباہی کا حکم دے کر خدا کہتا ہے کہ **يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ** (36:30) او میرے بندو! کیوں تباہ ہو رہے ہو؟'' کیوں تسی ایہو جیے ہو گئے ہو؟ تہاڈا بیڑہ غرق' تسی کیوں ایہو جیے ہو گئے ہو''۔ [1] اس کے رسول کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنی جان گھلا رہا ہے۔ عزیزانِ من! اگر اس قسم کا مشفق مل جائے تو زندگی کتنی حسین نظر آنے لگتی ہے!

## ماں کی مار میں درد کی چاشنی اور دل و دماغ کی خراش بھی دامن گیر ہوتی ہے

ماں کی سی محبت سے ایسی تعلیم دے کہ بچے پہ ہاتھ بھی اٹھاتی ہے تو پہلے دیکھتی ہے کہ کہیں منہ پہ نہ لگ جائے۔ وہ ایسی جگہ مارتی ہے کہ

---

[1] تم کیوں ایسے ہو گئے ہو؟ تمہارا بیڑا غرق ہو' تم کیوں ایسے ہو گئے ہو؟

آواز تو نکلے مگر درد زیادہ نہ ہو۔ خدا اور اس کے رسول کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ بھگت رہا ہے' دکھ انہیں ہو رہا ہے کہ دیکھو! کیا ہو گیا ہے انہیں؟ دکھ ہو رہا ہے اس چیز کے اوپر۔ کہا یہ جا رہا ہے۔ بات بڑی اہم ہے۔ دکھ اس چیز پہ ہو رہا ہے کہ یہ لوگ راہ راست پہ کیوں نہیں آتے؟ کیوں صحیح راستہ اختیار نہیں کرتے؟ اب یہاں بڑی اہم بات آ گئی۔ یہ جو صحیح راستے کی تبلیغ کرنے والا ہے' اس پیغام کو پہنچانے والا ہے' تو اس کی ذمہ داری کیا ہے؟ سب سے عظیم تریں شخصیت جن کو لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا' زندگی کا فریضہ ہی یہ بتایا گیا۔ وہ ان کو تلقین کرتا ہے' تعلیم دیتا ہے' تاکید کرتا ہے' ان کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے' صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ مانتے نہیں ہیں اور یہ غم سے اپنی جان گھلا لیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ** 2:272) تیرا کام ان کو راستہ دکھا دینا ہے' راستے پہ چلا دینا تیرا کام نہیں ہے' یہ تیری ذمہ داری نہیں ہے۔

## مجبوری کے تحت کیا ہوا عمل اپنے لیے کسی کریڈٹ کا حق دار نہیں ہوتا

اگر اس کو اس راستے کے اوپر زبردستی چلا دیا جائے تو اس کا اس کو کریڈٹ ہی نہیں ہوتا۔ زبردستی کی نیکی نیکی نہیں ہوتی۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ اگر کوئی کسی کو پکڑ کے صحیح گاڑی میں بٹھا دے یا وہ اس سڑک کے اوپر لے جائے یا صحیح راستے کے اوپر لے جائے تو اس کا اس میں اپنا کیا کریڈٹ ہے؟ کچھ نہیں' کبھی بھی نہیں۔ کتنی عظیم چیز ہے کہ رسول سے کہا جا رہا ہے کہ تیرا کام یہ ہے کہ دوراہے یا چوراہے کے اوپر کھڑا ہو جائے اور وہاں سائن پوسٹ (نشانِ راہ) لگا دے اور چلنے والوں کو بتا دے کہ یہ راستہ شہر کی طرف جاتا ہے۔ بس آگے ان کا کام ہے کہ اس راستے کو اختیار کریں یا دوسرے راستے کو اختیار کریں۔ انسان کا اختیار و ارادہ ہی تو خصوصیت تھی۔ اگر ان کو زبردستی اس راستے پر چلاتا ہے تو یہ انسان نہیں رہتا' حیوان ہو جاتا ہے۔ بکری کو تو اِس طرح سے پکڑ کے سڑک کے اوپر لے جا سکتا ہے لیکن انسان کو اس طرح سے لے جانے کی بات نہیں ہے۔ انسان کا کوئی عمل خواہ اس کی خیر خیریت کے لیے ہی کیوں نہ ہو' اگر اس کے لیے آپ زبردستی کرتے ہیں تو آپ شرفِ انسانیت سے اس کو محروم کر رہے ہیں۔ یہ نیکی نہیں ہے' نہ اس کی نہ تمہاری: **لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ** (2:272) تیرے ذمے اِن کو صحیح راستے پر چلا دینا نہیں ہے' صرف راستہ بتا دینا ہے۔ وہ صحیح راستے پہ نہیں چلتے تو دکھ ہو رہا ہے لیکن یہاں یہ بھی کہا ہے کہ دکھ ہو رہا ہے تو کیا پھر ان کو زبردستی مار مار کے نیک بنا دے۔ مار مار کے نیک کون بنا سکتا ہے۔ ایک اور آیت میں اس سے بھی زیادہ ایک اور لفظ آیا ہے۔ وہاں تو یہ تھا کہ راستہ دکھانا تیرا فرض ہے' راستے پہ چلانا تیری ذمہ داری نہیں ہے' تُو چلا ہی نہیں سکتا۔ یہاں کہا کہ **اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ** 28:56) ہر ایک تو ایک طرف رہا اگر کسی کے ساتھ تمہیں بڑی محبت بھی ہے تو اسے بھی تم زبردستی راستے کے اوپر نہیں چلا سکتے۔ اس کے لیے بھی تمہارا یہی کام ہے کہ اس تک صحیح راستے کا پیغام پہنچاؤ۔ **عَلَيْكَ الْبَلٰغُ** (3:20) تیرے ذمہ بات کو پہنچا دینا ہے۔

## انسان کے اختیار وارادے کو کسی شکل میں بھی پامال نہیں کیا جا سکتا

میں پھر وہی عرض کروں گا کہ زبردستی نیک بنا دینے میں وہ جو اس کا اختیار وارادہ سلب ہو رہا ہے' وہ تو انسانیت کی صف پہ ہی نہیں رہ رہا تو تم نے اس کے لیے کیا کیا۔ اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ (28:56) کسی کے ساتھ تجھے کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو' کتنا ہی پیار کیوں نہ ہو' یہ نہیں ہو سکتا کہ تُو زبردستی اس کو راستے پہ چلا دے۔ تُو صرف ہدایت کر سکتا ہے۔ دونوں آیتوں میں وہ جو چار الفاظ ہیں وہ مشترک ہیں۔

## ہمارے ہاں غلط تراجم نے قرآنِ حکیم کی پوری تعلیم کو ہی چیستاں بنا کر رکھ دیا ہے

میں نے کہا تھا کہ میں اس آیت کے ساتھ بتاؤں گا کہ تُو صحیح راستے پہ نہیں چلا سکتا۔ کہا کہ وَ لٰکِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (28:56)۔ اس کا جو ترجمہ ہے اس نے ساری کی ساری تعلیم کو مسمار کر کے رکھ دیا ہے۔ ہر جگہ آپ کو یہ ترجمہ ملے گا کہ تُو کسی کو صحیح راستے پہ نہیں چلا سکتا' تُو ہدایت نہیں دے سکتا' ہم جسے چاہیں ہدایت دے سکتے ہیں۔ یعنی تُو کوشش کر رہا ہے کہ یہ صحیح راستے پہ چلیں اور ہم نہیں چاہتے کہ وہ صحیح راستے کے اوپر چلیں۔ یہ تو خدا کے ساتھ جنگ ہو گئی۔ ہم تو اسے نہیں چلانا چاہتے' تُو زور لگا رہا ہے۔ اب اس کو پتہ ہے نہیں کہ اس کے متعلق ہو کیا رہا ہے۔ ہر جگہ ان آیتوں کا یہی ترجمہ ہے۔ کہ تُو نہیں چلا سکتا' ہم جسے چاہتے ہیں صحیح راستے کے اوپر چلاتے ہیں۔ ہم جسے چاہتے ہیں گمراہ کرتے ہیں' ہم جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔ ان آیتوں کا یہ ترجمہ کیا جاتا ہے۔ تو پھر یہ سارا سلسلۂ رشد وہدایت' یہ انبیائے کرام کا بھیجنا' وحی کا بھیجنا' ان بیچاروں کا ان کے اپنوں سے مار کھانا' مصیبتیں اٹھانا' ایک نبی کے بعد دوسرا آنا' یہ سارا سلسلۂ رشد وہدایت' کاہے کے لیے اور یہ پیغامبری کاہے کے لیے ہے کہ جب بات یہ ہے کہ جسے ہم چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں' جسے چاہتے ہیں گمراہ کر دیتے ہیں۔ تو یہ (معاذ اللہ) ساری نمائش ہے۔ اور پھر جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ جو نبی ہے اس کے لیے کتنا مشکل کام ہے۔ اس کو علمِ غیب تو ہے نہیں کہ ایک ایک فرد کے متعلق وہ کیا چاہ رہا ہے۔ یہ تو کوشش کیے جائے گا کہ وہ صحیح راستے پہ چلے۔

## لیلیٰ مجنوں کی چاہت کا ایک تمثیلی واقعہ

مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ یہ جو قصے ہوتے ہیں' ان میں بڑے دلچسپ واقعات ہوتے ہیں۔ وہ مجنوں تھا۔ یہ ایک بہت بڑے قبیلے کے سردار کا بیٹا تھا۔ پھر اس کے باپ نے بھی آخر الامر کہا کہ یوں بات نہیں بنتی' لیلیٰ کے باپ کو پیغام پہنچائیں۔ وہ مانا نہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ آخری بات تو یہ ہے کہ حملہ کر دیجیے' لڑائی کریں گے اور لڑائی کر کے لڑکی کو اٹھا کر لے آئیں گے۔ مجنوں سے بھی کہا کہ ہم حملہ کر

رہے ہیں۔ وہاں حملہ کر دیا' لڑائی ہو رہی ہے تو یہ پٹ رہا ہے کہ اگر چہ ہمارا قبیلہ بھاری ہے' اسلحہ بھی زیادہ ہے' زور بھی زیادہ ہے اور شکست ہو رہی ہے۔ او یہ شکست کیسے ہو رہی ہے؟ وہ اِدھر اُدھر کہیں گھوما کہ دیکھوں کہیں کوئی بات ایسی ہو' تو دیکھا کہ مجبوں خیمے کے پیچھے سجدے میں پڑا ہوا ہے اور کچھ کہہ رہا ہے۔ کان لگا کے سنا تو وہ کہہ رہا ہے ''یا اللہ! لیلیٰ دے باپ دی فتح' یا اللہ لیلیٰ دے باپ کی فتح۔ اس نے ایک ماری ''تہاڈا ستیاناس''۔ ''اولیلی دے باپ دی فتح کہن ڈیاویں' اوساڈا کیوں ستیاناس کران ڈیاویں''۔ ❶ معاف رکھیے گا۔ یہ رسول تو میدانِ جنگ تک میں لگا ہوا ہے کہ سیدھے راستے پہ چلیں۔ اور وہ کہہ رہا ہے کہ نہیں جانا سیدھے راستے پہ۔

## ہدایت تو وہی قبول کرے گا جو ہدایت کی افادیت کو سمجھ رہا ہو

عزیزانِ من! کیا تضاد بنا دیا ہے! قرآن کہتا ہے کہ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ (28:56) ہدایت پہ وہ جا سکتا ہے' جو ہدایت پہ چلنا چاہے' تو زبردستی نہیں چلا سکتا۔ ایک لفظ کے غلط ترجمے نے کہاں سے کہاں بات پہنچا دی۔ تُو نہیں چلا سکتا اور ہم دخل نہیں دے سکتے۔ ہمارا کام صحیح بات کا نازل کرنا ہے' تیرا کام صحیح بات کا پہنچا دینا ہے۔ زبردستی نہ تُو چلا سکتا ہے' نہ ہم اس کے ارادے کے اندر Interfere (مداخلت) کرتے ہیں۔ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ (28:56)۔ جو چاہتا ہے راہِ راست پہ چلنا تو وہ ہدایت حاصل کر سکتا ہے تُو چلا نہیں سکتا اور ہم Interfere (مداخلت) نہیں کریں گے۔ اب بات سمجھ میں آ گئی کہ رسول سے جو کہا تھا کہ تُو لاکھ چاہے بھی تو زبردستی کسی کو نہیں صحیح راہ پہ چلا سکتا۔ کہا کہ ہم بھی کسی کو زبردستی نہیں چلاتے۔ من یشآء: جس کا جی چاہے۔ عزیزانِ من! انسان کا تو خدا نے مقام بڑھا دیا ہے۔ یہ جو کہا ہے کہ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ (28:56)۔ کہا کہ ہمارا قانون یہی ہے کہ وہی صحیح راستے پہ چلے گا جو چلنا چاہے۔ چوراہے پہ کھڑے ہو کے تُو بتا سکتا ہے کہ یہ راستہ صحیح اِدھر جا رہا ہے۔ اس راستے سے صحیح منزل پہ پہنچے گا وہ جو صحیح راستے پہ چلنا چاہے۔ ''جیہڑا نیت کر کے آیا ہیگا ماں پیونال چوری کہ دسنا ای نہیں کہ میں کتھے کیا ہیگا' اوتے اس رستے تے ای چلے گا''۔ ❷ دریا میں جا کے ڈوبنے والے' خودکُشی کرنے والے کو ملاح کہتا ہے کہ چھلانگ نہ لگانا' پانی ڈوبو ہے۔ ''او کیندا اے تے لبدا پھردا ساں کہ پانی ڈوبو کتھے ❸ ہے''۔ صحیح راستے پہ چلے گا وہ جو چلنا چاہے گا۔ اس لیے کہا کہ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ (27:70) راستہ دکھائے چلا جا' ان کے اوپر غم نہ کر کہ وہ چلتے کیوں نہیں ہیں۔ تُو انہیں زبردستی نہیں چلا سکتا۔ ہم نے بھی انہیں ان کی اپنی مرضی کے اوپر چھوڑ دیا ہے۔

---

❶ یا اللہ! لیلیٰ کے باپ کی فتح ہو' یا اللہ! لیلیٰ کے باپ کی فتح ہو۔ اس نے ایک جھانپڑ دیا اور کہا کہ تمہارا ستیاناس ہو' تم برباد ہو کہ تم لیلیٰ کے باپ کی فتح کہہ رہے ہو۔ ابے! ہمارا کیوں ناس کر رہا ہے؟

❷ جو ماں باپ سے چوری یہ نیت کر کے آیا ہے کہ یہ بتانا ہی نہیں ہے کہ میں کہاں گیا تھا' وہ تو اسی راستے پہ ہی چلے گا۔

❸ وہ یہ کہتا ہے کہ میں تو ڈوبو پانی (غرق کرنے والے پانی) کی تلاش میں تھا۔

## ظہورِ نتائج کے دوران مہلت کا وقفہ بھی ایک رحمت ہے

اب بات وہ آ گئی کہ جب یہ قانونِ مکافاتِ عمل ہے تو یہ جتنی چیزیں اس کے خلاف یا قوانین کے خلاف کرتے ہیں' اُن کا نتیجہ ملے گا اور وہ تباہ کن ہے' تو پھر یہ ہوتا کیوں نہیں ہے۔ روز یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جی خدا اگر موجود ہے تو پھر ظالم اتنے ظلم کرتا ہے تو وہ ان کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑ لیتا' جونہی وہ کسی کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھائے تو وہ پتھر کا بن جانا چاہیے۔ قدم قدم پہ یہ ہوتا ہے۔ اگر اسے کہا جائے کہ کیوں بھئی! تمہارا کیا خیال ہے اگر اس طرح سے تم کچھ کرنا چاہو اور رات کو تمہیں دبا دیا جائے! انسان اپنے اختیار و ارادے سے دستبردار ہونا ہی نہیں چاہتا۔ دوسرے کے متعلق چاہتا ہے کہ اس کو تم کسی طرح پکڑ لو۔ تو یہ چیز اس لیے اٹھتی ہے کہ صاحب! یہ ظلم ہو رہا ہے۔ پھر یہ گرفت کیوں نہیں ہوتی؟ کیوں نہیں تباہی ہوئی؟ وہ کہتا ہے کہ اس میں بھی ہماری رحمت ہے۔ ہم مہلت کا وقفہ دیتے ہیں۔ اگر جس دن بخار چڑھے' اسی دن موت واقع ہو جائے' علاج کی مہلت ہی نہ ملے' تو کوئی زندہ ہی نہ بچے۔ بیماری اور موت کے درمیان ایک مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔

## قانونِ مکافاتِ عمل ترازو کے اصول کو نظر انداز نہیں کرتا

قرآنِ کریم بتاتا یہ ہے کہ وہ جو موازین (پلڑے) ہیں' میزان کھڑی ہوئی ہے' اسے ترازو کہتے ہیں' ان کے پلڑوں میں وہ کہتا ہے کہ ایک طرف تو وہ کام ہوتے ہیں جو تخریبی ہوتے ہیں' ساتھ وہ کام ہوتے ہیں جو ان کی طرف سے تعمیری ہوتے ہیں۔ ان دونوں پلڑوں میں یہ جو چیزیں ڈالی جاتی ہیں' تو دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ پلڑا جھکتا کونسا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ جس کا تخریبی پلڑا جھکتا ہے' تعمیری پلڑے میں کچھ بھی نہیں ہوتا یا تعمیری پلڑا جھکتا ہے تو تخریبی پلڑے میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ چیز انسانی زندگی کے متعلق جو تحقیقات ہو رہی ہیں اس تحقیق نے اس کی بڑی تائید کی ہے۔ یہ جو ڈاکٹر مرض کا علاج کرتے ہیں تو یہ ہوتا کیا ہے؟ یہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر یہ جتنے بھی Cells (خلیات) ہیں ان پہ انسان کا جسم مرتب ہے۔ انہی Cells (خلیات) کے اندر کمزوری واقع ہوتی ہے یا باہر سے کوئی چیز یعنی زہر آلود جراثیم بیکٹیریا وغیرہ اندر چلے جاتے ہیں۔ اندر جا کے وہ ہلاکت پیدا کرتے ہیں۔ وہ جو دوسرے حفاظت کرنے والے Cells (خلیات) ہوتے ہیں وہ ان کے ساتھ لڑا کرتے ہیں۔ اگر یہ سیلز زیادہ طاقتور ہیں تو یہ غالب آ جاتے ہیں۔ ہلاکت پیدا کرنے والے جو (Cells) ہیں مغلوب ہو جاتے ہیں اور بیماری سے شفا مل جاتی ہے۔ علاج کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ جو حفاظت کرنے والے Cells (خلیات) ہیں' ان کو زیادہ تقویت پہنچا دیتے ہیں کہ ان کا یہ تعمیری پلڑا جھکتا رہے۔ اس کشمکش میں' اس لڑائی میں اگر ایسا وقت آ جاتا ہے کہ وہ تخریبی پلڑا جھک جاتا ہے اور ان کی کوئی دوائی تعمیری پلڑے والے Cells (خلیات) کو اتنی طاقت نہیں پہنچا سکتی کہ ان کا مقابلہ کرے تو

اسے موت کہا جاتا ہے۔ یہ خدا کی رحمت ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا کہ جونہی کسی سے ایک غلطی ہو اور ٹینٹوا دبا دیا جائے' ذرا سی بد پرہیزی ہو اور موت واقع ہو جائے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ اس بد پرہیزی اور موت کے درمیان ہم نے ایک مہلت کا وقفہ دیا ہوتا ہے کہ اس میں علاج کر لو۔ علاج کی جو گنجائش ہے یہ خدا کی بہت بڑی رحمت ہے۔ یہ جنہیں ہم نے ابھی جرائم یا تخریبی اعمال کہا ہے ان کے جو آخری تباہ کر دینے والے نتائج ہیں' ان میں اور ان اعمال کے ارتکاب کے درمیان علاج کا مہلت کا ایک وقفہ ہوتا ہے۔ اس میں اگر اپنے آپ کو صحیح راستے پہ لے آئیں تو بچ سکتے ہیں۔ لیکن اگر یہ اسی میں بڑھتی چلی جائے تو پھر ایک وقت آ جاتا کہ جب موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ ہے وہ چیز۔ **وَ یَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ** (27:71) یہ کہتے ہیں کہ تم جو روز آ کر ہمیں ڈراتے دھمکاتے ہو کہ اس باطل کے نظام کا نتیجہ تباہی ہوگی' برباد ہو جاؤ گے' تختہ الٹ جائے گا تو پھر ہوتا کیوں نہیں ہے' ہم تو روز وہی کچھ کرتے ہیں' پہلے سے بھی زیادہ کرتے ہیں۔ اگر تم ایسا کہنے میں سچے ہو تو پھر ایسا ہوتا کیوں نہیں ہے۔ انہی پتہ ہے کہ

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب [1]

(غالب)

تمہاری بے تابی تمنا سے متاثر ہو کر یہ نہیں کرتے کہ وہ جو مہلت کا عرصہ ہے اسی کو ہم ختم کر دیں اور تمہیں تباہ کر دیں۔ **قُلْ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ رَدِفَ لَکُمْ بَعْضُ الَّذِیْ تَسْتَعْجِلُوْنَ** (27:72) کہا کہ جس چیز کی جلدی مچا رہے ہو' ہو سکتا ہے کہ اس میں سے بعض چیزیں بالکل تمہارے پیچھے لگی ہوئی آ ہی رہی ہوں' ساتھ ہی لگی ہوئی ہوں۔ وہ ''ردیف'' یہ ہوتا ہے جو گھوڑے پہ پہلے سوار کے پیچھے بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ ساتھ ہی لگا ہوا ہو۔ **وَ اِنَّ رَبَّکَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَ لٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَشْکُرُوْنَ** (27:73) بات یہ ہے کہ یہ جو مہلت دی ہے یہ تو خدا کا فضل اور اس کی رحمت ہے کہ تمہیں اس نے باز آفرینی کا وقت دے دیا ہے کہ اصلاح کر لو' علاج کر لو' اور تم الٹا شکایت کر رہے ہو کہ یہ خدا کیسا ہے کہ پکڑتا ہی نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ یہ تو خدا کی رحمت ہے' فضل ہے لیکن بیشتر لوگ وہ ہیں جو اس مہلت کے وقفے سے بھی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کوئی پکڑنے والا ہی نہیں ہے۔ یہ بات غلط ہے۔ پکڑنے والے نے خود ہی یہ مہلت کا وقفہ دے رکھا ہے کہ اس میں اپنی اصلاح کر لو تو بچ جاؤ گے۔ **وَ اِنَّ رَبَّکَ لَیَعْلَمُ مَا تُکِنُّ صُدُوْرُھُمْ وَ مَا یُعْلِنُوْنَ** (27:74) بات یہ نہیں ہے کہ اس کو علم ہی نہیں ہوتا کہ تم کیا کر رہے ہو۔ تو کیا یہ ہے کہ تباہی مچ رہی ہے اور اصلاح کرنے والے کو' گرفت کرنے والے کو' علم ہی نہیں ہے؟ کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ یہ تمہارے اعمال تو ایک طرف ہم تو

---

[1] عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

تمہارے سینے میں گزرنے والے خیالات تک کو بھی جانتے ہیں تو اس کے باوجود فوری گرفت نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم تمہیں علاج کرنے کے لیے' اپنی اصلاح کرنے کے لیے' وقفہ دیتے ہیں۔ ورنہ وَ مَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِی السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (27:75) ارض وسما کی مستور' پسِ پردہ' غائب چیزوں' میں کوئی ذرا سی بھی ایسی چیز نہیں ہے جو خدا کے علم کے اندر نہ ہو۔ اور وہ علم بھی مبین ہے' واضح ہے' روشن ہے' ہمارے سامنے ہے۔ اور وہی جو خدا کا علم ہے وہ علم قانون کے ذریعے سے اس قرآن کے اندر آ گیا ہے اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَقُصُّ عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَکْثَرَ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ (27:76)۔ اور یہ جو قوم بنی اسرائیل یہ سارے جھگڑے کر رہی ہے' اعتراضات اٹھا رہی ہے' ان کے اندر جو باہمی اختلافات ہوئے اور ان کی وجہ ان پر تباہیاں ہوئیں' یہ قرآن تو ان کو بھی جانتا ہے اور ان کے علاج کے طریقے بھی بتاتا ہے۔

## قرآنِ حکیم کی تمام کی تمام صداقتیں انسانیت کے لیے ہیں

قرآن کہتا ہے کہ وَ اِنَّهٗ لَهُدًی وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (27:77) قرآن صحیح راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے لیکن رحمت ان کے لیے بنتا ہے جو اس صداقت پہ یقین کر کے صحیح راستے پہ چل پڑتے ہیں۔ کیا بات ہے اِن لفظوں کی! **یھدی الیه من اناب** (13:27) کوئی چھپایا ہوا علم نہیں' کوئی باطنی علم نہیں' بلکہ کھلا ہوا ہے' مبین ہے' چوراہے کے اوپر بڑے بڑے پوسٹر لگا دیئے ہیں' سائن پوسٹ (نشاناتِ راہ) بڑے بڑے حرفوں میں لگا دیا ہوا ہے۔ یہ تو ہم نے کیا ہے' یہ لَهُدًی (27:77) ہے۔ یہ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (27:77) ہے لیکن یہ فائدہ بخش انہی کے لیے ہوگا جو مومن ہوگا۔ یعنی ایک تو کہے کہ ہاں صاحب! سائن پوسٹ (نشانِ راہ) صحیح کہتا ہے' واقعی یہ راستہ اس گاؤں کو جائے گا جدھر میں نے جانا ہے اور پھر اس کے اوپر چل پڑے۔

## قرآن کی طرف سے رہنمائی کی نوعیت

اگر یہ لوگ اس کی صداقت پر ایمان نہیں لائیں گے اور اپنی غلط روش پر اڑے رہیں گے تو قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ رَبَّکَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ بِحُکْمِهٖ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْعَلِیْمُ (27:78) پھر اس کے بعد جو فیصلہ ہوتا ہے وہ ہمارے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر سائن پوسٹ (نشانِ راہ) پڑھ کر غلط راستے پہ چل پڑو' تو ہمارا قانون یہ ہے کہ تمہارا ہر قدم تمہاری منزل سے تمہیں دور لیے جائے گا۔ اگر ہمارے راستے پہ چل پڑو تو ہر قدم پہ منزل قریب تر ہوتی چلی جائے گی۔ یہ ہمارا قانون ہے۔ فیصلہ اس کے مطابق ہوگا۔ [1] اب اس کے بعد یہ کہا کہ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰهِ اِنَّکَ عَلَی الْحَقِّ الْمُبِیْنِ (27:79)۔ رسول سے کہا جا رہا ہے کہ دل گرفتہ کیوں ہوتا ہے'

---

[1] اور وہ اپنے قوانین کو نافذ کرنے کی پوری پوری قوت رکھتا ہے اور اس کے فیصلے علم و حکمت پر مبنی ہوتے ہیں یونہی اندھا دھند نہیں ہوتے۔

دل برداشتہ کیوں ہوتا ہے۔ اگر اس میں وقت لگ رہا ہے اور ان کی طرف سے بڑی سخت مخالفتیں ہو رہی ہیں تو اس کی وجہ سے بھی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ یہ مہلت کا وقفہ ہے' انتظار کرو۔

## توکل کا قرآنی مفہوم یہ ہے کہ خدا کی رسی کبھی آپ کو دھوکا نہیں دے سکتی

اِنَّکَ عَلَی الۡحَقِّ الۡمُبِیۡنِ(27:79) تُو تو حق کے اوپر ہے اور حق بھی حقِ مبین ہے یعنی کھلا ہوا واضح حق ہے۔ ''تُو حق پر ہے''۔ جب تُو حق پر ہو تو پھر تو اس کا سوال ہی نہیں کہ یہ خیال پیدا ہو کہ مجھے کامیابی ملے گی یا نہیں ملے گی' مجھے شفا ہو گی یا نہیں ہو گی۔ تجھے اس بات پہ یقین رکھنا چاہیے کہ میں خدا کے قانون کے اوپر ہوں اور جو خدا کے قانون پہ چلنے والا ہے وہ کبھی ناکام نہیں رہا کرتا۔ فَتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ (27:79) اسے توکل کہتے ہیں۔ جسے توکل کہتے ہیں یہ قرآن کی بڑی اہم اصطلاح ہے کہ خدا کے قانون کی اثر اندازی کی صداقت پر پورا یقین ہو۔ اب تو ہمارے ہاں یہ کنویں ہی نہیں ہوتے تو ہماری اگلی نسل نے نہیں دیکھا۔ رسی کے ساتھ وہ ڈول بندھا ہوا ہوتا ہے' وہ اوپر چلا آ رہا ہوتا ہے۔ وہ اس یقین کے ساتھ اس کو بھر کے لے آتے ہیں کہ یہ رسی اتنی مضبوط ہے کہ ڈول کو اوپر تک لے آئے گی۔ اگر اس رسی میں یہ کیفیت ہو کہ آئے اور راستے میں آ کر ٹوٹ جائے تو وہ ڈول نیچے جا گرے گا۔ توکل یہ ہے کہ جس یقین کے ساتھ دس ہزار فٹ کی بلندی پر اڑنے والے ہوائی جہاز سے وہ پیراشوٹ کے ذریعے سے چھلانگ لگا دیتا ہے' اسے اپنی چھتری پہ یقین ہے۔ عربی زبان میں اسے توکل کہتے ہیں۔

## ہمارے ہاں توکل علی اللہ کا خودساختہ مفہوم ہے

''اک ساڈے توکل ہوندا اے۔ اوسائیں توکل شاہ والا جیہڑا ہوندا اے'' ❶ تو یہ ہے توکل علی اللہ کہ بیٹھے ہیں جی۔ ''روٹیاں ہوردے گھر پکن ڈیاں ہویاں نیں' ایہہ خدا تے توکل لگائے بیٹھے نیں۔ جے اوندیاں نہ تے پتہ چل جائے'' ❷ گائے' بھینس کے دودھ کا پہلا قطرہ یا وہ چیز پہلے حضرت صاحب کے ہاں جائے گا تو برکت ہو گی ''ایہہ توکل علی اللہ ہون ڈیاوے'' ❸ وہ ایک حضرت صاحب کا واقعہ ہے۔ وہ ایک حضرت صاحب کا کیا وہ تو سب کا ہی یہ ہوتا ہے۔ وہ بیوی بچوں کو ویسے ہی چھوڑ کر گھر سے چلے گئے۔ کوئی ذریعہ معاش نہیں' بیوی نے کہا: کیسے جا رہے ہیں؟ کہنے لگے: توکل بخدا تمہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ وہاں رہے اور واپس آئے۔ ذہن

---

❶ ایک ہمارے ہاں توکل ہوتا ہے' وہی جو سائیں توکل شاہ والا ہوتا ہے۔

❷ روٹیاں دوسروں کے گھر پک رہی ہوتی ہیں۔ اگر وہ وہاں سے نہ آئیں تو انہیں دال روٹی کا بھاؤ معلوم ہو جائے۔

❸ یہ توکل علی اللہ ہو رہا ہے۔

میں ہوگا کہ قبرستان میں جانا چاہیے تاکہ ان کی فاتحہ پڑھ آؤں جن کو چھوڑ گیا تھا۔ دیکھا تو وہ اسی طرح سے زندہ ہیں۔ بڑے حیران ہوئے۔ بیوی سے پوچھا کہ گزارا کیسے کیا؟ اس نے کہا آپ تو ہمیں ایسے ہی چھوڑ گئے تھے۔ شکر ہے ایک بھینس آپ کی نظر میں نہیں تھی تو ہم اس بھینس کے دودھ کو بیچتے تھے اور گزارا چلاتے تھے۔ پھر وہ اپنے سفر کے اوپر چلے ہیں تو کہنے لگے کہ یہ جو چھ مہینے میں خدا کا قرب حاصل نہیں ہوا تو میں اب اس کی وجہ سمجھ گیا ہوں۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ میں نے اتنے چلّے کیے' ریاضتیں کیں اور پھر بھی وہ میرے قریب کیوں نہیں آ رہا۔ اب پتہ چلا ہے کہ توکل میں کچھ کمی ہے۔ اب کے چلے تو بھینس کو ذبح کر گئے۔ ''ہن توکل پورا ہوئے گا' ہن خدا نوں جا پھڑاں گا میں''۔ [1] یہ ان کے ہاں توکل ہو رہا ہے۔ ان اصطلاحات کے غلط مفہوم نے اس قوم کو کتنا تباہ کیا ہے!

## احبار و رہبان کی روٹی کا انتظام دوسروں کے گھروں کا رہین منت ہوتا ہے

ایک تو ''متوکلین'' کی فوج ہے جن کے لیے دوسرے کمائی کرتے ہیں اور کمائی کا بہترین حصہ ان کو پہنچاتے ہیں۔ قرآن نے جو کہا تھا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ (9:34) یاد رکھو! یہ مشائخ اور یہ علما کی اکثریت وہ ہے جو لوگوں کی کمائی کو حرام طریقے سے کھا جاتے ہیں۔ یہ کیسے کھاتے ہیں؟ قرآن کی رو سے جو محنت نہیں کرتا' کسی دوسرے کی محنت سے کھاتا ہے' وہ حرام اور ناجائز مال ہے' باطل مال ہے۔ آپ کے ہاں ''متوکلین'' کی ایک فوج ہے۔ اور جو اس قسم کے چلّوں پر چلتے ہیں تو ان کے بال بچے تباہ ہوتے ہیں' خود تباہ ہو جاتے ہیں۔ توکل کے معنی یہ ہیں: چھتری کے بغیر وہ پائلٹ وہاں سے نہیں کودتا۔ چھتری کا ہزار بار ٹیسٹ ہوتا ہے کہ اس قابل ہے کہ فوراً کھلے اور اس قابل ہے' اتنی قوت اس کے اندر ہے کہ وہ آخر تک اس کو نیچے لے آئے۔ پھر اس چھتری کو اس کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے۔ اس کو برسوں ٹریننگ دی جاتی ہے۔ جب اتنا یقین ہو جاتا ہے تو پھر وہ اس چھتری کو لے کر جہاز سے کودتا ہے۔ یہ ہے خدا کے قانون کی محکمیت پر توکل۔ یہ کہا اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ (27:79) جب تُو خدا کے واضح قانون کے اوپر جم کر بیٹھا ہوا ہے تو پھر تُو اس بات کے اوپر بھروسہ کر' یہ تیری روش تجھے کامیابی تک پہنچا کے رہے گی۔ عزیزانِ من! یہ ہے توکل۔ یہ جو ہمارے ہاں ہے' اور آج کل ہوتا بھی یہ ہے' جب معاشرے کی عام روش ایسی ہو جائے جیسی یہ ہے تو یہ توکل نہیں ہے۔

## توکل کی منزل کو سر کرنے کے دوران کٹھن راستوں کو عبور کرنا ہوگا

اس دفعہ کے طلوعِ اسلام [2] میں آپ نے میرا مضمون دیکھا ہوگا: ''حرام کی کمائی' جس کے اب پھاٹک کھل گئے ہیں''۔ وہ تو نظر آتا

---

[1] اب توکل پورا ہوگا۔ اب میں خدا کو جا ملوں گا۔

[2] حرام کی کمائی' جس کے اب پھاٹک کھل گئے ہیں' طلوع اسلام ماہ نومبر 1978ء۔ (ص ص۔ 9 تا 23)۔ یہ مضمون ایک الگ پمفلٹ میں موجود ہے۔

ہے کہ خدا کے معیار کے مطابق یہ جو ہم سانس لے رہے ہیں یہ بھی شاید توکل ہے۔ اس معاشرے کے اندر جو فرد کوشش کرتا ہے کہ میں دیانتدار بن کے جیوں' ایمانداری سے رزقِ حلال حاصل کروں تو وہ بڑی مشکلات کا سامنا کرتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں آ کر وہ دل چھوڑ دیتا ہے' مایوس ہو جاتا ہے' کہتا ہے کہ صاحب! میں نے ایماندار بن کے دیکھ لیا' یہ نہیں چلتا۔ یہ میرا ایک مضمون ہے' یہ واقعی ایک داستان ہے: ''اس دور میں دیانتدار بننا حماقت [2] ہے''۔ لوگ آ کے یہی کہتے ہیں کہ ایماندار بننا بیوقوفی ہے۔ بات ہی یہ ہے ساری کہ اس چھتری کی محکمیت کے اوپر مجھے یقین ہو۔ وہ باتیں یہاں ضروری کہی ہیں کہ اِنَّکَ عَلَی الۡحَقِّ الۡمُبِیۡنِ (27:79)۔ پہلی بات یہ ہے کہ تُو نے اس کے متعلق اطمینان کر لیا ہے کہ واقعی تُو خدا کے قانون' نظام کے اوپر محکمیت سے جم کے بیٹھا ہے۔ یہ بات ہے تو پھر یقین رکھ' بھروسہ رکھ' اعتماد رکھ' اس چیز کے اوپر کہ تکلیفیں آئیں گی' مصیبتیں آئیں گی' رکاوٹیں آئیں گی لیکن آخرالامر حق باطل کے اوپر غالب آ کر رہے گا۔

## حق پر جم کر کھڑے رہنے والوں پر فرشتوں کا نزول

عزیزانِ من! یہ ہے طریق۔ اسی لیے اس نے کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ (41:30) جو یہ کہتے ہیں کہ کوئی انسان نہیں بلکہ رب ہے' نشوونما دینے والا ہے۔ جو یہ بات کہے' ایمان لائے' پھر اس پر جم کے کھڑا ہو جائے' قرآن کہتا ہے کہ اس پر فرشتے نازل ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ عزیزانِ من! اسے توکل کہا جاتا ہے۔ فَتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ اِنَّکَ عَلَی الۡحَقِّ الۡمُبِیۡنِ (27:79)۔ یہ شرط ہے کہ حقِ مبین کے اوپر جم کے بیٹھا ہوا ہو' پھر توکل کی بات ہوتی ہے۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ تُو صحیح پیغام پہنچا سکتا ہے' راہنمائی کر سکتا ہے لیکن راستے پہ لگا نہیں سکتا۔ راستے پہ وہی چلے گا جو ایسا کرنا چاہیے گا۔ جو چاہے گا وہ تیری بات بھی سنے گا۔ اور جو صحیح راستے پہ چلنا ہی نہیں چاہتا جیسا میں نے کہا تھا کہ خودکُشی کرنے جاتا ہے' وہ کیوں یہ بات سنے گا کہ یہاں نہ کودنا' یہاں پانی غرق کرنے والا ہے۔ وہ کان لگا کے تیری بات سنے گا ہی نہیں جو اپنی روش پہ چلتے رہنا چاہتا ہے۔ اس سے کبیدہ خاطر مت ہو کہ یہ لوگ تیری آواز پر' جو یکسر حق وصداقت کی آواز ہے کان کیوں نہیں دھرتے۔

## آخر کار مفاد پرستی کی روش سے انسان کی تعمیری صلاحیتیں مفقود ہو جاتی ہیں

تیری دعوت علم و برہان پر مبنی ہے۔ اس پر وہی غور کر سکتا ہے جو عقل و بصیرت سے کام لے' جو اپنے جذبات کے طوفان میں غرق ہو کر سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھے' وہ تمہاری آواز کو کیسے سنے گا۔ لہٰذا تم اس سے افسردہ خاطر مت ہو کہ یہ تمہاری آواز کو کیوں

---

[1] پرویزؒ کا یہ مضمون ''اس دَور میں دیانت دار بننا حماقت ہے۔'' طلوعِ اسلام مئی 1970ء' ص ص۔ 9 تا 24 میں اور سلیم نے نام' ص ص۔ 42 تا 54' جنوری 1979ء کے طلوع اسلام میں چھپا۔

نہیں سنتے۔تم زندہ انسانوں کو سنا سکتے ہو۔کہا کہ اِنَّکَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰی وَ لَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِیۡنَ (27:80) تُو مردوں کو نہیں سنا سکتا' جنہوں نے صحیح راستے پر چلنے کی صلاحیت ہی کھودی۔صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ایک وقت تک جذبات کے اندر آدمی اپنی مفاد پرستیوں کے اندر ڈوبا ہے' اسی کو روشِ زندگی بنالے تو حق اور باطل' غلط اور صحیح میں امتیاز کرنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔پھر وہ باطل ہی ان کو حق نظر آتا رہتا ہے۔یہ ہے جسے قرآن مُردے کہتا ہے کہ تُو مُردوں کو نہیں سنا سکتا۔ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب انہیں بات سننے کے لیے بلایا جائے تو منہ پھیر کر چل دیں۔

## راہ گم کردہ انسانوں کی ایک دوسری کیٹیگری جو اپنی مفاد پرستیوں میں ڈوب جاتے ہیں

عزیزانِ من! کیا بات ہے قرآن کی! بات اتنی ہی کافی تھی لیکن اس نے کہا کہ نہیں' ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں یہ صلاحیت تو ہوتی ہے لیکن وہ وقتی طور پر اپنی مفاد پرستیوں کے اس جذبے میں اتنے ڈوب جاتے ہیں۔ان کی کیفیت کی مثال یہ بتائی کہ ادھر جا رہا ہے' تم آواز دیتے ہو کہ او بھائی! ٹھہر جاؤ' یہ راستہ ادھر نہیں جاتا۔وہ پیٹھ موڑ کے چلا جاتا ہے' سنی کو ان سنی کر دیتا ہے۔ایک تو وہ ہیں جنہوں نے صلاحیت ہی کھودی ہے' لاعلاج ہو گئے ہیں۔ایک وہ ہیں کہ جن میں صلاحیت ہے' مگر وہ سننا نہیں چاہتے ہیں۔یہ سننے کی صلاحیت ہو اور سنا نہ جا سکے' آپ نے کبھی پانی میں غوطہ لگا کے دیکھا ہے۔آپ کے کان وغیرہ بالکل ٹھیک ہوتے ہیں لیکن باہر والے کی آواز آپ تک نہیں پہنچ سکتی۔سننے کی صلاحیت کے باوجود آواز سنائی نہیں دیتی۔انسانی مفاد پرستی کے اس قسم کے گہرے پانی میں جب آدمی ڈوب جاتا ہے تو سننے کی صلاحیت کے باوجود سن نہیں سکتا۔اس کا علاج کسی اور کے پاس نہیں ہوتا۔علاج یہ ہوتا ہے کہ پانی میں سے سر کو باہر نکال دیں تو سن لے گا۔کہا کہ دو قسم کے لوگوں سے تمہیں واسطہ پڑے گا۔ایک تو وہ ہیں جن میں کچھ صلاحیت ہی نہیں ہے' مُردہ ہیں۔اسی لیے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پہ یہ کہا ہے کہ لِیُنۡذِرَ مَنۡ کَانَ حَیًّا (36:70) تو خطرات سے آگاہ اس کو کر سکتا ہے جو زندہ ہے۔یہ کن لوگوں سے کہا جا رہا ہے؟ یہ سب تو بظاہر زندہ ہیں' پھر رہے ہیں۔کہا جائے گا کہ ان کے زندہ ہونے میں شبہ کس کو ہو سکتا ہے' یہ تو زندہ چلتے پھرتے ہیں۔قرآن کی رو سے جو سمجھنے سوچنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے' وہ اسے مردہ کہتا ہے۔اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ جو خطرات سے ان کو آگاہ کرتا ہے' اس سے وہی مستفید ہو سکیں گے مَنۡ کَانَ حَیًّا (36:70) جو زندہ ہیں۔قومیں بھی اس حال میں پہنچ جاتی ہیں کہ جہاں ان پر موت طاری ہو جاتی ہے۔پھر وہ مقام آ جاتا ہے جس کے متعلق پھر اس نے کہا ہے کہ جاؤ! ان کی بستیوں کے اجڑے ہوئے کھنڈرات کو جا کر دیکھو۔یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ قوم اپنے آپ کو مُردہ کی حالت و کیفیت میں لے جاتی ہے۔

## قوموں میں صلاحیتوں کی ایک چنگاری بھی انہیں زندگی کی نعمت سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کر سکتی ہے

اگر صلاحیت باقی ہے پھر بھی کچھ توقع باقی ہوتی ہے' کچھ امید باقی ہوتی ہے کہ پانی میں ڈوبا ہوا ہے' سر باہر نکال لے گا' تو سن لے گا۔ایک دفعہ صحیح بات سن تو لے گا' پھر آگے وہ فیصلہ بھی کر سکتا ہے کہ مجھے ماننا چاہیے یا نہیں ماننا چاہیے۔ جو سننا ہی نہ چاہے تو اس کو تُو کیا کچھ سنائے گا! کچھ نہیں اس لیے قرآن کریم نے کہا کہ **وَ مَآ اَنۡتَ بِهٰدِى الۡعُمۡىِ عَنۡ ضَلٰلَتِهِمۡ اِنۡ تُسۡمِعُ اِلَّا مَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ** (27:81)اندھے کو تُو راستہ نہیں دکھا سکتا' بہرے کو تُو بات نہیں سنا سکتا۔ یہ تُو اسی کو سنائے گا جو اس چیز کے اوپر آمادہ ہو کہ میں سُنوں' غور وفکر کے بعد دیکھوں کہ یہ صحیح ہے۔صحیح پائے تو اس کو قبول کر لے' قبول کر لے اور اس کے بعد اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ جو یہ کرے گا اس کو یہ قرآن فائدہ دے گا ورنہ یہ مُردوں کی بستی کے اندر مرثیے پڑھ کر تم چلے آؤ۔ کچھ کر لو' فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ تو زندہ نہیں ہو سکتے۔

عزیزانِ من! سورۃ النمل کی آیت 81 تک ہم آ گئے ہیں۔82 آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ؕ**

❀❀.....❀❀.....❀❀

# دسواں باب: سورۃ النمل (آیت 82 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ﴿۸۲﴾ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ﴿۸۳﴾ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴿۸۴﴾ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ﴿۸۵﴾ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴿۸۶﴾ وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ﴿۸۷﴾ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْۤ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ﴿۸۸﴾ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ﴿۸۹﴾ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ؕ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴿۹۰﴾ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ ۫ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ﴿۹۱﴾ۙ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ﴿۹۲﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴿۹۳﴾

عزیزانِ من! آج نومبر 1978ء کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ النمل کی آیت 82 سے ہو رہا ہے: (27:82)۔

## عبادات کی ادائیگی کے باوجود سب پر غالب ہونے کا عمل (الاعلون) کیوں پورا نہیں ہوتا؟

بات خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی ہو رہی تھی۔ دین کی بنیاد ہی یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل حتیٰ کہ دل میں گزرنے والا خیال بھی ایک نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے۔ یہ ہے سارا دین، یہ ہے لُبِ ایمان کی۔ جب یہ دین مذہب میں تبدیل ہوا تو مذہب پرست طبقے کے لیے مشکل یہ آ گئی کہ اب جن چیزوں کو انہوں نے کہا کہ مذہب کے فرائض ہیں، عبادات ہیں، عقائد ہیں، وہ یہ سب کچھ ہوتا چلا گیا، نتیجہ کوئی نکل نہیں رہا۔ اگر قسمت یاوری کرتی یا فریبِ نفس میں مبتلا نہ ہوتے یا فریب وہی نہ کرنا چاہتے تو کھڑے ہو کر سوچنا چاہیے تھا کہ وہ تو یہ کہتا ہے کہ

کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا۔ وہ نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا تو ہم یہ کیوں کیے جا رہے ہیں۔ کہیں کوئی نقص ہے۔ یا تو (معاذ اللہ) اس کہنے والے نے (معاذ اللہ) غلط کہا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ نکل کر رہے گا۔ تمہاری زندگیاں بڑی خوشگواریوں کی، سرفرازیوں کی ہو کر رہیں گی۔ یعنی خدا کا اتنا بڑا حتمی دعویٰ ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ غیر مسلم قوموں میں مسلم قوموں کے اوپر غالب آ جائیں۔ قرآن کی اس نص صریح کے دو معنی نہیں ہو سکتے۔ قرآن کہتا ہے کہ **اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ** (3:139) تم دنیا میں سب سے زیادہ غالب رہو گے اور **لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ** (9:33) یہ نظام دنیا کے ہر نظام پر غالب آ کر رہے گا۔ اس قدر واضح الفاظ میں یہ خدا کے دعوے کیے ہوئے ہیں۔

جب خدا کا وعدہ یا دعویٰ کہا جائے تو اس کے معنی اس کا قانون ہوتا ہے اور وہ غیر متبدل ہوتا ہے، اٹل ہوتا ہے۔ قانون کہتے ہی اسے ہیں جو اٹل ہوتا ہے۔ یہ تو اس قدر اٹل قانون، اس خدا کا اٹل وعدہ دعویٰ تھا۔ اس نے کہا ہے کہ خدا اپنے وعدے کی خلاف ورزی کبھی بھی نہیں کیا کرتا۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ قانون اٹل ہوتا ہے۔ پھر سوال یہ تھا کہ یہ کچھ جو اس نے کہا ہے، کیوں نہیں ہو رہا۔ آپ دنیا میں دیکھیے، آپ کسی طبیب کا علاج کرائیے، کسی ڈاکٹر کا علاج کرائیے۔ اگر ڈاکٹر آپ کو دوائی دے رہا ہے اور آرام نہیں ہو رہا تو آپ کھڑے ہو کر سوچتے ہیں اور ہر ایک کہتا ہے کہ میاں! علاج بدلو، شاید تشخیص میں نقص ہے، دوائی میں نقص ہے۔ کہیں کوئی نقص ہے۔ اس لیے کہ جو اس کا نتیجہ ہونا چاہیے وہ نہیں مرتب ہو رہا۔ دنیا کے ہر معاملے میں آپ یہ کرتے ہیں لیکن یہاں جب پہنچتے ہیں تو یہ کیفیت نہیں ہے۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے
مگر خبطِ دوا ہے اور میں ہوں

آپ یہی کیے چلے جا رہے ہیں۔ یعنی آرام نہ آیا، نہ سہی۔ بالآخر کچھ تو ایسا ہونا چاہیے کہ دوسروں کی تسلی تشفی ہو یا جھوٹا وعدہ ہی سہی، کچھ تو کہنا چاہیے۔

## فریبِ نفس میں گرفتار ہونے کا نتیجہ

انہوں نے کہا کہ نہیں نہیں تم سمجھتے نہیں ہو۔ یہ بات تو یہاں کی نہیں ہے۔ یہ بات ہے سچی۔ کہ جی، سچی ہے تو پھر ہوتی کیوں نہیں؟ کہنے لگے کہ یہ یہاں کی بات نہیں ہے، یہ قیامت میں جا کر ہوگا۔ دوائی یہاں پلاؤ، شفا مرنے کے بعد ہوگی۔ یہ ایک اتنے سے لفظ سے آپ دیکھتے ہیں کہ کتنے بڑے فریب کی راہیں کھل گئی ہیں۔ وہاں جا کر کوئی لوٹ کر آنے سے رہا کہ بتائے کہ جی ہاں، واقعی وہ ہو رہا ہے۔ یہاں بیٹھے بٹھائے تو کوئی ایسی علامت نہیں ہے کہ یہاں بیٹھے ہوئے دیکھ لیا جائے کہ جی ہاں! پردہ سکرین پہ ہی سہی، کچھ ہو رہا ہے۔ چلو

یوں ہی سہی تو یوں بھی کچھ نہیں ہے۔ تو پھر کیا ہے؟ پھر وہ عقیدہ ہے:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے

پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

یہ مزاجِ خانقاہی ہے' یہ کیسے چلے جاؤ۔ ہزار دانے کی تسبیح سے نہیں ہوتا تو دس ہزار دانے کی تسبیح سے کرو۔ High Potency (بڑی طاقت) میں بڑی Dose (خوراک) دے دو۔ کہ جی کچھ نہیں ہوتا۔ تو کہتے ہیں کہ وہاں ہوگا' جو یہاں اس دنیا میں یہ کرے گا' وہاں آخرت میں یہ ہوگا۔

## بات صرف دل کی تسلی ہی نہیں ہوتی بلکہ محسوس نتائج کی بھی ہوتی ہے

عزیزانِ من! اس کا کیا علاج کہ وہ **اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً** (2:201) کہتا ہے۔ یہ تو اس کے لیے وہ دنیا کہہ رہا ہے۔ کہنے لگے کہ وہ جو حسنات ہیں' وہ تم سمجھ نہیں رہے' وہ انسان کے دل کی بات ہے۔ ہندو اپنے بت کے سامنے سجدہ کر کے دل کی وہ بات وہاں پوری کر لیتا ہے۔ اس جیسا اطمینان تو تمہارے ہاں ان کو بھی نہیں ہوتا' وہ ایک محسوس شے اپنے سامنے رکھتا ہے۔ ہر انسان کی عادت یہ ہے کہ محسوس سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں وہ جو کرشن کی تصویر بنایا کرتے تھے' تو اس کو گلے لگانے کو ان کا جی چاہا کرتا تھا۔ اگر اپنے ہی دل کی تسلی ہے تو پھر تو ہر طریق سے ہو سکتی ہے۔ اپنے دل کی تسلی وہ نہیں کہتا۔ وہ اس کی خلاف ورزی کرنے سے کہتا ہے کہ **خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا** (2:85) اس دنیا میں ذلت نصیب ہوگی۔ کہا کہ صاحب! وہ کہتا ہے کہ ذلت نصیب ہوگی۔ یہ قوم ساری دنیا میں ذلیل ترین قوم ہے۔ کہنے لگا کہ آپ نے عزت اور ذلت کے معیار بدل دیئے ہیں۔ عزت وہ عزت ہے جو خدا کے ہاں عزت ہے' یہ مقربینِ بارگاہِ الٰہی ہے۔ جن سے کوئی بات کرنے کا روادار نہیں ہے' وہ خدا کے مقرب ہیں۔ کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ ذلیل ترین قوم ہے۔ کہنے لگے:

کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں [1]

شاعری ہو رہی ہے۔

## میدان عرفات کی دعائیں تو قبول نہیں ہوتیں البتہ یہودیوں کی تقویت ضرور بڑھ جاتی ہے

انہوں نے حقائق کی دنیا سے لطائف کی دنیا کی طرف لوٹا دیا ہے۔ ''مست رکھو'' ہو رہا ہے۔ میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں

---

[1] اقبالؒ (1996ء). بانگِ درا۔ لاہور: نیشنل بک فاؤنڈیشن' ص۔ 295۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے' ترا آئنہ ہے وہ آئنہ کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے' نگاہِ آئنہ ساز میں

کہ دس پندرہ لاکھ کی تعداد میں یہ مسلمان وہاں حج کی تقریب میں جمع ہوتے ہیں۔ تیس سال سے زیادہ عرصے سے بنی اسرائیل ان کے دل میں پھانس کی طرح چبھا ہوا ہے۔ لاہور شہر جتنی اس مملکت کی آبادی ہے' وہ بھی اب ہوئی ہے۔ مسلمانوں کی سلطنت کا ایک بحر زخار مراکش سے لے کے ایران تک چلا آ رہا ہے' پھر افغانستان اس کے ساتھ' پھر پاکستان ہے۔ ذرا اور آگے بڑھتے جایئے تو ملیشیا اور انڈونیشیا ہے۔ یہ مسلمانوں کا ایک سمندر ہے۔ اس کے اندر اس کی ایک گھاس کے تنکے سے بھی زیادہ حیثیت نہیں ہے۔ تیس سال سے یہ ہو رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ عرفات کے میدان میں جب دعائیں مانگی جاتی ہیں تو وہ خدا کے ہاں مستجب ہوتی ہیں۔ تیس سال سے یہ کیا کر رہے ہیں؟ لاکھوں کی تعداد میں وہاں جمع ہو رہے ہیں اور دعائیں مانگ رہے ہیں کہ یا اللہ! اسرائیل کی توپوں میں کیڑے پڑیں۔ دعا مانگ رہے ہیں کہ یا اللہ! ان کا بیڑہ غرق کر دے' ان کو تباہ کر دے۔ یہ دعا مانگ رہے ہیں جس طرح ہر عید کے بعد یہاں گوشت کی قیمت بڑھ جاتی ہے' ان کی ہر دعا کے بعد ان کی تقویت اور بڑھ جاتی ہے۔ وہ پھولتے پھلتے جا رہے ہیں' یہ دعائیں مانگتے چلے جا رہے ہیں۔ وہی پندرہ لاکھ دعا مانگنے کے بعد بجائے اس کے کہ پھر واپس ادھر کا رخ کر لیں وہ اگر وہاں سے اٹھ کر یوں سیدھے ہو جائیں تو ان کی آواز سن کر وہ مملکت چھوڑ جائے۔

## ہماری گالیوں کا جواب ہمیں طمانچوں کی شکل میں دیتے ہیں

اب سوال یہ ہے کہ اگر دعائیں بھی یہاں قبول ہو جاتی ہیں تو پھر یہ کیوں نہیں ہو رہا؟ کہتے ہیں کہ ان کے لیے خدا نے کہا ہے کہ ذلت لکھی ہوئی ہے' تو دیکھیے ہماری نگاہوں میں کتنے ذلیل ہیں' ہم نے ان کو کیسا ذلیل کر دیا ہے۔ دکھ آتا ہے' جب کہتے ہیں کہ وہاں قیامت میں ہی یہ سب کچھ ہو گا۔ قرآن کہتا ہے کہ ٹھیک ہے وہاں کی زندگی برحق ہے لیکن یہ سب کچھ وہاں ہی نہیں ہو گا' یہاں سے بھی شروع ہو جائے گا۔ اگر نظام باطل کا ہے تو اس کی بنیاد میں تباہی مضمر ہوتی ہے' وہ تباہ ہو کر رہتا ہے۔ اگر صحیح نظام قائم ہوا ہے تو وہ اسی دنیا میں خوشگواریاں اور سرفرازیاں عطا کرتا ہے۔ اور اسی طرح سے پھر آگے چلتا ہے۔ جو یہاں ذلیل اور خوار ہے وہ وہاں بھی ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ جسے یہاں کی سرفرازیاں صحیح نظام کے تابع ملتی ہیں وہ وہاں بھی سرفراز ہوتا ہے۔ اسی کو خدا کا مقرب کہتے ہیں۔ خدا کا مقرب اس دنیا میں بھی مقرب ہوتا ہے اور اُس دنیا میں بھی مقرب ہوتا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا ہے کہ یہاں کا ذلیل و خوار خدا کے ہاں جا کر معزز اور مقرب بن جائے۔ قرآنِ کریم میں یہ مقامات آتے ہیں جن میں یہ سب کچھ ہے۔ پہلی جو کشمکش تھی' وہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسی دور کے مخالفین' بالخصوص قریش وغیرہ' کے ساتھ تھی۔ یہ تیرہ سال مکے کی زندگی میں' دس سال مدنی زندگی کے اندر تھی۔ قرآنِ کریم نے اپنے انداز میں سب سے پہلے ان مخالفین کا انجام بتایا ہے اور اسی انداز و نہج سے پھر اس نے کہا ہے کہ آئندہ آنے والے زمانوں میں بھی جب کبھی

اس قسم کے غلط نظام بنیں گے تو ان کے نتائج تباہیاں ہوں گی۔

## قرآنِ حکیم میں الفاظ کے مجازی معنی کی اہمیت

اب یہ جو کچھ اس نے کہا ہے تو اس میں ایک تو یہ ہے کہ کسی چیز کے Literal Meaning (لفظی معنی) ہوتے ہیں مثلاً پانی، ہم جانتے ہیں ایک تو پانی یہ ہے جو پیا جاتا ہے اور ایک اس کے مجازی معنی ہوتے ہیں جیسے

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات

تو ''پانی پانی کر گئی'' کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ میں پانی کا مٹکا بن گیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس پانی پانی کے کیا معنی ہو گئے۔ تو یہ ان کو مجازی معنی کہتے ہیں۔ ہر زبان میں یہ چیز ہوتی ہے اور عربوں کے ہاں تو خصوصیت سے بڑی بہتات میں وہ استعمال کیا کرتے تھے۔ قرآنِ کریم اس قسم کے جو حقائق ہیں وہ اس انداز سے بیان کرتا ہے۔ اس لیے یہ چیز ہوتی ہے کہ اگر وہ وہاں کہے کہ تیر و شمشیر سے ہلاکت ہوگی اور وہ تیر و شمشیر کہہ دے۔ تو تیر و شمشیر تو چند سالوں کے عرصے میں کم از کم ایک آدھ صدی کے بعد بیکار ہو کر رہ گیا۔ اس کی جگہ تو گولی نے لے لی۔ اور وہاں یہ ہوگا کہ نہیں جی، اس نے تو تیر سے کہا تھا۔ اب کیا کیا جائے؟ کہ جی تیر یا شمشیر بنوایا جائے۔ ہم تو تیر سے ہی لڑائی لڑیں گے کیونکہ اس نے تو تیر و شمشیر کہا تھا۔ تو تیر و شمشیر جو ہے اب تو وہ عہدِ کہن کے افسانے بن گئے ہیں، محض مثالیں باقی رہ گئی ہیں۔

## قرآنِ حکیم کا انداز بیان بڑا پُر معنی ہوتا ہے

اس نے کہا کہ تباہی ہوگی، یہ جو پہاڑوں کی طرح محکم کھڑے ہوئے ہیں، روئی کے گالوں کی طرح اڑ جائیں گے۔ کیسا حسین انداز ہے بات کہنے کا! اب یہ انتظار کر رہے ہیں کہ کس دن ہمالیہ روئی کی طرح اڑے۔ کہ جی وہ ہوا تو نہیں ہے۔ تو کہتے ہیں کہ ہوگا۔ یہ انداز ہے قرآن کے سمجھنے کا۔ ایک چیز تو یہ ہے کہ وہ کہا جاتا ہے۔ کہا ہی نہیں جاتا بلکہ یہ حقیقت ہے کہ یہ جو مادی کائنات ہے، یہ عدم سے وجود میں آئی، اس کا انجام ہونا ہے، ابدی طور پر تو خدا کی ذات ہے۔ یہ ساری چیزیں جو اس نے بنائی ہیں ان کا انجام ہونا ہے۔ ٹھیک ہے اس دن انجام ہوگا، مٹ جائے گی لیکن ہم پہ اس کا کیا اثر ہے؟ کہ جی، آخری وہ قربِ قیامت کی نشانیاں بتاتے ہیں پھر وہ قیامت آ جائے گی، یہ زمین اڑ جائے گا، یہ آسمان نہیں رہے گا۔ وہ نہیں رہے گا تو ہم بھی نہیں رہیں گے۔ تو وہ بات ختم ہو گئی۔ دکھ ختم ہو جاتا ہے جب آدمی مر جاتا ہے۔ جب یہ سارا قصہ پاک ہو جائے گا، یہ کائنات ہی باقی نہیں رہے گی تو مصیبتیں ٹل گئیں۔ یہ ہمارے لیے اتنا کچھ کہنا کہ یہ زمین اُڑ جائے گی، یہ آسمان نہیں رہے گا۔ چہ معنی دارد؟ ہمیں کیوں کہہ رہے ہیں؟

مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟ ❶

قرآنِ کریم نے یہ چیزیں بتائی ہیں۔ان قریش کے متعلق تو سب سے پہلے یہ کہا ہے کہ یہ اپنے آپ کو بڑے محکم مستحکم سمجھتے ہیں۔تم دیکھو گے کہ غلط نظام کا انجام اور حشر اسی دنیا میں کیا ہوتا ہے۔اور اس کے بعد اسی انداز سے یہ کہا کہ دنیا میں جب اور جہاں کہیں بھی اس قسم کا غلط نظام ہوگا اس کا یہی حشر ہوا کرے گا۔اسی دنیا کے اندر یہ چیز کہی ہے۔قرآن سامنے رہتا تو ہم دنیا کی تاریخ پہ نگاہ رکھتے۔وہاں ہم دیکھتے کہ واقعی اس کا ایک ایک وعدہ سچا نظر آ رہا ہے' حقیقت بن کر سامنے آ رہا ہے۔جس قوم نے بھی یہ کچھ کیا اس کا انجام یہی ہوا لیکن میں نے کہا ہے کہ اس سے وہ فریب دینے کی گنجائش نہیں رہتی۔وہ جو دوسری طرف کہہ رہے ہیں کہ یہ جو نیک عملی ہمیں بتائی جا رہی ہے اس کا نتیجہ تو ''اعلون'' بتایا تھا' غلبہ بتایا' اقتدار بتایا تھا۔ذلت اور مسکنت تو اس نے کفار اور منافقین کی زندگی بتائی تھی۔یہ اس کے لیے فریب دہی کی گنجائش نہیں رہتی۔وہ ان تباہیوں کو بھی قیامت پہ اٹھا رکھتے ہیں' وہ خوشگواریاں بھی قیامت پہ اٹھا رکھتے ہیں۔وہ اس دنیا کے ساتھ خدا کی رشد و ہدایت کا' ابنیاء کا' تلقین' پیغام' نظام کا' کوئی دخل نہیں ہے' وہ سب وہاں جا کر ہوگا۔بنا لیا کہ دنیا دار العمل ہے اور وہ قیامت جو ہے وہ دار الجزا ہے۔جو یہاں بوؤ گے وہاں کاٹو گے۔''بڑی لمبی کھیتی اے''۔یہاں تو گیہوں مانگ مانگ کے امریکہ سے لوگے اور جو تمہارا بویا ہوا ہے وہ وہاں جا کر تم کاٹو گے اور وہاں کھاؤ گے۔کہتے ہیں کہ بابا جی ❷ نے وہاں ایک دانہ کھا لیا تھا تو جنت سے نکال دیا تھا۔ہمیں کہہ رہے ہیں کہ بوؤ گے یہاں اور وہاں جا کے کاٹو گے۔

## قرآن فہمی کے لیے قرآنِ حکیم کے بیان کردہ انداز کو ہی اپنانا ہوگا

عزیزانِ من! قرآن کو قرآن کی طرح سمجھنا چاہیے۔وہ اس دنیا میں غلط نظام کا یا صحیح نظام کا جو انجام ہے وہ بتاتا ہے۔صحیح نظام تو ہم نے قائم نہیں کیا اس لیے معلوم نہیں۔غلط نظام تو سامنے آتے ہیں۔میں نے یہ تمہید اس لیے باندھی کہ اس کے بعد آیات ایسی آ رہی ہیں جن میں بتایا ہوا ہے کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔

پچھلی آیات میں یہ ہے کہ اے رسول! تم نے ان لوگوں کو تباہی سے بچانے کے لیے' صحیح راستہ دکھانے کے لیے' اپنی انتہائی کوشش کر لی لیکن جو سننا ہی نہ چاہے اس کو تُو سنا کیا سکتا ہے' جو مردہ ہو چکے ہیں تو وہ تو قبرستان میں وعظ کہنے کی بات ہے' ان میں زندگی کے آثار ہی نہیں۔قرآن کہتا ہے کہ **مَنْ كَانَ حَيًّا** (36:70)۔عزیزانِ من! کیا بات ہے! یہ فقرہ مذہب کی دنیا میں کسی کتاب میں نظر نہیں

---

❶ اگر کج رَو ہیں انجم' آسماں تیرا ہے یا میرا مجھے فکر جہاں کیوں ہو' جہاں تیرا ہے یا میرا؟ (اقبالؒ)

❷ یہ اشارہ عرفِ عام میں حضرت آدم علیہ السلام کی طرف ہے۔

آتا۔ تُو تو اسے ہی خطرات سے آگاہ کرسکتا ہے جو زندہ ہے۔ یہ ہے ہی زندہ انسانوں کے لیے۔ پھر وہاں اس نے یہ کہا کہ **انک لا تسمع الموتیٰ ولا تسمع الصم الدعاء اذا ولوا مدبرین . وَ مَآ اَنۡتَ بِهٰدِی الۡعُمۡیِ عَنۡ ضَلٰلَتِهِمۡ** (27:81) نہ تُو مردوں کو سنا سکتا ہے' نہ ایسے شخص کو جو سننے کی صلاحیت تو رکھتا ہے لیکن سننا نہیں چاہتا ہے۔ تُو آواز دیتا ہے' وہ پیٹھ موڑ کے چل دیتا ہے۔ تُو اندھوں کو نہیں دکھا سکتا۔ سورج کی روشنی اسی کو مستفید کرسکتی ہے جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے گا۔ لاکھ سورج چڑھے لیکن جو آنکھیں بند رکھتا ہے تو اس کو اس کی روشنی کیا فائدہ دے سکتی ہے۔ اب اس کے بعد یہ چیز آئی کہ جب کسی قوم کی حالت یہاں تک پہنچ جاتی ہے تو اس کی تباہی آتی ہے۔ قرآن نے قوموں کو تباہی کی مختلف صورتیں اور شکلیں بتائی ہیں۔ ان میں ایک شکل یہ بتائی ہے۔

## قرآنِ حکیم کے لفظ دآبہ کی وہ تفسیر جو تفسیر ابن کثیر میں بیان کی گئی ہے

اب آ گئی وہ آیت جہاں سے آج کا درس شروع ہوتا ہے: **وَ اِذَا وَقَعَ الۡقَوۡلُ عَلَیۡهِمۡ اَخۡرَجۡنَا لَهُمۡ دَآبَّةً مِّنَ الۡاَرۡضِ تُكَلِّمُهُمۡ اَنَّ النَّاسَ كَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا لَا یُوۡقِنُوۡنَ** (27:82)۔ پہلی چیز تو یہی ہے کہ یہ لوگ جو ہمارے ان قوانین پر یقین نہیں رکھتے تھے' وہ اپنے سامنے دیکھ لیں گے۔ اب میں پہلے وہ عرض کروں جو انہوں نے کہا ہے۔ اس تقابل سے بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ جو مذہب کی رو سے آپ کو قرآن کی آیتیں سمجھائی جاتی ہیں وہ کیا تفسیریں ہیں جو آپ کے سامنے بیان کی جاتی ہیں۔ اس آیت کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ جب یہ قول سچے ہو کر سامنے آ جائیں گے' تو ''دآبۃ'' نکلے گا۔ یہ اسے ''دآبۃ'' ہی کہا کرتے ہیں۔ قربِ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ''دآبۃ'' ہوتا ہے جو نکلے گا۔ وہ پھر لوگوں سے باتیں کرے گا اور ان سے کہے گا کہ تم خدا کی ان آیات پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ یہ ترجمہ کیا جاتا ہے۔

''دآبۃ نکلے گا' بات کرے گا'' پوچھا: تو پھر کیا ہوا؟ کہنے لگے: نہیں' تمہیں پتہ نہیں ہے کہ یہ ''دآبۃ'' ہوتا کیا ہے۔ اور پھر آیئے تفاسیر کی طرف۔ ابنِ کثیر [1] کی یہ نہایت معتبر تفسیر ہے۔ ان تفاسیر میں مشکل یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا تھا' روایت میں یوں آیا ہے۔ یہ اپنی ہی کی ہوئی تفسیر کو فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ دنیا کے سامنے مذہب یہ پیش کر رہے ہیں کہ خدا بیان کرنے والا ہے اور اس کا رسولؐ اس کی تشریح کرنے والا ہے اور پھر

---

[1] امام المفسرین حافظ عماد الدین ابوالغداء اسماعیل بن کثیر الدمشقی: تفسیر ابن کثیر' (4 جلدوں میں)' مکتبہ اسلامیہ' لاہور' 2005ء (ترجمہ امام العصر مولانا محمد جوناگڑھی)۔ نام: حافظ اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضوء بن کثیر القریشی البصروی الدمشقی' کنیت: ابوالغداء اور لقب: عماد الدین (774-700ھ)۔ مترجم: محمد جوناگڑھی (1941-1890ء)

تشریح یہ کی جاتی ہے کہ جی وہ قیامت کے قریب ایک ''دآبۃ'' نکلے گا۔ اچھا جی پھر کیا ہوگا؟ کہ ایک غار میں سے ایک جانور نکلے گا۔ اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ تیز گھوڑے کی رفتار سے اس غار میں سے نکلے گا اور تین دن اس میں سے نکلتا رہے گا تو بھی ایک تہائی جسم اس کا باہر نکلے گا۔ اس ''دآبۃ'' کا سر بیل کے سر کے مطابق ہوگا۔ یہ اس تفسیر کے الفاظ ہیں جو میں بیان کر رہا ہوں۔ یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا۔ یہ تفسیر میرے سامنے ہے۔ لکھا ہے کہ اس ''دآبۃ'' کی آنکھیں خنزیر کی ہوں گی کان ہاتھی کے ہوں گے سینگ کی جگہ اونٹ کے برابر بڑھی ہوئی ہوگی گردن شترمرغ کی ہوگی سینہ شیر کا ہوگا رنگ چیتے کا ہوگا کمر بلی کی ہوگی دُم مینڈھے کی ہوگی پاؤں اونٹ کے ہوں گے۔ ''سارا ای سرکس جمع ہو یا ہو یا اے''۔ [1] ٹانگوں کے درمیان فاصلہ بارہ گز کا ہوگا۔ وہ جس غار سے نکلے گا تیز گھوڑے کی رفتار سے نکل رہا ہوگا اور تین دن میں ابھی ایک تہائی نکلے گا۔ آگے لکھا ہوا ہے کہ اس کی داڑھی بھی ہوگی۔ ''ایہہ تے گل سچی کہی ہیگی اے''۔ [2] ایک ہاتھ میں حضرت موسیٰؑ کا عصا ہوگا دوسرے ہاتھ میں حضرتِ سلیمانؑ کی انگوٹھی ہوگی۔ مومنوں کے چہرے کو اس عصا سے چھوئے گا تو وہ نور کے طبق بن جائیں گے کفار کے چہروں کو وہ اس انگوٹھی سے چھوئے گا تو وہ بالکل کالے سیاہ ہو جائیں گے۔ اس طرح سے جو قرآن نے کہا تھا کہ اس دور میں ہم کہیں گے: **وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ** (36:59) اے مجرمو! اے بدمعاشو! اس معاشرے میں ملے جلے نہیں رہ سکتے تم دھوکا نہیں دے سکتے تم الگ کر دیئے جاؤ گے دُور سے پہچان لیے جاؤ گے۔ مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانا جائے گا دھوکا نہیں دے سکے گا۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس طرح سے وہ عصا لگائے اور انگوٹھی لگائے گا تو اُن کے چہرے سفید ہو جائیں گے اِن کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے۔ مومن اور کافر پہچانے جائیں گے۔ اچھا جی پہچانے جائیں گے!! پھر؟ کہنے لگے: پھر قیامت آ جائے گی۔ ان سے ان کو کیا غرض تھی انہوں نے تو تفسیر بیان کرنا تھی سو کر دی۔ یہ ہے جی جو ''دآبۃ'' نکلے گا لوگوں سے باتیں کرے گا۔ آپ کوئی تفسیر اٹھا لیجیے۔ اور میں نے جہاں کہا ہے کہ ان کی قیامت تو پتہ نہیں قیامت تو ہماری ہے جب یہ کہا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تفسیر بیان فرمائی (معاذ اللہ)۔

## قرآنِ حکیم کی تعلیم اور اس کا نتیجہ

قرآن بتا یہ رہا ہے کہ قومیں جب بار بار کی تلقین کے باوجود صحیح نظامِ خداوندی اپنے ہاں متمکن نہیں کرتیں اپنی غلط روش میں جو ظلم تعدی استحصال اور Exploitation (سلب ونہب) کے اوپر مبنی رہتا ہے بڑھے چلی جاتی ہیں تو ایک یہ چیز ہوتی ہے کہ مقابل میں کوئی ایسی قوم کھڑی ہو جائے جو ان اقدار کو لیے ہوئے ہو اس کے مطابق انہوں نے نظام قائم کرنا ہو۔ ان کا آپس میں ٹکراؤ ہوتا ہے وہ غالب آتی

---

[1] یہ سارے ہی سرکس کے جانور جمع ہیں۔

[2] یہ بات تو سچی کہی گئی ہے۔

ہیں تو اس کی جگہ یہ صحیح نظام قائم ہوتا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اگر ایسی صورت نہ ہو نہ ہی یہ جماعت ہو تو اس قسم کی اور وحشی جماعتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو ان کے ساتھ آ کر ٹکراتی ہیں اور درندوں کی طرح ان کو چیڑ پھاڑ دیتی ہیں۔ یہ بھی ایک طریق ہوتا ہے۔ کہا کہ وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا (6:129) ہم ایسا بھی کرتے ہیں جب ایسی جماعت نہ رہے تو اس قسم کی جماعتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک کے بعد دوسری، دوسرے کے بعد تیسری اس سے آ کر ٹکراتی ہے اور اس کو تباہ کر دیتی ہے۔ اس کے بعد دوسری قوم آ جاتی ہے۔ یعنی اس قسم کی غلط نظام والی قومیں آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں اور تباہی کا باعث بن جاتی ہیں۔ تباہی آ جاتی ہے اور تباہی آنے کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ تاریخ میں ایک عرصے سے، جب سے اِس جماعت کو دنیا میں پیدا کیا تھا، اس امت کے لیے کہا گیا تھا کہ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2:143) تمہیں ایک بین الاقوامی قوم پیدا کیا ہے تا کہ تم نوعِ انسانی کے اعمال کی نگرانی کرتے رہو کہ کوئی غلط راستے کی طرف نہ جانے پائے۔ جب سے یہ قوم ختم ہوئی ہے یعنی اس قوم نے اپنی روش ختم کی ہے تو نام کے اعتبار سے یہ اتنے زیادہ تعداد میں ہو گئے ہیں، نوے کروڑ کے قریب دنیا میں مسلمان ہیں، جب سے اس قوم نے دین کو چھوڑا ہے، قرآن کو چھوڑا ہے، اس کے بعد یہ تو صورت نہیں ہوئی کہ اس قسم کی قوم اٹھے اور باطل کے نظام والی قوم پر غلبہ حاصل کر لے، ان کا غلبہ حاصل کرنا انسانیت کے لیے رحمت ہوگی کہ یہ ظالم کی کلائی کو مروڑیں گے، مظلوم کا گلا نہیں کاٹیں گے لیکن جب صورت یہ نہ ہو تو قرآن کہتا ہے کہ باطل کے نظاموں نے تو مٹنا ہوتا ہے پھر وہ آپس میں ٹکراتی ہیں۔

## لفظ دآبہ کا قرآنی مفہوم

اس تمہید کے بعد اب آیت کی طرف آ جائیے۔ یہ جو ''دآبہ'' کا لفظ ہے، یہ عربی زبان میں بھی ہے اور قرآن میں بھی ہے۔ یہ ہر ذی حیات کے لیے آتا ہے، ہر متنفس کے لیے آتا ہے جس میں بھی زندگی ہوتی ہے۔ عام طور پر جانوروں کے لیے بھی بولا جاتا ہے اور انسانوں کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ ''دآبہ'' ایک جانور نہیں ہوتا۔ ایک جماعت، ایک گروہ، ایک پارٹی، ایک ساری قوم اس کے اندر آتی ہیں۔ عربی زبان میں یہ لفظ، میں عربی جاننے والوں کے لیے عرض کر دوں کہ یہ جمع کے صیغے میں بھی استعمال ہو جاتا ہے، ورنہ ''دواب'' اس کی جمع آتی ہے۔

## ظالم قوموں کا باہمی ٹکراؤ

یہ جو آگے لکھا ہے وہ یہ ہے کہ تُكَلِّمُهُمْ[1] اَنَّ النَّاسَ (27:82)۔ اس کے معنی کلام کرنا نہیں ہوتا۔ اس کے معنی کسی کو زخمی

---

[1] کلم کا مادہ ک ل م ہے۔ تاج العروس اور محیط المحیط میں لکھا ہے کہ الکلم کے معنی ہیں ''زخمی کرنا''۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی (1) بات کرنا اور (2) زخمی کرنا لکھے ہیں۔ اس مادہ کے معنی کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ (1961ء)۔ لغات القرآن جلد سوم، لاہور: ادارہ طلوع اسلام، ص ص۔ 1454 تا 1455)

کرنا ہے۔ ایسا وقت آ جاتا ہے یا آ جائے گا جب ایک ظالم قوم اور اس کے مقابلے میں کوئی صحیح نظام والی قوم نہ اٹھے تو اسی قسم کی ظالم قوم جو اس سے زیادہ قوت فراہم کر لے وہ آتی ہے۔ وہ آ کر ان سے ٹکراتی ہے۔ یہ ''دآبہ'' اس کو کہا جاتا ہے کیونکہ یہ وحشی قسم کی قوم ہوتی ہے' درندوں کی قسم کی قوم ہوتی ہے' غیر مہذب اقوام ہوتی ہیں' صحیح نظام اور اقدار ان کے ہاں ہوتی نہیں ہیں۔ اس لیے یہ لفظ اس نے استعمال کیا ہے اور وہ آتی ہیں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اسی قوم کو ہی نہیں جس کے خلاف وہ اٹھتی ہیں' بلکہ جو انسان بھی پھر سامنے آ جاتا ہے وہ ان کو سیلاب کی طرح بہا کر لے جاتی ہیں' وہ انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہیں۔ **كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ** (27:82) اس لیے کہ وہ قومیں تھیں جو ہمارے اس قانون پہ یقین نہیں رکھتی تھیں کہ غلط نظام کا نتیجہ تباہ ہوا کرتا ہے۔ تاریخ میں آپ دیکھیے کہ یہ ٹکراؤ ہوتا چلا آتا ہے۔ یہ صحیح نظام کو لے کر اٹھنے والی قوم تو کبھی آتی ہے' ورنہ ان ''دآبہ'' کا آپس میں ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے۔

## غلط نظام کی بنا پر ہلاکو کے ہاتھوں بغداد کی تباہی میں اٹھنے والا خونی جھکڑ

جب بھی کوئی قوم اپنے ان غلط نظام کے مظالم میں' ضعیفوں اور غریبوں کی جان لینے میں' استحصال میں' انتہائی شدت تک پہنچ جاتی ہے تو جس طرح سے دھوپ گرمی تیز ہو جاتی ہے تو جھکڑ آتا ہے' اسی طرف سے اس قسم کے انسانوں کا جھکڑ اٹھتا ہے۔ وہ جھکڑ ہماری تاریخ میں بغداد [1] کی تباہی کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ وہ ہماری جو سلطنتیں تھیں' ان میں ملوکیت' سرمایہ داری' مذہبی پیشوائیت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اور اس کی اصلاح کی کوئی شکل باقی نہیں تھی کہ ہلاکو خان [2] وہاں چین کی سرحدوں سے اٹھ کر آیا۔ وہ راستے میں تباہیاں کرتا چلا گیا۔ اس نے آ کر بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ وہ پھر آج تک سنبھل نہیں سکا۔ یہ ہیں وہ جو ''دآبہ'' آیا کرتے ہیں کہ جب بھی کوئی قوم اپنی قوت کے نشے میں اتنی بدمست ہو جائے تو پھر اس کے بعد اس کا علاج اس طریق سے ہوتا ہے۔ میں نے تو اتنی لمبی چوڑی بات کی ہے۔ وہ جسے مبداء فیض نے بات کہنے کا سلیقہ سکھایا تھا، وہ اس بات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کر جاتا ہے:

رستم سے کوئی کہہ دے سر تیغ تلے دھر دے

ہلاکو نے آ کر اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ دنیا کی تاریخ میں اس تباہی کی مثال نہیں ملتی' وہ مسلمان قوم پہ گزری ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا

---

[1] ہلاکو خاں کے ہاتھوں 1258ء مطابق 656ھ میں ہوا۔

[2] ہلاکو خان کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص۔310 کا فٹ نوٹ 2۔

کہ کہنے والے اقبالؒ (1877-1938) نے اس بات کو کہا ہے۔ اب تو خیر جسموں میں خون ہی نہیں رہا۔ ہمارے بچپن میں بڑے بوڑھے اور خاص طور پہ بڑی بوڑھیاں جو ہماری دادی امائیں ہوتی تھیں، بہار کے موسم میں وہ کہتے تھے کہ خون جوش مارتا ہے۔ سرسام ہو جاتا ہے جب خون میں تیزی آتی تھی۔ ان کے اس عقیدے کے مطابق اب اس کو High Blood Pressure کہتے ہیں۔ یہ جوش تو نہیں مارتا' کہتے یہ ہیں کہ وہ نالیاں سکڑتی ہیں لیکن بہر حال اس سے سرسام ہو جاتا تھا۔ سرسام کا علاج ہوتا تھا۔ ہم نے اپنے بچپن میں دیکھا ہے کہ جب بہار کا موسم آیا تو خون کی تیزی ہوئی۔ وہ اتنا اتنا بڑا پیالہ تازہ خون کا چمکتا ہوا' جسم سے لیتے تھے اور پھر ان کا اطمینان ہو جاتا تھا کہ وہ جوش نہیں مار رہا۔ سرسام کا علاج فصد کھولنے سے کیا جاتا تھا۔ میں یہ بات بتا رہا ہوں۔ بات یہی ہے جو قرآن کہہ رہا ہے کہ جب کسی قوم کی بدمستیاں سرسام پیدا کر دیں تو اس وقت پھر اس قسم کی قومیں آتی ہیں جو فصد کھولتی ہیں۔ اقبالؒ (1877-1938) کہتا ہے:

کرتی ہے ملوکیت اندازِ جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

## آج کے دور کا سرسامِ مجنونانہ' انسانیت کی تباہی کا موجب بن چکا ہے

اس شخص کی کیا بات ہے! ملوکیت تو اس دور میں اب نہیں رہی اور ذرا سی ایران میں ہے تو اس کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ آج کے دور کی ملوکیت ڈکٹیٹر شپ ہے۔ یہ محض قوت کے زور کے اوپر مسلط ہو جاتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ واقعی وہ نظر آتے ہیں' پاگل ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی حرکتیں مجنونانہ نظر آ رہی ہوتی ہیں' پاگل پن نظر آ رہا ہوتا ہے۔ یعنی ہم جیسے لوگ بھی جو عام عقل و فکر کے ہوتے ہیں' بڑے دانشور نہیں' فلاسفر نہیں' وہ بھی اس کے اوپر ہنستے ہیں کہ یہ کیا مسئلہ ہے۔ یہ کیا ہوتا ہے؟ یہ سرسام ہوتا ہے:

کرتی ہے ملوکیت اندازِ جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

یہ ہیں ''دآبہ'' جو آتے ہیں۔ تُكَلِّمُهُمْ (27:82) یہ خدا کا وہ نشتر ہے جو ان میں خون کی زیادتی جوش مارتی ہے اور سرسام ہوتا ہے۔ ایک فرد کا جنون تو اس کی ذات یا اس کے حالی موالی تک ہوتا ہے۔ جو قوموں کا جنون ہوتا ہے یا قوموں کے سربراہوں کا جنون جو ہوتا ہے' وہ انسانیت کے لیے تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ اتنے ہی بڑے نشتر کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ شخص عجیب بات کہتا ہے کہ یہ ''اللہ کے نشتر ہیں'' لیکن کہتا کہاں سے ہے؟ یہیں اسی آیت کی ایک تفسیر سے تو کہہ رہا ہے' وہ ''دآبہ'' ہیں جو میں نے ابھی آپ کو بتایا ہے۔ آج کی تفسیر یہ ہے جو یہ شخص کر رہا ہے' یہ قرآن سے تفسیر کرتا تھا۔ یہ تو وہ ہے کہ اسی قسم کی ایک قوم آتی ہے

وہ اس قسم کا فصد کھول دیتی ہے۔

## آخر کار باشعور قوم کا جوشِ خون طلسم سامری کو توڑ کر رکھ دیتا ہے

جب اچھی قوم اٹھتی ہے تو اس کی کیفیت دوسری ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم کے متعلق بھی اس نے یہ کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے فرعون اور ان کے ہامان اور قارون [1] کی یہ جو مستیاں تھیں وہ جنون تک پہنچی ہوئی تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ جو قوم بنی اسرائیل تھی جن کو انہوں نے مغلوب اور محکوم بنا رکھا تھا، جس میں فرعونیت کی بدمستیاں اور سلب ونہب کی یہ چیزیں آگے بڑھتی جاتی تھیں تو پھر آخر کار ہوا کیا ہے؟ یہ کہ

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

(بانگِ درا: اقبالؒ)

اس کے لیے بنی اسرائیل کے خون کا جوش میں آنا ضروری ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے قرآن نے کہا کہ **یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** (83:6) انسانیت ربوبیتِ عالمینی کے لیے کھڑی ہوتی ہے۔ پھر یہ ساری فرعونیت، ہامانیت اور قارونیت تباہ ہوتی ہیں۔

## قوموں کا عروج وزوال اپنے اندر قرآنی قوانین کا ہی عکس لیے ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہ خدا کے قوانین ہیں، یہ ہو کر رہتے ہیں۔ یہ چیزیں By chance (اتفاقیہ) نہیں ہو جاتیں، یہ تو اٹل قوانین ہیں۔ ہر خزاں کے بعد جب زندگی کی کہیں نمود نظر نہیں آتی، خشک ٹہنیاں ہاتھ اٹھا کر دعا کر رہی ہوتی ہیں تو ان کے اندر سے ایک نئی زندگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ قانون ہے۔ یہ ہے وہ ''دآبہ'' جو آ کر قوموں کے ساتھ یہ کچھ کرتا ہے۔ عزیزانِ من! آگے اس کی تشریحات موجود ہیں۔ وہ جو بیل، جیسا اور شتر جیسا اور ہاتھی جیسا ہے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **یَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ فَوْجًا مِّمَّنْ یُّکَذِّبُ** [2] (27:83) پھر قوموں کی فوجیں آ جاتی ہیں۔ **مِّمَّنْ یُّکَذِّبُ بِاٰیٰتِنَا فَھُمْ یُوْزَعُوْنَ** [3] (27:83)۔ اور یہ جو بتایا

---

[1] فراعنہ کے خاندانوں کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005ء، ص۔119 کا فٹ نوٹ 1۔ فرعون، ہامان اور قارون کے لیے دیکھیے: نیز مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورہ بنی اسرائیل، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2004، ص۔109 کا فٹ نوٹ 1۔ اور ص۔124 کے فٹ نوٹ 1، 2۔

[2] اس قاعدے کے مطابق، تاریخ میں ایسے ادوار اور مواقع بھی آئیں گے کہ کسی ایک قوم یا پارٹی کے اٹھنے کے بجائے مختلف جماعتیں یا قومیں ایک بار اٹھ کھڑی ہوں اور اس طرح ایک عالمگیر جنگ ہو جائے جس میں ان تمام قوتوں کی فوجیں جو ہمارے قوانین کی تکذیب کرنے والی ہوں، حصہ لیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔879)۔

[3] اس باہمی ٹکراؤ سے وہ کمزور ہو جائیں اور اس طرح فساد انگیزی سے رک جائیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔879)۔

جاتا تھا کہ او بابا! یہ جو تمہارے نظام کی نہج ہے اس کا نتیجہ تباہی ہوگا' وہ اسے نہیں مانتے تھے۔ اکیلے کسی کی تلقین ونصیحت سے بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ وہ سمجھنا چاہتے ہی نہیں تھے' وہ بدمست ہو گئے تھے۔ بھلا شرابی بھی کسی کی بات سمجھا کرتا ہے!!

## کیا آج دنیا بھر کی بدمست قوموں کی پھیلائی ہوئی تباہ کاریاں قرآنی حقائق کی زندہ مثال نہیں ہیں؟

قرآن حکیم (27:83) میں کہتا ہے کہ پھر یہ فوجیں ان کو سمجھانے کے لیے آتی ہیں۔ پھر ان کو محبوس کر دیتی ہیں' نظر بند کر دیتی ہیں' کٹہرے میں لے آتی ہیں۔ تم بتاؤ کہ یہ کیسے کیا کرتے تھے؟ وہ آ کر روکتی ہیں۔ یونہی اس قسم کی غلط قومیں نہیں رکتیں' فوجیں آتی ہیں تو رکتی ہیں۔ اور یہ جتنی عالمگیر جنگیں جو آپ کے ہاں ہوئی ہیں انہیں دیکھیے۔ اس طرح کی فوجیں تو پہلے کبھی تصور میں بھی نہیں آیا کرتی تھیں۔ **حَتّٰٓى اِذَا جَآءُ وْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِىْ وَ لَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ** (27:84) چنانچہ جب پھر وہ روکے جائیں گے' تو وہ قیدیوں کی طرح سامنے آئیں گے۔ پھر ان سے پوچھا جائے گا کہ جب کہا جاتا تھا کہ ان غلط کوششوں کا نتیجہ تباہی ہے تو تم کہا کرتے تھے کہ یہ یونہی باتیں ہیں! یہ نہیں تھا کہ تم نے کہیں علم سے تحقیق کی تھی' علمی طور پہ معلوم کیا تھا کہ واقعی یہ چیزیں یونہی غلط ہیں ایسا نہیں ہوتا۔ تم اپنی بدمستی میں یہ کچھ بک جاتے تھے۔ قرآن تو کہتا ہے کہ **لَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا** (27:84) یہ نہیں کہ علم و بصیرت نے تمہیں اِس نتیجے پر پہنچایا تھا۔ علم وبصیرت کے حاصل کرنے کی تو تم میں توفیق ہی نہیں تھی۔ تم تو نشے میں بدمست تھے۔ کہتے تھے کہ نہیں کچھ نہیں ہوتا۔ یہ زبان سے بھی نہ کہیں' یہ جتنے مستبد حکمران ہوتے ہیں' ان کا عمل یہ بتا رہا ہوتا ہے کہ نہیں' یہ یونہی یہ بات کہہ رہے ہیں۔ جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہے اسی کی بھینس ہوا کرتی ہے۔ **اَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ** (27:84)۔ یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ کس بنا پر تم یہ کچھ کیا کرتے تھے؟ ذرا سمجھاؤ تو سہی' بتاؤ تو سہی۔ **وَ وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ** (27:85) اور یوں خدا کی وہ بات جو کہی جا رہی تھی' وہ اسی دنیا میں ان کے سامنے آ جائے گی۔ کیفیت یہ ہوگی کہ ایک لفظ زبان سے نہیں کہہ سکیں گے۔

## غلط نظام کا نتیجہ اپنے اندر زوال کی کئی شکلیں اختیار کیے ہوئے ہوتا ہے

یہ جو میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن اسی دنیا میں غلط نظام' غلط نہج پر چلنے والی قوموں کا یہ انجام بتا رہا ہے۔ سارے قرآن میں یہ کچھ ہے۔ ایک انداز تو یہ ہوتا ہے کہ کوئی دوسری اُسی قسم کی قوم اٹھ کھڑی ہوتی ہے وہ ان کو تباہ کر دیتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اور انداز بھی بتائے ہیں کہ غلط نظام کی تباہی کس کس شکل میں آتی ہے۔ یہ سورۃ انعام کی بڑی جامع آیت ہے۔ کہا ہے کہ ان کو بتا دو کہ یہ اس طرح سے نہیں مان رہے' نہیں سن رہے کہ خدا کی طرف سے جب تباہی آیا کرتی ہے تو اسکی شکلیں مختلف ہوا کرتی ہیں۔ یہاں دو تین شکلیں بتائی ہیں۔ **قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ** (6:65)۔ یہ اس آیت کا ترجمہ کر دیتے ہیں کہ ''کبھی ایسا ہوتا

ہے کہ آسمان سے عذاب آ جاتا ہے' اولے برس جاتے ہیں' بجلی پڑ جاتی ہے''۔ یہ تو یہی کہتے ہیں کہ اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِکُمۡ (6:65) یا نیچے سے زلزلہ آ جاتا ہے اَوۡ یَلۡبِسَکُمۡ شِیَعًا (6:65) یا تم اکٹھا ہو جاتے ہو۔ اس سے بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس نے تو ان تباہیوں کے آنے کے ایسے طریق بتائے ہیں کہ تاریخ ان کی شہادت دیتی ہے۔ کہا ہے کہ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِکُمۡ (6:65) یہ تمہارے ہاں کے سربراہ جو تمہارے اوپر مسلط ہوتے ہیں' کبھی ان کا ظلم اور استبداد اتنا بڑھ جاتا ہے کہ وہ باقی قوم کے لیے عذاب بن جاتا ہے۔ وہی جنہیں ابرِ رحمت بننا چاہیے تھا' وہی ایک عذاب کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ اوپر سے عذاب آتا ہے۔

## آخر کار ظلم کے ہاتھوں پامال ہونے والی قوم کا خون جوش میں آ ہی جاتا ہے

بظاہر نظر آتا ہے کہ نہیں' خونِ اسرائیل جوش میں نہیں آ سکتا' ہم نے بڑے انتظام کر رکھے ہیں۔ کہا ہے کہ نہیں' او من تحت ارجلکم (6:65) وہ جنہیں پاؤں کے نیچے دبا رکھا تھا کبھی وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ تباہی کی دوسری شکل یہ بھی ہوتی ہے اور کہا ہے کہ تیسری شکل یہ ہوتی ہے کہ اَوۡ یَلۡبِسَکُمۡ شِیَعًا وَّ یُذِیۡقَ بَعۡضَکُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ (6:65) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اوپر والے نیچے والوں کے ساتھ مل کر ایک ہی پارٹی بنا لیتے ہیں' اسی قسم کے دوسرے اوپر والے' دوسری قسم کے نیچے والوں کو ملا کر پارٹی بناتے ہیں اور یہ پارٹیاں آپس میں ٹکرا ٹکرا کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ کہا ہے کہ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّهُمۡ یَفۡقَهُوۡنَ (6:65) ہم کس طرح بات کو پھیر پھیر کر واضح کرتے ہیں لیکن یہ تو انہی کے لیے ہے جو غور و فکر سے کام لیں گے' انہیں معلوم ہو گا کہ خدا کے عذاب کی یہ شکلیں کس قسم کی ہوا کرتی ہیں۔

## انسان کے معاشرتی نظام کے نتائج اس دنیا میں ظہور پذیر ہوتے ہیں

یہ ساری چیزیں اس دنیا میں واقع ہوتی ہیں' انہیں قرآن قیامت تک کی تاریخ پر نہیں اٹھا رکھتا' یہ بات اگرچہ بنی اسرائیل کے ضمن میں کہی ہے لیکن وہ بھی بڑی اصولی بات ہے کہ کسی قوم کی تباہی کی بدترین' سنگین ترین' شدید ترین شکل جو ہوتی ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ بَعَثۡنَا عَلَیۡکُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِیۡ بَاۡسٍ شَدِیۡدٍ فَجَاسُوۡا خِلٰلَ الدِّیَارِ (17:5) مستبد جابر متکبر قسم کے لوگ قوت کے زور پر ان کے اوپر آ کر مسلط ہو جاتے ہیں اور پھر ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ انہیں گھروں میں جا جا کر پکڑتے ہیں اور اس کے بعد ان کو عذاب دیتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ غلط نظام میں یہ شکلیں پیدا ہوا کرتی ہیں اور یہ کچھ اتفاقیہ نہیں ہوتا۔ وَ کَانَ وَعۡدًا مَّفۡعُوۡلًا (17:5) یہ تو خدا کا قانون ہے جو ہو کر رہتا ہے۔ یہ شکلیں اس نے بتائی ہیں۔ اور درمیان میں' جو اس کا انداز ہے' پھر ایک مثال سے بات واضح کی ہے۔ کہا

ہے کہ یاد رکھو! قوموں کے عروج و زوال کے قوانین مقرر ہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ اس قسم کے استبداد پہ، اس نہج پہ قائم ہونے والی قوم یا ایک ایسی حکومت یا ایسا نظام ابدی طور پر اسی طرح سے چلتا رہے اور اس میں کبھی تبدیلی ہی نہ آئے۔ کہا کہ تم دیکھتے ہو کہ یہاں تو

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

## کائنات کا ایک ایک ذرہ ہر آن اپنی منزل کی طرف محوِ گردش ہے

آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن درمیان میں یہ بات لایا تھا۔ کہا ہے کہ وَ وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ❶ (27:85) اور پھر کہا ہے کہ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا ❷ (27:86) رات اور دن کی گردش دیکھتے نہیں ہو۔ تاریکی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتی۔ مشرق سے ایک بہت بڑا گولا اٹھتا ہے اور تاریکی کی ساری چادر کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ گردشِ لیل و نہار کی طرف دیکھو کہ ایک تغیر کیسے آتا ہے۔ وہ جو اپنے ذہن میں سمجھے بیٹھے ہو کہ ہمیں کون ہٹا سکتا ہے، ہمیں کون برباد کر سکتا ہے، ہماری قوتیں بہت عظیم ہیں تو کہا کہ ذرا کائنات کو اس طرح دیکھو۔ یہ گردشِ لیل و نہار دیکھ رہے ہو۔ انہیں ثبات نہیں ہے۔ لیکن اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ❸ (27:86)۔ ان تصریحات سے تو وہی قوم فائدہ اٹھائے گی جو ان کی صداقتوں پر یقین رکھے گی۔ جو یہی کہے کہ نہیں صاحب! ہمارا جو دن ہے اس میں سورج غروب نہیں ہوگا تو ہم جتنا بھی تلقین اور پیغام رسانیاں کر رہے ہیں اُن سے انہیں کیا فائدہ پہنچ سکے گا!!

---

❶ الغرض، ان کے ظلم و استبداد اور سرکشی اور خودسری کی بنا پر، خدا کے قانونِ مکافات کا اٹل فیصلہ ان کے خلاف صادر ہو جائے گا اور وہ آگے سے کچھ بول ہی نہیں سکیں گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔880)۔

❷ (حیرت ہے کہ خدا کے کائناتی قوانین کی کارفرمائی ان کے سامنے ہے لیکن اس کے باوجود یہ لوگ ذرا غور و فکر سے کام نہیں لیتے۔ بڑے بڑے کائناتی قوانین کو چھوڑ دو۔ دن اور رات کی عام گردش تو ہر روز ان کے سامنے رونما ہوتی ہے) دن روشن ہوتا ہے اور اس کے بعد رات آ جاتی ہے جو تمام سرگرمیوں کو خاموش اور ساکن کر دیتی ہے (یہ کچھ ٹھیک ایک قاعدے اور قانون کے مطابق واقع ہوتا رہتا ہے، جس میں کبھی کوئی اختلاف یا تبدیلی نہیں ہوتی)۔

❸ جو لوگ خدا کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں، ان کے لیے اس ایک (بظاہر معمولی سی) بات میں، حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں ہیں۔ اس حقیقت تک پہنچنے کی کہ جس طرح کائنات میں رات اور دن کی گردش کے لیے ایک غیر متبدل قانون مقرر ہے، اسی طرح قوموں کے عروج و زوال اور موت و حیات کے لیے بھی اٹل قوانین مقرر ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔880)۔

## ہم نے زندگی کے تمام اعمال کا نتیجہ قیامت تک اٹھا رکھا ہے

قرآن کہتا ہے کہ وَ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ [1] (27:87) جنگ کے بگل بجیں گے۔ ترجمے کی رو سے یہ کہتے ہیں کہ یہ ''نفخ صور'' قیامت کے دن ہی ہوگا اور یہ سب ختم ہو جائے گا' تباہیاں ہو جائیں گی' نہ زمین رہے گی' نہ آسمان رہے گا اور اس کے بعد پھر وہ صور' جسے جنگ میں بجنے والا بگل کہتے ہیں' اسرافیل بجائے گا۔ اور پھر قبروں میں سے مردے اٹھتے ہوئے بھاگیں گے۔ یعنی زمین و آسمان ختم ہو چکا ہوگا ''ایہہ اوناں دیاں قبراں باقی رہ گیاں ہونیاں۔ ایہدے وچوں نکلن گے نا سارے''!! [2] تو اسرافیل وہ بجائے گا اور پھر یہ اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یہ سب چیز قیامت پہ رکھ چھوڑتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جنگ کے بگل بجیں گے اور اس قدرت دہشت ہوگی کہ گھبراہٹ سے انسان ایسے ہو جائیں گے جیسے مدہوش ہو جاتے ہیں' بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ یہ کیفیت ہوگی۔ اب یہاں اس کے فوراً بعد ایک لفظ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ [3] (27:87) آیا ہے۔ اس کے تو معنی یہ ہیں کہ ''بجز اس کے''۔ لیکن ترجمہ یہ ہوا کہ جسے خدا چاہے یا خدا کی مشیت کے مطابق ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ ہاں خدا جسے چاہے گا۔ ان کے لیے یہ صورت نہیں ہوگی۔ وہ یہیں ختم کر دیتے ہیں اور دو آیتیں آگے نہیں چلتے کہ اس نے خود بتایا ہے کہ یہ کون ہیں جن کے متعلق کہا ہے کہ وہ اس سے نہیں گھبرائیں گے۔

## مکافاتِ عمل پہاڑوں کی طرح جامد بڑے بڑے متکبر سربراہانِ مملکت کو سرنگوں ہونے پر مجبور کر دے گا

آگے آیت آئے گی تو میں عرض کروں گا۔ یہاں آیا ہے کہ وَ كُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ (27:87) پھر یہ جو بڑے بڑے جابر متکبر ہیں' جو سر نہیں جھکاتے' وہ سرنگوں سامنے اس طرح سے آ کھڑے ہوں گے کہ وَ تَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّ هِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ [4] (27:88)۔ اس کا ترجمہ یہ کیا: اس وقت پھر زمین بھی اڑ جائے گی اور یہ جو بڑے بڑے پہاڑ ہیں' روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔ یہاں ''جبال'' کا لفظ آیا ہے۔ کہا یہ ہے کہ یہ پہاڑوں کی طرح جامد ہیں' یہ بڑے بڑے سربراہ' اور سردار ہیں جو

---

[1] (انہی قوانین کے مطابق وہ عالمگیر ٹکراؤ ہوگا.....اس وقت) جنگ کے بگل بجیں گے اور اس قدر دہشت طاری ہوگی کہ تمام اہل کائنات سراسیمہ ہو جائیں گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 880)۔

[2] یہ ان کی قبریں باقی رہ گئی ہوں گی۔ پھر یہ تمام ان سے نکلیں گے!!

[3] بجز ان کے جن کی روشِ زندگی خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوگی (27:89)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 880)۔

[4] اور تم بڑے بڑے اکابرینِ روزگار کو دیکھو گے جن کے متعلق تمہارا گمان یہ تھا کہ ان کی قوت بڑی مستحکم ہے۔ انہیں اپنے مقام سے کون ہلا سکتا ہے.....وہ اس طرح کمزور و ناتواں ہو جائیں گے جس طرح بادلوں کو ہوا کے جھونکے' ادھر ادھر لیے پھرتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 880)۔

اپنے آپ کو سمجھتے ہیں کہ ہمیں کوئی ہلا ہی نہیں سکتا' اور یہ ہر زبان میں ہے' ہمارے ہاں بھی کہتے ہیں کہ چٹان کی طرح اپنے مقام کے اوپر کھڑا ہے' پہاڑ کی طرح محکم کھڑا ہے۔ کہنے لگے کہ یہ جو اپنے آپ کو سمجھتے ہیں کہ ہم تو پہاڑ کی طرح محکم ہیں ان کے لیے یہاں تَحْسِبُهَا آیا ہے یعنی فی الحقیقت ان کی جڑیں اتنی مضبوط نہیں ہیں کہ یہ ان کو کوئی اکھیڑ نہیں سکتا۔ یہ تحسبھا ہے: انہوں نے ایسا محسوس کرا دیا کہ ہمیں کوئی اکھیڑ نہیں سکتا۔ کہنے لگے کہ تم دیکھو گے یہ جو اتنے محکم اور مستحکم بنے پھرتے ہیں اور باور کرا رہے ہیں کہ ہمیں کوئی نہیں ہلا سکتا' یہ بادلوں کی طرح ہوا کے جھونکے میں اڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ ایک چیز کے بیان کرنے کا قرآن کا یہ انداز کیسا عجیب ہوتا ہے' اتنے اتنے بڑے پہاڑ' اونچائی میں وہ یونہی نظر آتے ہیں۔ بادل میں اور پہاڑ میں آپ دیکھتے ہیں کہ کتنا فرق ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقام پہ کتنا استوار ہوتا ہے۔ یہ بڑے بڑے بادل پہاڑ ہی نظر آتے ہیں۔ ہلکا سا ہوا کا جھونکا ان کو اِدھر سے اُدھر لیے لیے پھرتا ہے۔ کہنے لگے یہ جو اپنے مقام پہ پہاڑ بنے ہوئے نظر آتے ہیں' ہوا کے جھونکے ان کو اڑائے لیے پھریں گے۔

## قانونِ مکافاتِ عمل بڑا باخبر' بڑا مستحکم اور بڑا ہی باریک بیں واقع ہوا ہے

قرآن کہتا ہے کہ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ ❶ (27:88) ان کو معلوم نہیں ہے کہ ہمارے قانون کی رو سے ہوا کے جھونکوں سے اڑے پھریں گے اور قانون بھی وہ ہے جو سب سے زیادہ مستحکم ہے' محکم ہے' جو ہم نے بنایا۔ یہ جن کے کھونٹے پہاڑوں کی طرح گڑے ہوئے ہیں' اڑے پھریں گے۔ فرعون کے متعلق تو اس نے کہا ہی یہ ہے کہ وہ وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ (89:10) ہے' جس کے کھونٹے گڑے ہوئے ہیں۔ یہاں (27:88) میں کہا ہے کہ یہ جن کے بڑے بڑے کھونٹے گڑے ہوئے نظر آتے ہیں' بادلوں کے ٹکڑوں کی طرح' ہوا کے جھونکے ان کو اڑائے اڑائے پھریں گے۔ یہ سب کچھ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق ہوگا کیونکہ اِنَّهٗ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ❷ (27:88)۔ جو کچھ تم کر رہے ہو ہم اس سے باخبر ہیں۔ یہ اس کے نتیجے میں ہوگا۔

## کائناتی نعمتوں کے مطابق لامحالہ انسان کا زیادہ سے زیادہ چاہنا بھی محدود ہی کہلائے گا

وہ جو تھا کہ ان کو گھبراہٹ نہیں ہوگی' وہ ان کے لیے تھا جو مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَیْرٌ مِّنْهَا (27:89) اس دن حسنات

---

❶ یہ سب کچھ خدا کے قانون مکافات کے مطابق ہوگا۔ اس خدا کے قانون کے مطابق جس نے ہر شے کو نہایت درست اور مستحکم انداز سے بنایا ہے (لہٰذا انسانوں کے خود ساختہ قوانین و نظام حیات' خدا کے قوانین کے سامنے ٹھہر نہیں سکیں گے)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 880 تا 881)۔

❷ وہ خوب جانتا ہے کہ تم لوگ کیا کرتے ہو' اور تمہارے ان اعمال کا نتیجہ کیا ہوگا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 881)۔

کو خوشگواریوں کو جن کو صحیح عمل کہا جاتا ہے قانونِ خداوندی کے مطابق جس کے کام ہوئے ہوں گے وہ لیے ہوئے آئے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وزن تو وہی ہوگا جو اس کو دیا جائے گا۔ لیکن ہم اس سے زیادہ اس کو کچھ دیں گے۔ اپنی طرف سے بھی کچھ اس کو دیں گے۔ میں دوسرے مقام پہ عرض کروں گا کہ خدا نے کہا کہ زیادہ کے کیا معنی ہیں۔ ایک فقرے میں میں عرض کر دوں بڑی خوبصورتی سے یہ کہا ہے کہ وہاں مَا تَشْتَهِيٓ اَنْفُسُكُمْ (41:31) جو تمہارا جی چاہے گا وہ تمہیں ملے گا۔ اور اس کے بعد کہا ہے کہ بابا جی! کیا اور اس کا چاہنا کیا ہے وہ تو بڑا محدود ہوتا ہے ہم جو اپنے دل سے چاہتے ہیں وہ کیا دیں گے۔ وہ بڑا ہی مزید ہوتا ہے۔ انسان کی جو انتہائی آرزو ہے وہ بڑی محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ ذرا کسی وقت اپنی انتہائی آرزو مانگ کے دیکھیے گا۔ وہ آگے چل کر یوں ختم ہو جاتی ہے۔ تو وہ کہا ہے کہ جو تمہاری آرزو ہو گی وہ پوری ہو گی اور وہی کہا ہے کہ تم کیا اور تمہاری آرزو کیا وہ تو وہیں پوری ہو جائے گی۔ ''اینی کو جنی کُجّی لے کے آ گئے ہیگے او۔ اے تے اینے پانی نال بھر جاوے گی''۔ [1] ہمارے پیمانے کے مطابق ملے گا جو تمہارے پیمانے سے کہیں زیادہ ہو گا۔ وَ هُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ [2] (27:89) یہ ہیں وہ جن کے متعلق کہا تھا کہ خدا کی مشیت کے مطابق ان کو گھبراہٹ نہیں ہو گی۔ یہ ہیں کہ جو اپنے ساتھ حسنات لے کر آئیں گے وہ پریشان نہیں ہوں گے وہ اس کے اندر نہیں گھبرائیں گے۔

## قرآنِ حکیم کی دو اصطلاحات حسنات اور سیئات کا قرآنی مفہوم اور ہمارے ہاں نیکی اور بدی کا تصور

قرآن بتاتا ہے کہ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ (27:90) اور جو ناہمواریاں لے کر آئے گا وہ اس تباہی میں اوندھے منہ جھونک دیا جائے گا۔ وہ انسان کی متاعِ حیات کو جلا کر راکھ کر دیں گی۔ یہ حسنات اور سیئات قرآن کی دو اصطلاحیں ہیں اور بڑی جامع ہیں۔ حسنات کا ترجمہ تو نیکیاں کر لیا جاتا ہے اور سیئات کا ترجمہ برائی کر لیا جاتا ہے۔ اب نیکی کا تصور آپ دیکھیے کس طرح سے بدلتا چلا جاتا ہے۔ ''بڑا نیک آدمی ہے''۔ ''پہلی چیز تے اے ہیگی اے صاحب! کہ کسے نوں کچھ نئیں کہندا ہیگا''۔ [3] اس طرح پھر پتھر سے زیادہ نیک کون ہو سکتا ہے۔ وہ سب سے بڑا مقرب ہے۔ انتہائی نیکی یہ ہے کہ وہ متقی پرہیزگار ہے ہر شے سے پرہیز کرنے والا ہے۔ پوچھیے تو سہی کہ بکری سے زیادہ پرہیزگار کون ہے کہ وہ گھاس ہی کھاتی ہے۔ سیدھی جئ گل اے۔ ہزار قسم کا پلاؤ رکھ دیجیے وہ نہیں کھائے گی۔ ہمارے ہاں نیکی کا یہ تصور ہے۔

---

[1] اتنی سی چھوٹی کوزی کٹوریہ لے آئے ہو۔ یہ تو اتنے سے پانی سے ہی بھر جائے گی۔

[2] اور وہ لوگ اس انقلاب کی ہولناک پریشانیوں سے امن میں رہیں گے (21:103)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص۔ 881)۔

[3] صاحب حضور! پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ کسی کو کچھ نہیں کہتا۔

## ہندوؤں کے ہاں کا طرزِ معاشرت اور نیکی کے کاموں کی کیفیت

یہاں پاکستان میں تو وہ ہندو نہیں ہیں' ہم نے دیکھا ہے۔ صبح سیر کے لیے جاتے تھے۔ بڑے سیانے لوگ تھے۔ سارا دن دکان پہ بیٹھنا ہوتا تھا اس لیے صبح کو سیر پہ چلے جاتے تھے۔ یہ چیز ان کے ہاں عبادت میں داخل تھی۔ یہ صبح کی سیر کو جانا اور دریا یا ندی پہ جا کر نہانا ان کے ہاں عبادت میں داخل تھا۔ ان کے ہاتھ میں اتنا سا کٹورا ہوتا تھا اور اس میں آٹا یا چاول ہوتے تھے جہاں سے یہ کیڑے مکوڑے نکلتے ہیں' تو وہاں چٹکی چٹکی ڈالتے جاتے تھے۔ ''کہندے ہوندے سی پئی' اے بڑے پن دا کم اے ❶''۔ یہ نیکی کا کام ہے۔ وہ انہوں نے بندوں کے اوپر اتنا اتنا بڑا نمک کا ڈلا رکھا ہوا ہوتا تھا۔ یہ گائے بیل بازاروں میں پھرتے رہتے تھے اور چاٹتے رہتے تھے۔ اتنی اتنی ٹوکریاں لٹکا رکھی ہیں' ان میں خشخاش وغیرہ کچھ اس قسم کی چیزیں ڈال دیتے تھے' چڑیاں آ کر چوگا چگتی تھیں۔ ''اے پن دا کم ہوندا سی''۔ ❷ گھوڑوں کے لیے پیاؤ وغیرہ تو ان کے زمانے کے بنے ہوئے تھے' یہاں بھی غالباً آثارِ قدیمہ کی طرح کہیں ٹوٹے پڑے ہیں' جن سے کچھ جانوروں کا' مویشیوں کا' بھلا ہو جاتا تھا۔ وہ ٹوٹ گئے اور ان کی جگہ یہ آسمان تک (بلند و بالا عمارتیں) ❸ بن گئی ہیں۔ بہرحال وہ پانی کے پیاؤ بناتے تھے۔

## ہندوؤں کے ہاں کاروباری انداز اور مقروض مسلمانوں کی حالت

ہندو سارا قرض دینے والا بنیا ہوتا تھا اور مسلمان مقروض ہوتا تھا۔ اس کے خون کے آخری قطرہ تک چوس لینا کوئی برائی یا گناہ نہیں تھا۔ ان کو وہ جو سود ادیتے تھے اس سودے کے اندر وہ دو پیسے ''پن واسطے لیندے ہوندے سن ❹''۔ ان کاموں کے لیے لیا کرتے تھے۔ خرید و فروخت میں ہم نے وہ دو پیسے دیئے ہیں۔ وہ کوئی نہ بھی نہیں کرتا تھا کہ یہ تو ''پن دان واسطے ہویا نا ❺''۔ وہ دو پیسے میں سے ایک پیسہ چڑیا کو کھلاتے تھے اور ایک پیشہ آپ مار لیتے تھے۔ یہاں ہمارے ہاں تو کچھ نہ کرنا سب سے بڑی نیکی اور پرہیزگاری ہے۔

ہاں تو میں آپ کو ''بڑا نیک آدمی ہے'' کی بات بتا رہا تھا کہ وہ کسی کو کچھ نہیں کہتا۔ ''کوئی گالی وی دے جائے' تے کہندا: اے اللہ تیرا بھلا کرے''۔ ❻ ہوا یہ کہ ایک دن ''گھر آ لیاں بھیجا سی نائی نوں کہ جا بھئی! لڑکی واسطے کوئی رشتہ دیکھ آ''۔ ❼ وہ دیکھ کر آ گیا اور کہنے لگا: جی! لڑکا بڑا پسند آیا ہے' دکان پہ بیٹھا ہوا ہے' میں نے دیکھا ہے' بڑا نیک لڑکا ہے۔ کوئی آتا ہے' گالی دے جاتا ہے' وہ ہنس کے ٹال دیتا ہے۔

---

❶ کہا کرتے تھے کہ یہ بڑی نیکی کا کام ہے۔
❷ یہ نیکی کا کام ہوتا تھا۔
❸ یہ اشارہ پلازوں کی تعمیر کی طرف ہے جہاں آبادی زمین پر پھیلنے کے بجائے آسمان کی طرف پھیل گئی ہے۔
❹ نیکی کے لیے لیا کرتے تھے۔
❺ نیکی کمانے کے لیے ہوا۔
❻ کوئی اسے گالی بھی بکے تو بھی کہے کہ اللہ تیرا بھلا کرے۔
❼ ایک دن گھر والوں نے حجام (نائی) کو بھیجا کہ لڑکی کے لیے کوئی رشتہ دیکھ آؤ۔

کوئی طمانچہ بھی مار دیتا ہے تو کہتا ہے کوئی بات نہیں' دکان میں گائے وائے آتی ہے' منہ بھی مار دیتی ہے تو اس کو بھی ڈنڈا نہیں مارتا۔ وہ کہنے لگا کہ کہیں جا کر کوئی اور کام کا رشتہ دیکھ کے آ۔ کہنے لگا: جی! اس سے بڑا اور کام کا رشتہ کیا ہوگا۔ کہنے لگا کہ یہاں تک تو تم نے بتایا ہے' کل کو اگر میری لڑکی کو کوئی لے جائے' وہ اس کو بھی کچھ نہیں کہے گا۔ ''نیکی ہے کہ کچھ نہیں کہنا''۔ دیکھا آپ نے کہ نیکی کا تصور کیسے بدلتا ہے۔

## خدا کے ہاں مکّے کے مظلوم مسلمانوں کی پکار اور خدا کے ہاں سے اس کا جواب

نیکی یہ ہے کہ مکّے میں رہنے والوں کے اوپر ظلم ہو رہا ہے۔ مدینے میں اتنی دور فاصلے پہ یہ جماعت بیٹھی ہے جن کے پاس قوت موجود ہے۔ مکّے والے وہی ناتواں' کمزور' بے بس' بے کس ہیں۔ ان ظالموں کے ہاتھوں ستائے ہوئے ہیں' خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ یا اللہ! کچھ انتظام تُو ہمارا کر' یہاں سے ہمیں نکال ہی دے۔ ان ظالموں کی کلائی مروڑنے والا بھی کوئی ہونا چاہیے۔ خدا مدینے والوں سے کہتا ہے کہ سنتے نہیں ہو' وہ مظلوم ہمیں مدد کے لیے پکار رہے ہیں اور تم چپکے بیٹھے ہوئے ہو۔ تم اچھے متقی ہو؟ یہ اٹھے اور انہوں نے جا کر ظالم کی کلائی مروڑ دی۔ اسے نیکی کہتے ہیں۔

## ہمارے ہاں خدا کی مرضی کے تصور کی اور نیک کاموں کی نوعیت

عزیزانِ من! اس کے برعکس ''یہ کچھ نہ'' کہنے والوں کی نیکیاں' تو نیکیاں ہی نہیں ہیں۔ جنہوں نے نظامِ سرمایہ داری اور نظامِ ملوکیت پیدا کیا ہے' وہ استبداد بھی کرتے جائیں تو انہیں کوئی روکے ہی نہیں اور کہیں کہ یہ اللہ کی مرضی ہے' جسے وہ چاہتا ہے دیتا ہے' وہ سب کچھ سمیٹتے چلے جائیں اور کہیں کہ رازِ خدا ہے جتنا کسی کے حق میں لکھا ہے وہ لے کے رہتا ہے' ان کے خلاف کچھ کہنا خدا کے خلاف شکایت ہوتی ہے۔ یہ نیکیاں نہیں ہیں۔ یہ جتنے غلط کام ہیں وہ سارے ان لوگوں کے پیدا کردہ اور مستحکم کردہ ہیں۔ جو ان چیزوں کو نیکیاں کہہ کر بتاتے ہیں' ان سے کہو کہ جو اپنی محنت سے کچھ حاصل نہیں کرتا اس نے جتنا حاصل کیا ہوا ہے وہ رزقِ حرام ہے' وہ یہ رزقِ حرام نہیں لے سکتا۔

## صحیح توازن کا ہی دوسرا نام حسنات یا حسن ہے

عزیزانِ من! اپنی محنت سے کچھ حاصل کرنا نیکی ہے۔ یہ حسنات میں سے ہے اور بغیر محنت کیے لوٹ کھسوٹ کیے جانا' وہ ہے جسے قرآن سیئات کہتا ہے۔ قرآن کیوں اس قسم کی Terms (اصطلاحات) استعمال کر رہا ہے؟ زبانِ عربی سے پوچھیے کہ یہ ''حسن'' کیا چیز ہے؟ حسن تو صحیح توازن کا نام ہے۔ Proportion (تناسب) صحیح ہوتی ہے تو حسن ہوتا ہے۔ جو میں کبھی کبھی کہا کرتا ہوں کہ حسین ترین چہرے کی آنکھ کی سیاہی ایک بال برابر بھی اپنے اس Proportion (تناسب) سے یوں ہٹی ہوئی ہو تو سارا حسن ختم ہو جاتا ہے' اسے آپ بھینگا کہہ دیتے ہیں۔ جسے قرآن نے حسنِ عمل کہا ہے' یہ وہ عمل ہے جو کسی کا توازن برقرار کر دے۔ اگر فرد کا توازن' معاشرے کا توازن' قوم کا توازن' انسانیت کا توازن قائم ہوا تو زندگیاں خوشگوار ہوئیں۔ یہ تو توازن ہیں جو بگڑے ہوئے ہیں۔ کسی طبیب سے پوچھیے کہ یہ مریض کیوں ہوا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ مزاج کا جو اعتدال ہے' وہ خراب ہو گیا ہے' توازن خراب ہو گیا ہے ذرا سی تیزابیت بڑھ گئی ہے' ذرا سی وہ چیز کم ہو گئی ہے۔ علاج کے معنی ہی یہ ہیں کہ ان کے توازن کو صحیح کر دیا جائے۔

## حسنات یا حسن ہی وہ اصل لفظ ہے جس سے قوموں کا توازن برقرار رہتا ہے

نیکی کا لفظ تو قرآن میں ہے ہی نہیں۔ یہ تو عربی زبان کا لفظ ہی نہیں ہے۔ یہ تو ہے ہی فارسی زبان کا لفظ۔ جس کا اپنا توازن برقرار رہے وہ پھر دوسروں کے توازن کو برقرار رکھے گا۔ اور اس کے مقابل میں ظلم کے معنی ''ناہمواریاں پیدا کرنا'' ہے۔ سارا گناہ ناہمواری ہے۔ اپنے اندر ناہمواری ہو تو جسمانی طور پہ بھی مریض ہے' اعتدال بگڑ گیا ہے' ذہنی طور پر مریض ہے' قلبی طور پر مریض ہے۔ وہ معاشرہ مریض ہے جس میں توازن بگڑا ہوا ہے۔ قوموں کا توازن بگڑا ہوا ہے۔ کوئی چیز اپنے مقام پہ رہ ہی نہیں سکتی اگر توازن بگڑ جائے۔ عربی زبان میں اسے ظلم کہتے ہیں کہ جب کوئی شے اپنے صحیح مقام پہ نہ رہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا** ❶ (27:89)۔ جو حسنات لے کر آتے ہیں ان کو تو گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ اگر افراد ان اقدارِ خداوندی کے مطابق اپنی زندگی انفرادی طور پر یوں بسر کر لیں' عزیزانِ من! تو انہیں وہ صحیح اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ باہر کی یہ اس قسم کی خرابیاں اُن کو پریشان نہیں کرتیں۔ وہ اپنی اصلاح کے درپے ہوتے ہیں' پریشان ہو کر نہیں بیٹھ جاتے۔

## خدا تعالیٰ کی طرف سے حسنات والوں کے لیے نویدِ جانفزا

عزیزانِ من! سنیے! حسنات والے کے لیے کہا کہ اسے صحیح اطمینان ہوگا' فریبِ نفس نہیں ہوگا۔ ایک Sound Sleep (پرامن نیند) صحت کی آتی ہے' اور ایک افیون کھا کر بھی آیا کرتی ہے۔ افیون کی نیند میں اطمینان نہیں بلکہ خود فریبی ہے۔ خود فریبی کا اطمینان تو افیون کھا کر سونے والی بات ہوتی ہے۔ مذہب میں یہی کیا جاتا ہے۔ یہ جو چیزیں ہیں ان کے متعلق ابھی میں نے کہا ہے کہ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے' اُس کا نتیجہ وہ ہوتا ہے' یہ ہے وہ چیز جو پہلے بھی آ چکی ہے لیکن آج تو یہ الفاظ سامنے آ گئے ہیں۔ پھر میں وہی مثال لے آؤں گا۔ آپ نے ایک خط اپنے کسی دوست کے پاس بھیجنا ہے جو دو میل کے فاصلے پہ ہے۔ آپ ایک مزدور کو Engage (پابند) کرتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں کہ یہ خط دے آؤ تمہیں ایک روپیہ ملے گا۔ ❷ اس کی یہ اجرت (Wages) آپ نے باہر سے متعین کی ہے' آپ اسے وہ دے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ صبح دو میل خود سیر کریں تو اس عمل سے آپ کی صحت اچھی ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے کہا ہے کہ **هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ** (27:90)۔ یہ ان اعمال کا فطری نتیجہ ہے جو تم کرتے ہو۔ دو میل کی سیر سے' وہاں باہر سے' کسی اور سے' اس کا وہ پیسہ نہیں مانگتے۔ یہ جو آپ روز دو میل سفر کر آتے ہیں اور پیسہ کچھ نہیں ملتا تو آپ کو ملتا کیا ہے؟ یہ کہ آپ کی صحت ٹھیک ہوتی ہے' خارج سے نہیں کچھ ملتا' وہ آپ کا عمل خود اس کا صلہ بنتا ہے' وہ کام ہی صلہ ہوتا ہے۔

---

❶ جو قوم حسن کارانہ انداز سے' متوازن نظامِ خداوندی پر کاربند ہوگی' اسے اس کی کوششوں سے بھی زیادہ خوشگواریاں حاصل ہوں گی۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 881)۔

❷ یہاں قریباً ایک منٹ کی آواز نہیں ہے۔

## قوموں کے اپنے غلط نظام میں ہی ان کی تباہی اور خوشگواری پوشیدہ ہوتی ہے

عزیزانِ من! جھوم جایئے۔قرآن کریم نے حسن کارانہ انداز سے کہا کہ **مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ** (27:89) جو متوازن نظام خداوندی پر کاربند ہے تو **فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا** (27:89) اسے اس کی کوششوں سے بھی زیادہ خوشگواریاں حاصل ہوں گی' اس کے لیے کہا ہے کہ **جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (46:14) یہ بدلہ ہوتا ہے' اس کا جو وہ عمل کرتے ہیں' کہیں باہر سے نہیں ملتا ہے۔ یہ اس عمل کا ہوتا ہے' اسے ہی کہا ہے کہ **هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ** (27:90) جو تمہارا عمل ہوتا ہے وہی اس کا صلہ ہوتا ہے۔

جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں [1]

اسی طرح تباہی بھی کہیں باہر سے نہیں ملتی۔قوموں کی تباہیوں کی شکل تو یہ ہوتی ہے کہ باہر سے کوئی تباہ کرنے والا آ جاتا ہے' دراصل وہ ان کے غلط نظام کے اندر تباہی پوشیدہ ہوتی ہے۔صحیح نظام کی بنا پر جو نہایت خوشگوار زندگی اور معاشرہ ملتا ہے وہ کوئی قوم باہر سے آ کر آپ کو گیہوں نہیں دے دیتی۔اس نظام کے اندر یہ خوشگواریاں اور سرفرازیاں پنہاں ہوتی ہیں۔کتنے اہم حقائق کو قرآن دو دو لفظوں میں بیان کر جاتا ہے۔جنت اور جہنم کا سارا مسئلہ صاف ہو جاتا ہے۔کچھ خارج سے یہ چیز ملنے والی نہیں ہوتی' یہ تو ان اعمال کا نتیجہ ہے جو انسان کے اوپر مرتب ہوتا ہے۔یہ وہی چیز ہے جو اس کا بدلہ لایا' وہ اس کی جزا بن جاتا ہے۔یہ تو **جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (46:14) ہے۔ان اعمال کا نتیجہ ہے' جو تم کرتے ہو' یہ وہی اس کا بدلہ (Return) ہے۔قرآن عجیب چیزیں بیان کر جاتا ہے۔اسی لیے کہا ہے کہ جو اس کے لیے کوشش کرتا ہے کہ غلط نظام کی جگہ صحیح نظام قائم کرے تو یہ نہیں ہوتا کہ اس کو کہیں سے انعام ملتا ہے' کہیں سے تنخواہ ملتی ہے' کہیں سے اس کا کوئی معاوضہ ملتا ہے۔اس کے لیے یہ سوال ہی نہیں ہوتا۔وہ تو جو یہ کوشش کرتا ہے یہی کوشش اس کا بدلہ ہوتی ہے۔

## جس معاشرے میں بھی احسان کا بدلہ احسان ہوگا اس کا ہر عمل تباہ ہو جائے گا

پھر وہ ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ **هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ** [2] (55:60)۔یہ قرآن کریم کا بہت جلی اور بڑا اہم ٹکڑا ہے جس کا غلط ترجمہ کرنے سے ستیاناس ہو جاتا ہے۔اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہے۔مثال اس کی یوں دی جاتی ہے کہ ضرورت مند آیا' محتاج آیا' میں نے اس کی مدد کی تو اس پہ احسان کیا۔اب جو احسان کیا ہے تو اس کو اب ساری عمر کے لیے بے دام غلام رہنا چاہیے۔الیکشن کے زمانے میں اگر آپ نے کہا کہ بھئی! وہ ووٹ تیرا نہیں ہوگا۔میں تو دوسرے امیدوار کو اچھا سمجھتا ہوں اُسے دوں گا۔تو کہا کہ دیکھیے جی' یہ زمانہ ہے نیکی کا' اس وقت روتا ہوا' گڑگڑاتا ہوا' میرے پاس آیا تھا اور اس کے اوپر اتنا بڑا ہم نے

---

[1] اقبالؒ (1996ء)۔بالِ جبریل۔لاہور: نیشنل بک فاؤنڈیشن' ص ص۔146 تا 147 (روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے):

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ!

[2] جو حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جب حسن پیدا ہو جاتا ہے تو یہی چیز اس کی کوششوں کا صلہ بن جاتی ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1263)۔

احسان کیا' آج طوطے کی طرح آنکھیں پھیر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ نہیں صاحب! ووٹ تو میں اُس کو دوں گا۔ دیکھے جی' خود غرض انسان دنیا کے۔ یعنی اب وہ جو اس کی مدد کی ہے تو اس کے بعد اس کو ہمیشہ کے لیے آپ کا غلام رہنا چاہیے۔ اب اس کے لیے کیا کرے؟ **هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ** (55:60) احسان کا بدلہ تو احسان ہے اور وہ دعا کرے کہ یا اللہ! اس پہ کبھی مصیبت پڑے' یہ بھی اسی طرح سے روتا ہوا میرے پاس آئے' پھر میں اس کی مدد کروں اور کہوں! لو بھئی! وہ احسان کا بدلہ احسان اتر گیا۔

## کسی کے بگڑے ہوئے توازن میں حسن پیدا کر دینا اس کا بدل بھی ہے اور اس کا فریضہ بھی

قرآن کہتا ہے کہ **هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ** (55:60)۔ یہ آیت سارے پڑھتے ہیں۔ حسن کے معنی ہیں جو میں نے ابھی کہے تھے کہ ''بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کر دینا' کسی کا توازن بگڑ گیا تھا آپ نے اس کو برقرار کر دیا'' کہا کہ اس کے بعد اس کا بدلہ کیا؟ تم بگڑے ہوئے توازن کو درست کرنا چاہتے تھے تو وہ درست ہو گیا' بس بدلہ مل گیا۔ یعنی وہ جو تم چاہتے تھے وہ ہو گیا۔ یہ ہے **هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ** [1] (27:90)۔ یاد رکھیے' عزیزانِ من! یہ جو قرآن کی اقدار کے مطابق صحیح نظام کے لیے کوشش کرنا ہوتا ہے' اس کے لیے خارج سے بدلے اور معاوضے نہیں لیے جاتے' نہ کسی حکومت کا ایجنٹ بنا جاتا ہے' نہ کسی سرمایہ دار کی طرف سے یہ کچھ ملتا ہے' نہ کہیں سے تنخواہیں لگی ہوئی ہوتی ہیں' نہ وظیفے مقرر ہوتے ہیں' اس کے لیے کہیں خارج سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ تو باطل کا نظام ہے جو اس طرح سے ان چیزوں کے اوپر قائم کراتا ہے۔

## ہر رسول کی یہی سنت تھی کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا

حق کا نظام قائم کرنے والے اس کو اپنا فریضہ اور ذمہ داری سمجھتے ہیں کہ یہ کرنا بجائے خویش میرے لیے اس کا خود صلہ ہے۔ اس لیے ہر رسول پہلا فقرہ یہ کہتا تھا **لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا** (6:90;42:23) جو کچھ میں تمہارے لیے کر رہا ہوں' تمہاری Welfare (بہبود) کے لیے کرنا چاہتا ہوں تو اس کے لیے میں تم سے اس کا کوئی اجر اور معاوضہ نہیں مانگتا۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ اس کا عمل خود اس کا اجر ہوتا ہے۔ ان حقائق کی تبیین کے بعد' ان سے کہہ دو کہ **اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِیْ حَرَّمَهَا وَ لَهٗ كُلُّ شَیْءٍ** (27:91)۔ مجھے تو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ میں اس خدا کے احکام کی اطاعت کروں۔ یہ مرکز ہے میرے نظام کا جسے کعبہ کہا گیا ہے۔ اسے اس نے تمام نوعِ انسانی کے لیے واجب الاحترام بنایا ہے۔ حج کی تقریب [2] پہ جو میں نے درس دیا تھا تو میں نے

---

[1] یہ ان اعمال کا فطری نتیجہ ہے جو تم کرتے تھے۔

[2] اس خصوصی درس کے علاوہ یہ مواد مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت طلوعِ اسلام کے ان پرچوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے:
(ا) پرویزؒ' غلام احمد: حج' طلوع اسلام ستمبر 1951ء' ص ص۔ 47 تا 55 (9:4) (ب) پرویزؒ' غلام احمد: حج کی اہمیت' طلوع اسلام اکتوبر' ص ص۔ 58 تا 61 (10:4) (ج) پرویزؒ' غلام احمد: حج کا مقصد' طلوع اسلام' نومبر 1978ء۔ ص ص۔ 61 تا 64' طلوع اسلام اگست 1981' ص ص۔ 10 تا 20 اور طلوع اسلام ستمبر 1984ء' ص ص۔ 43 تا 53۔ (د) شہاب' رفیع اللہ: حج بدل کی شرعی حیثیت' طلوع اسلام جون 1978' ص ص۔ 47 تا 55 (ر) مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء تیسرا' چوتھا اور پانچواں باب' ص ص۔ 100 تا 159۔

اس میں بتایا تھا کہ کعبے کی حیثیت کیا ہے' حج سے مراد کیا ہے۔ پوری نوعِ انسانی کے لیے امن اور قیام کا مقام ہے۔ یہ بات اور ہوگئی۔

قرآنِ کریم تو یہ کہتا ہے کہ حَـرَّمَهَـا وَ لَـهٗ كُلُّ شَيْءٍ (27:91)۔کائنات کی ہر شے اس کے پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔اسی لیے وَ اُمِـرْتُ اَنْ اَكُـوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (27:91) مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ میں اس نظام کے سامنے سر جھکا دوں' اس ضابطۂ قوانین کے سامنے سرنگوں ہو جاؤں۔ مسلمین یہ ہیں۔

## ہمارے ہاں صدیوں سے تلاوت یا ناظرہ قرآن کے متعلق پایا جانے والا تصور

سب سے اہم بات مجھ سے یہ کہی گئی ہے کہ وَ اَنْ اَتْـلُـوَا الْقُرْاٰنَ (27:91) میں اس قرآن کا اتباع کرتا ہوں۔اب اتـلوا الـقـرآن کہا کہ قرآن کی تلاوت کرو۔تلاوت کے معنی ہمارے ہاں یہ ہوگئے کہ قرآن کا ایک لفظ نہیں سمجھا جاتا' بس قرآن کی تلاوت ہو رہی ہے۔''اک رکوع پڑھ لیا میں جی' منزل پڑھ لئی ہیگی اے' اے پارہ اک میں پڑھ لینا جی ❶''۔ شینے ختم ہو رہے ہیں صاحب! تلاوتِ قرآن کریم ہو رہی ہے۔ یہ بڑے اہتمام سے ہوتی ہے۔قرآن کا ایک لفظ نہیں جانتے۔بس تلاوت ہو رہی ہے جسے آپ ناظرہ کہتے ہیں۔ارے بابا! اس زبان سے تو پوچھو جس کا یہ لفظ ہے۔تلاوت کے معنی ہوتا ہے''کسی کے پیچھے پیچھے چلنا' کسی کا اتباع کرنا' کسی کی پیروی کرنا' تو اس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ مجھے یہ کہا گیا ہے کہ یہ جو القرآن ہے' جس میں یہ نظام' یہ ضابطہ قوانین دیئے ہیں' میں اس کی پیروی کرتا چلا جاؤں۔ یہ ٹھیک ہے کہ کسی کتاب کو سمجھنے کے لیے اس کا پڑھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ وہ صرف سمجھنے کے لیے ہوتا ہے۔ سمجھا اس لیے جاتا ہے کہ اس کے مطابق کام کیا جائے۔ یہ کڑیاں ہیں آپس میں۔مقصود بالذات تو اس کے مطابق کام کرنا ہوتا ہے' جسے اس کا اتباع کہا جاتا ہے' جسے پیچھے پیچھے چلنا کہا جاتا ہے' یہ مقصود ہے۔اور جس کتاب کو آپ سمجھیں ہی نہیں تو اس کے مطابق آپ عمل کیسے کریں گے۔اب یہ کتاب بغیر سمجھنے کے جو پڑھی جائے گی تو اس پر عمل کیسے ہوگا۔

## ایک ایک لفظ پر دس دس نیکیوں کا ثواب

جیسا کہ میں کہتا ہوں کہ یہ عجیب کتاب ہے' منفرد ہے۔ جتنا اس کتاب کو پڑھا جاتا ہے دنیا کی کسی کتاب کو اتنا نہیں پڑھا جاتا۔ اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ کوئی دنیا کی اور کتاب ایسی نہیں ہے جسے وہ سمجھے بغیر پڑھتا چلا جائے۔دونوں خصوصیتیں اس کے ساتھ ہیں' نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ یہ کیا ہوا؟ کہ جی وہ قرآن شریف کے ایک ایک حرف پہ دس دس نیکیاں مل جاتی ہیں' نیکیوں کا ثواب مل جاتا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ جب الـم (ا ل م) پڑھا تو انہوں نے کہا کہ یہ ایک ہوا۔ کہنے لگے کہ نہیں' یہ تین حروف ہیں۔''ا'' کی دس نیکیاں' ''ل'' کی دس نیکیاں' ''م'' کی دس ہیں۔ یہ تیس ہوگئیں۔اب سوچ لیجیے کہ جو صبح اٹھ کے منزل پڑھی ہے یا پارہ پڑھا ہے تو ذرا اس کے حرف گن لیجیے اور دس سے ضرب دیجیے۔اب روز آپ کے بنک (Bank) میں کریڈٹ بیلنس تو یہ جمع ہوتا چلا گیا ہے۔ باقی رہا

---

❶ جی! میں نے ایک رکوع پڑھ لیا ہے' ایک منزل پڑھ لی ہے' جی ایک پارہ پڑھ لینا۔

کبھی گناہ' تو وہ اللہ معاف کر دیتا ہے۔

## صحیح راستے کو اپنانے والا شخص کسی پہ کوئی احسان نہیں کر رہا ہوتا

یہ کبھی آپ کو پوری آیت نہیں پڑھ کے دیں گے حالانکہ یہ کہا ہے کہ اے رسول! تم خود یہ کرو اور اس کے بعد' ان لوگوں سے کہہ دو کہ یاد رکھو کہ **فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ** (27:92)۔ قران کو پڑھنے کے بعد' سمجھنے کے بعد' جو اس کے مطابق صحیح راستہ اختیار کرتا ہے' تو وہ یہ نہیں ہے کہ کسی پہ احسان کرتا ہے۔ صحیح راستہ اختیار کرنے والا اپنے آپ پہ احسان کرتا ہے کہ وہ اپنی منزل پہ پہنچ جائے گا۔ یہ سیدھی سی بات ہے کہ **فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ** [1] (27:92)۔ اپنے بھلے کے لیے وہ کہہ رہا ہے اور ایسا نہ کرنے والوں کے لیے کہا کہ **وَ مَنْ ضَلَّ** (27:92)۔ اور جو صحیح راستے کو اختیار نہیں کرتا' غلط راستے پہ چلا جاتا ہے **تو فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ** (27:92)۔ ان سے کہہ دو کہ بابا! میرا کام تو اتنا ہی تھا کہ تمہیں بتا دوں کہ راستہ غلط ہے' تیرے گاؤں کی طرف نہیں جا رہا ہے۔ اب اس کے باوجود تُو اُدھر جا رہا ہے تو جاؤ۔ یہ جسے آپ اچھا کام اور برا کام کہتے ہیں تو اس فرد کے لیے ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ غلط راستہ اختیار کر کے میں دوسری طرف چلوں تو میں صحیح جگہ پہنچ جاؤ۔ یہ سوال ہی نہیں ہے۔

یہ سب کچھ کہنے کے بعد سورۃ النمل کی آخری آیت آ گئی' کہا کہ **وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا** (27:93) اور ان سے کہہ دو کہ آخر الامر واجبِ حمد و ستائش تو خدا کی ذات ہی ہوگی۔ اس کا یہ نظام قائم ہو کر رہے گا۔ اس وقت تم پہچان لو گے کہ واقعی یہ اس کے قوانین ہیں۔ وہ نظام خدا کی حمد و ستائش کی جیتی جاگتی تصویر ہوگا۔ بات پھر وہی ہوگئی کہ **وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ** (27:93)۔ یہ کچھ ہماری طرف سے یونہی نہیں ہو جائے گا' اتفاقیہ نہیں ہو جائے گا۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اس کے نتائج مرتب ہوتے جا رہے ہیں۔ جب اُس وقت یہ سب کچھ Accumulative (مجموعی) ہو جائے گا تو پلڑا جھک جائے گا' تباہی آ جائے گی۔ اور وہ تباہی آج تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوگی کیونکہ خدا کا قانونِ مکافات تمہارے تمام اعمال سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ اس طرح واضح طور پر اپنی نشانیاں تمہارے سامنے لے آئے گا جس سے تم یہ سب کچھ پہچان لو گے کہ ہاں وہی معاشرہ ہے جس کی بابت تم سے کہا جاتا تھا۔

عزیزانِ من! سورۃ النمل کی آخری آیت آج ختم ہوگئی۔ آئندہ ہم سورۃ القصص لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط**

❀❀.....❀❀.....❀❀

---

[1] تم میں سے جو شخص' میرے پیچھے سیدھی راہ پر چلے گا' اس کا فائدہ صرف اسی کو ہوگا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 881 تا 882)۔

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے، وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے، وہ میرے ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔۔معراجِ انسانیت)